سود

احکام و مسائل

سود کے بڑے چھوٹے نقصانات، بنک کے سود سے متعلق جزئیات، مصارف سود، مال حرام کو پاک کرنے کا طریقہ، سودی قرض، انشورنس، کرنسی نوٹ کے احکام واقسام، رہن کی مروجہ شکلیں، بٹ کوئن، ملٹی لیول مارکیٹنگ، شیئر مارکیٹنگ، فارن ایکسچینج وغیرہ کے بارے میں بدلتی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف آراء کی وضاحت کے ساتھ باحوالہ مفصل کلام کیا گیا ہے۔

مؤلف

مفتی ابوبکر جابر صاحب قاسمی

خادم کہف الایمان ٹرسٹ حیدرآباد

معاون

مفتی محمد منیر قاسمی

صدر مدرس کہف الایمان ٹرسٹ، حیدرآباد

ناشر

کہف الایمان ٹرسٹ

صفدر نگر، بورابنڈہ، حیدرآباد (تلنگانہ اسٹیٹ)

سود

احکام ومسائل

سود کے بڑے چھوٹے نقصانات، بنک کے سود سے متعلق جزئیات، مصارف سود، مال حرام کو پاک کرنے کا طریقہ، سودی قرض، انشورنس، کرنسی نوٹ کے احکام واقسام، رہن کی مروّجہ شکلیں، بٹ کوئن، ملٹی لیول مارکیٹنگ، شیئر مارکیٹنگ، فارن ایکسچینج وغیرہ کے بارے میں بدلتی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف آراء کی وضاحت کے ساتھ باحوالہ مفصل کلام کیا گیا ہے۔

مؤلف

مفتی ابوبکر جابر قاسمی

خادم کہف الایمان ٹرسٹ، حیدرآباد، تلنگانہ

معاون

مفتی محمد منیر قاسمی

صدر مدرس کہف الایمان ٹرسٹ، حیدرآباد

ناشر: کہف الایمان ٹرسٹ، صفدر نگر، بورابنڈہ، حیدرآباد

پہلا ایڈیشن: ۱۴۴۳ھ - ۲۰۲۱ء

نام کتاب : سود-احکام ومسائل

مصنّفین : مفتی ابوبکر جابر قاسمی 9885052592

صفحات : 475

کمپیوٹر کتابت : مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری، 8801198133

ناشر

کہف الایمان ٹرسٹ

کہف الایمان ٹرسٹ، صفدر نگر، بورابنڈہ، حیدرآباد (تلنگانہ اسٹیٹ)

ملنے کے پتے

مدرسہ کہف الایمان ٹرسٹ، صفدر نگر، بورابنڈہ، حیدرآباد (تلنگانہ اسٹیٹ)

دکن ٹریڈرس، پانی کی ٹانکی، مغلپورہ، حیدرآباد۔ 040-66710230

مکتبہ کلیمیہ، یوسفین ویڈنگ مال، ناملی، حیدرآباد۔

فیصل انٹرنیشنل، دیوبند۔

مرکزی عناوین

- رِبا (سود) کے مبادیات ۲۶
- سود کے نقصانات ۷۴
- متفرع چند اہم مسائل ۹۸
- بینک اور اس کے متعلقات ۱۰۸
- ڈپازٹ کی قسمیں ۱۱۰
- ہندوستان کی حیثیت اور اس میں سود لینا ۱۵۸
- مصارفِ سود ۱۷۰
- مالِ حرام کی پاکی کے طریقے ۱۹۴
- منافع سود کے احکام ۲۰۵
- سودی قرض اور احکام ۲۱۵
- ملازمت کے احکام ۲۵۲
- سودی بینک کا متبادل ۲۶۳
- انشورنس اور اس کے متعلقات ۲۷۳
- رہن کی مروّجہ شکلیں ۳۴۳
- کرنسی، نوٹ اقسام و احکام ۳۵۶
- جائز ناجائز اسکیمیں اور متفرقات ۳۸۱
- خلاصۂ کتاب ۴۴۳
- فہرست مراجع ۴۶۵

تفصیلی فہرست

- تقریظ (حضرت مولانا مفتی محمد جمال الدین صاحب قاسمی دامت برکاتہم) ۲۱
- پہلی بات ۲۴
- ربا (سود) کے مبادیات ۲۶
- ربا کی تعریف ۲۶
- سود کی حقیقت قرآنی آیات کے ذیل میں ۲۶
- سود کی حقیقت احادیث کے ذیل میں ۲۸
- سود دیگر مذاہب میں ۳۰
- یہودی مذہب میں ۳۰
- عیسائی مذہب میں ۳۱
- ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں ۳۱
- عقلاء کی نظر میں ۳۲
- ''ارسطو'' کا نظریہ ۳۲
- گاندھی جی کا نظریہ ۳۲
- بتدریج سود کی ممانعت ۳۳
- سود کیوں حرام ہے؟ ۳۷
- سود کو حلال سمجھنے والا مرتد ہے ۳۸

سود کا انجام	۳۸
حرام مال کی نحوست اور بدانجامی	۳۹
سود لینا اور دینا برابر ہے	۴۱
نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی	۴۳
سود خوروں کے بدترین حیلے	۴۴
سلف صالحین کے واقعات	۴۵
چند شبہات واعتراضات	۴۷
(۱) قرآن پاک میں ربا کی تعریف کا نہ ہونا	۴۷
(۲) حرمت ربا کا اضعافاً مضاعفہ تک محدود ہونا	۴۹
(۳) کرایہ مکانات پر قیاس	۵۱
(۴) صرفی اور تجارتی سود	۵۱
ربا اور سود میں فرق	۵۴
ربا اور بیع میں فرق	۵۵
ربا اور شراکت میں فرق	۵۸
ربا اور اجرت میں فرق	۵۹
ربا اور مضاربت میں فرق	۶۰
ادھار بیچنے پر زیادہ رقم لینے اور سود لینے میں فرق	۶۱
قانوناً سودخوری کا آغاز کب سے ہوا؟	۶۲
ربا کی قسمیں	۶۳
ربا النسیئہ کا مفہوم اور اس کی قسمیں	۶۴
ربا الفضل کا مفہوم	۶۶
ربا الفضل اور ربا النسیئہ میں فرق	۶۷

- ربا الفضل کی وجہ حرمت ٦٨
- خرید و فروخت کی چند ممنوع قسمیں ٦٩
- ربا کے تحقق کے شرائط ٦٩
- سود کی مختلف مثالیں ٧٠
- سرکاری اور غیر سرکاری سود کا فرق ٧٠
- اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کا فرق ٧١
- سود تباہی کا سبب کیسے؟ ٧٢

سود کے نقصانات ٧٤

- اخلاقی نقصانات ٧٤
- معاشی و سماجی نقصانات ٧٧
- سود سے چند لوگوں کا نفع ٨٢
- سود کا نقصان غریب اور متوسط طبقہ کو زیادہ ہے ٨٤
- چھوٹا سرمایہ دار بینک سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ٨٥
- حکومت کے ملکی قرضے ٨٧
- روحِ شریعت کی خلاف ورزی ٨٩

متفرع چند اہم مسائل ٩٨

- (١) ایک لپ گیہوں کی بیع دو لپ کے عوض ٩٨
- (٢) سونا کے برتن کی بیع سونا کے عوض ٩٨
- (٣) نیے سونے کے عوض پرانے سونے کی بیع ٩٩
- (٤) پرانے اور نیے لوہے کے برتن کی کمی بیشی کے ساتھ بیع ٩٩
- (٥) پرانا بیس گرام کا زیور دے کر نیا دس گرام کا زیور لینا ٩٩
- (٦) سونے چاندی کا زیور بطور قرض لینا ٩٩

- (۷) سونے چاندی کو پیتل یا لوہے کے عوض بیچنا ۱۰۰
- (۸) نوٹ سے سونا چاندی خریدنا ۱۰۰
- (۹) ایک چیز کو اس کی غیر جنس سے لینا ۱۰۱
- (۱۰) چھنے ہوئے آٹے کی بیع اس کے علاوہ سے ۱۰۱
- (۱۱) گیہوں کے بدلے آٹا لینا ۱۰۱
- (۱۲) ایک گوشت کا دوسرے گوشت سے تبادلہ ۱۰۲
- (۱۳) بکری کے گوشت کا تبادلہ گائے کے گوشت کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ ۱۰۲
- (۱۴) گائے کے گوشت سے بھینس کے گوشت کا تبادلہ ۱۰۲
- (۱۵) بھیڑ اور بکری کے گوشت کا تبادلہ ۱۰۲
- (۱۶) ایک برتن کا تبادلہ دوسرے برتن کے ساتھ ۱۰۲
- (۱۷) یہوں کے بدلے دھان کی بیع ۱۰۳
- (۱۸) سرسوں کے عوض اس کے تیل کا تبادلہ ۱۰۳
- (۱۹) روٹی کے عوض آٹا ۱۰۳
- (۲۰) گیہوں یا آٹے کے عوض سبزی لینا ۱۰۳
- (۲۱) گن کر یا گز سے ناپ کر بیچی جانے والی چیزیں ۱۰۴
- (۲۲) ایک زمین کا دوسری زمین سے تبادلہ کرنا ۱۰۴
- (۲۳) ایک گھر کے عوض دوسرا گھر یا ایک سواری کے عوض دوسری سواری ۱۰۵
- بیع میں سود کی بعض شکلیں ۱۰۵
- **بینک اور اس کے متعلقات** ۱۰۸
- بینک کی تعریف ۱۰۸
- بینک کا تاریخی پس منظر ۱۰۸
- دنیا کا پہلا بینک ۱۰۹

- بینک کا قیام ۱۱۰
- ڈپازٹ کی قسمیں ۱۱۰
- (۱) کرنٹ اکاؤنٹ:(Current Account) ۱۱۰
- (۲) بچت کھاتہ(Saving Account) ۱۱۱
- (۳) فکسڈ ڈپازٹ(Fixed Deposit) ۱۱۱
- (۴) لاکرز(Lockers) ۱۱۲
- مذکورہ چار قسموں میں رقم رکھوانے کا حکم ۱۱۲
- بینک کی قسمیں (باعتبار تمویل) ۱۱۳
- بینک میں اکاؤنٹ کھولنا ۱۱۶
- کونسا اکاؤنٹ کھولے؟ ۱۱۸
- سود حاصل کرنے کے لیے بینک میں رقم جمع کرنا ۱۱۸
- مسجد کا اکاؤنٹ کھولنا ۱۱۹
- رفاہی اداروں کی رقم سرکاری بینک میں رکھنا ۱۱۹
- مساکین کے نفع یا تنظیم کی ترقی کے لیے بینک میں رقم رکھنا ۱۱۹
- مدرسہ کی رقم کو فکسڈ ڈپازٹ میں رکھنا ۱۲۱
- بینک انٹرسٹ ۱۲۲
- بینک میں سود چھوڑنا جائز نہیں ۱۲۲
- مسلم بینک کے سود کا حکم ۱۲۳
- بینک ڈرافٹ کی شرعی حیثیت ۱۲۴
- یونٹ ٹرسٹ کا حکم ۱۲۴
- بینک کے لیے مکان کرایہ پر دینا ۱۲۵
- جواز کے حدود و شرائط ۱۳۱

جواز کی شرطیں	۱۳۲
خلاصۂ تحقیق	۱۳۳
سودخور سے مکان کرایہ پر لینا	۱۳۳
بینک ملازم کا مکان خریدنا	۱۳۴
فینانس کمپنی کے لیے جگہ کرایہ پر دینا	۱۳۴
بینک ملازم کو کرایہ پر مکان دینا	۱۳۴
ATM مشین لگانے کے لیے اپنا کمرہ کرایہ پر دینا	۱۳۵
بینک کے لیے سافٹ ویئر بنانا	۱۳۵
بینک کے جائز وظائف	۱۳۵
بینک کی مختلف خدمات	۱۳۷
بینک کے ذریعہ تجارت	۱۳۹
بینک کے متفرق مسائل	۱۴۲
بینک سے جاری ہونے والے کارڈ کے احکام	۱۴۴
(۱) اے ٹی ایم کارڈ	۱۴۵
اے ٹی ایم (A.T.M) سے قرض کی ادائیگی	۱۴۶
(۲) ڈیبٹ کارڈ (Debit card)	۱۴۷
ڈیبٹ کارڈ سے حاصل ہونے والی خدمات	۱۴۸
ڈیبٹ کارڈ کے جواز کی شرائط	۱۵۰
ڈیبٹ کارڈ کے استعمال پر منافع کی اسکیم	۱۵۱
(۴) کریڈیٹ کارڈ (Credit card)	۱۵۲
کریڈٹ کارڈ کی خصوصیات	۱۵۵
کریڈٹ کارڈ کا تاریخی پس منظر	۱۵۶

- کریڈٹ کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آئی ۱۵۶
- کریڈٹ کارڈ کا مضرو منفی پہلو ۱۵۷
- **ہندوستان کی حیثیت اور اس میں سود لینا ۱۵۸**
- دارالحرب اور دارالاسلام سے متعلق علماء کرام کی تحقیقات ۱۵۸
- دارالحرب کی قسمیں ۱۶۰
- ہندوستان کی شرعی حیثیت ۱۶۱
- دارالحرب میں سودی معاملہ ۱۶۳
- راجح قول اور اکابر کے فتاوے ۱۶۶
- دارالحرب میں سود کو حلال قرار دینے میں فتنہ ۱۶۸
- ہندوستان میں بینک سے سود لینا ۱۶۹
- **مصارفِ سود ۱۷۰**
- حرام اور سودی مال کا مصرف ۱۷۰
- خلاصۂ تحقیق ۱۷۶
- مال حرام کے مصرف کا اصول ۱۸۱
- سود کی رقم استعمال کرنا حرام، تو غریب کو کیوں دی جائے؟ ۱۸۲
- مالِ حرام کے تصدق میں ثواب کی نیت ۱۸۲
- بینک کا سود ماں باپ کو دینا ۱۸۳
- سودی رقم اپنے پوتے کو دینا ۱۸۵
- سودی رقم اور زکوۃ سادات کو دینا ۱۸۵
- غیر مسلم فقیروں کو دینا ۱۸۶
- غریب طالب علم کو دینا ۱۸۶
- یتیم اور بیمار کو دینا ۱۸۶

- بینک انٹرسٹ سے قبرستان کی حصار بندی ۱۸۷
- شادی کے تحفہ میں دینا ۱۸۷
- ہدیہ میں لینا ۱۸۷
- بے قصور مسلم نوجوانوں کی جیلوں سے رہائی کے لیے سودی پیسہ سے مقدمہ لڑنا ۱۸۷
- تنخواہ میں دینا ۱۸۸
- مدارس اور دینی خدّام کو دینا ۱۸۸
- سودی قرض میں دینا ۱۸۹
- حکومت کے ٹیکس میں دینا ۱۹۰
- دینی کاموں میں دینا ۱۹۱
- سودی رقم پر قبضہ کرنے سے پہلے صدقہ کرنا؟ ۱۹۱
- رشوت میں دینا ۱۹۱
- بینک کے جرمانہ میں دینا ۱۹۲
- بینک انٹرسٹ کے ذریعہ انکم ٹیکس بچانا ۱۹۲
- ٹیکس سے بچنے کے لیے تدبیر اختیار کرنا ۱۹۳

مالِ حرام کی پاکی کے طریقے ۱۹۴

- مال حرام کو پاک کرنے کے طریقے ۱۹۴
- جس کی نوے فیصد رقم سود کی ہو، وہ اب توبہ کیسے کرے؟ ۲۰۴
- مال مخلوطہ بالحرام پر زکوۃ ۲۰۴

منافع سود کے احکام ۲۰۵

- مال حرام کی سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والے منافع کی پاکی ۲۰۵
- سود کے منافع سے بنائی جائیدادوں کا حکم ۲۰۹
- سودی قرضہ لے کر خریدے گیے مکان کے کرائے کا حکم ۲۱۱

- شوہر اگر بیوی کو سود کی رقم خرچ کے لیے دے تو وبال کس پر ہوگا؟ ۲۱۱
- جن کی آمدنی حرام ہو اس سے اپنا سامان فروخت کرنا ۲۱۲
- سودخور کے ورثہ کے لیے سود کا مال حلال ہے یا نہیں؟ ۲۱۲
- سود کے پیسہ سے تیار کردہ نل کے پانی کے استعمال کا جواز ۲۱۲
- متفرق مسائل ۲۱۳
- **سودی قرض اور احکام** ۲۱۵
- سودی قرض لینا کب جائز ہے؟ ۲۱۵
- ضرورت کی حد بقدر ضرورت ہے ۲۲۱
- ضرورت وحاجت کا معیار شریعت کی نظر میں ۲۲۱
- خلاصہ ۲۲۵
- ضرورت کا تعین ماہر شریعت کرے گا ۲۲۶
- ماہر شریعت کی قید کی دو مصلحتیں ۲۲۶
- ضرورت پر سودی قرض دینا ۲۲۷
- سودی قرض سے کاروبار اور اس کی آمدنی ۲۲۷
- سودی قرض لینے والے پارٹنر کے ساتھ شرکت ۲۲۸
- تعلیمی قرضے ۲۲۸
- سودی قرض کے بعض مواقع ضرورت (اکابر کی نظر میں) ۲۳۱
- کیا ہم مجبور شخص ہو سکتے ہیں؟ ۲۳۸
- مسئلہ کا حقیقی حل اور صحیح راہ ۲۳۹
- سودی قرض سے مکان (Home loan) ۲۴۱
- افلاس وتنگدستی کی وجہ سے سود ۲۴۲
- حضراتِ صحابہ ﷺ کی تنگدستی ۲۴۳

- اصل حل قناعت وایثار ۲۴۵
- ترقیاتی یا سبسڈی والے قرض کا حکم ۲۴۶
- گاڑی دلوانے کے عوض اصل رقم سے زائد کا مطالبہ کرنا سود ہے ۲۴۸
- بینک سے گاڑی خریدنے کی جائز شکلیں ۲۴۹
- کیا ورثا پر میت کے سودی قرض کو ادا کرنا لازم ہے؟ ۲۵۱
- اضافہ کے ساتھ قرض کی ادائیگی ۲۵۱

ملازمت کے احکام ۲۵۲

- بینک کی ملازمت ۲۵۲
- سودی حساب و کتاب کی ملازمت ۲۵۳
- کیا حکومت کی ہر ملازمت نا جائز ہے؟ ۲۵۴
- سعودی عرب کے بینک میں ملازمت ۲۵۴
- بینک کے اسلامی کاؤنٹر میں ملازمت ۲۵۴
- بینک کے چوکیدار کی ملازمت ۲۵۵
- ملازم بینک کی پنشن ۲۵۵
- مسلم فنڈ کی ملازمت ۲۵۶
- ناجائز ملازمت کی تنخواہ بھی نا جائز؟ ۲۵۶
- ناجائز ملازمت کو کیسے چھوڑیں؟ ۲۵۸
- حرام تنخواہ کے وبال سے بچنے کے لیے کیا کریں؟ ۲۶۰
- سودی کاروبار کرنے والے غیر مسلم کے ساتھ پارٹنر شپ ۲۶۲
- بینک کے زیور پر رکھنے کی اجرت ۲۶۲

سودی بینک کا متبادل ۲۶۳

- سودی بینک کا متبادل ۲۶۳

- متبادل شکلیں ۲۶۵
- کرایہ واجارہ ۲۶۶
- مرابحہ مؤجلہ ۲۶۷
- بینک کا شرعی طریق کار ۲۶۷
- بینک اور ڈیپازیٹر (Depositors) کا تعلق ۲۶۸
- ہندوستان کے مختلف مسلم مالیاتی ادارے ۲۶۸
- مروجہ بینک اور اسلامی بینک میں فرق ۲۶۹
- سودی اور اسلامی بینک کے اجارہ میں فرق ۲۷۰
- **انشورنس اور اس کے متعلقات** ۲۷۳
- انشورنس کی تعریف وحقیقت ۲۷۳
- کچھ اہم اصطلاحات ۲۷۴
- بیمہ کی رقم (sumassured sum insured) ۲۷۴
- انشورنس کی تاریخ ۲۷۴
- انشورنس کے مقاصد ۲۷۵
- بیمہ کمپنی کا تعارف ۲۷۶
- انشورنس کے دنیوی مصالح ۲۷۷
- دنیوی مفاسد ومضر نتائج ۲۷۹
- خلاصہ ونتیجہ ۲۸۲
- کیا انشورنس امداد باہمی ہے؟ ۲۸۲
- ایک بہت بڑا دھوکہ ۲۸۴
- انشورنس (بیمہ) کے اقسام ۲۸۵
- تجارتی بیمہ (Commercia Insurance) ۲۸۸

- بیمہ کی قسموں کا ایک خاکہ ۲۸۹
- عدم جواز کی وجوہات ۲۹۰
- ہندوستان میں جان کا انشورنس ۲۹۱
- املاک کا انشورنس (اکابر کی نظر میں) ۲۹۵
- جہاز میں روانہ کیے گیے مال کا بیمہ ۳۰۴
- کاغذات کا بیمہ ۳۰۴
- ذمہ داریوں کا انشورنس ۳۰۶
- میڈیکل انشورنس ۳۰۸
- مغربی ممالک میں صحت کا بیمہ (میڈیکل انشورنس) ۳۱۰
- میڈیکل انشورنس کا متبادل ۳۱۱
- اکیڈمی کا فیصلہ ۳۱۲
- گروپ انشورنس ۳۱۲
- اگر کوئی انشورنس پالیسی شروع کر چکا ہو ۳۱۳
- اگر بیمہ کرانا قانوناً ضروری ہو تو؟ (تھرڈ پارٹی انشورنس) ۳۱۳
- انشورنس میں سود لیے بغیر شرکت کا حکم ۳۱۶
- ٹیکس سے بچنے کے لیے انشورنس کرانا ۳۱۸
- انشورنس کی رقم سے ٹیکس کی ادائیگی ۳۱۸
- حادثہ کے متاثرین کا انشورنس کمپنی سے معاوضہ لینا کیسا ہے؟ ۳۱۸
- انشورنس کی رقم مالک کی وفات کے بعد ۳۲۰
- انکم ٹیکس سے بچانے کے لیے LIC بیمہ نکلوانا؟ ۳۲۰
- ایل آئی سی میں ایجنٹ بننا ۳۲۱
- بونس کا نام دیکر بیمہ زندگی کرانا ۳۲۱

- حج کمیٹی کا حجاجِ کرام کا بیمہ کمپنی سے بیمہ کرانا ۳۲۲
- کمپنی کا ازخود اپنے ملازمین کے لیے انشورنس کرانا ۳۲۲
- بیمہ کا متبادل ۳۲۴
- اسلامی انشورنس (تکافل) ۳۲۸
- انشورنس کا بنیادی مقصد اور اسلام ۳۲۹
- تکافل (اسلامی انشورنس) کے بنیادی اصول ۳۳۱
- فینانس لیزنگ (Finance Leasing) ۳۳۴
- آپریشن لیزنگ (Operation Leasing) ۳۳۶
- سیکیورٹی ڈیپازٹ ۳۳۷
- اسلامی اور فائنانشل لیز کے درمیان بنیادی فرق ۳۳۸
- پہلا فرق ۳۳۸
- دوسرا فرق ۳۳۸
- تیسرا فرق ۳۳۹
- مروجہ انشورنس اور تکافل میں فرق ۳۳۹
- **رہن کی مروّجہ شکلیں** ۳۴۳
- رہن کی لغوی تعریف ۳۴۴
- رہن کی اصطلاحی تعریف ۳۴۴
- راہن، مرتہن اور شیٔ مرہون کی اصطلاح ۳۴۴
- رہن کا حکم شرعی ۳۴۵
- ناجائز مروّجہ شکلیں ۳۴۵
- جائز صورت ۳۴۷
- شیٔ مرہون سے نفع اٹھانے کا حیلہ ۳۴۸

- رہن سبب ملک نہیں ۳۴۹
- مرتہن کا بلا اجازت مرہونہ سے انتفاع ۳۴۹
- راہن کی اجازت کے بعد انتفاع ۳۵۰
- مالِ رہن کو فروخت کرنا ۳۵۰
- مرتہن کا راہن کے راشن کارڈ سے انتفاع ۳۵۱
- گروی موٹر سائیکل استعمال کر کے اس کا کرایہ قرض میں محسوب کرنے کا حکم ۳۵۲
- رہن سے متعلق اکیڈمی کا فیصلہ ۳۵۲
- رہن اور اجارے میں فرق ۳۵۳
- مضاربت فاسدہ میں منافع حلال نہیں ہوتے ۳۵۴

کرنسی، نوٹ اقسام واحکام ۳۵۶

- نوٹ کی حقیقت ۳۵۶
- کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت ۳۵۷
- کرنسی نوٹ کا رواج ۳۵۹
- نوٹ مثلی ہے یا قیمی؟ ۳۶۲
- ایک ملک کی کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ ۳۶۳
- مختلف ممالک کی کرنسیوں کا تبادلہ ۳۶۴
- پرانے کرنسی نوٹ نیے نوٹوں کے ساتھ کم قیمت پر تبدیل کرنا ۳۶۷
- کرنسی نوٹ کا نصابِ زکوۃ ۳۷۰
- کرنسی نوٹ سے قرض کی ادائیگی ۳۷۰
- کرنسی نوٹ اور دراہم ودنانیر کے احکام میں فرق ۳۷۰
- نوٹ کے عوض میں سونا چاندی خریدنا ۳۷۲
- سونے چاندی کی خرید وفروخت نقدی ہو ۳۷۳

- کرنسی اور سونے چاندی کے مسائل ۳۷۳

جائز ناجائز اسکیمیں اور متفرقات ۳۸۱

- پراویڈنٹ فنڈ ۳۸۱
- پراویڈنٹ تین چیزوں کا مجموعہ ہے ۳۸۱
- پراویڈنٹ کی قسمیں ۳۸۲
- پراویڈنٹ فنڈ کا حکم (اکابر کی نظر میں) ۳۸۲
- اختیاری پراویڈنٹ فنڈ (اکابر علماء کی نظر میں) ۳۸۵
- مدرسہ میں پراویڈنٹ فنڈ ۳۸۷
- پراویڈنٹ فنڈ اور بینک کے سود میں فرق ۳۸۸
- پراویڈنٹ فنڈ پر زکوۃ کا حکم ۳۸۸
- پنشن کی حقیقت اور اس کا فروخت ۳۹۰
- جی پی فنڈ لینا جائز ہے ۳۹۳
- جی پی فنڈ کی رقم حصول سے قبل کسی کمپنی یا بینک کو سود پر دینے کا حکم ۳۹۳
- شیئر مارکیٹ ۳۹۳
- شیئر مارکیٹ کا حکم ۳۹۴
- شیئر پر زکوۃ ۳۹۷
- میوچول فنڈس (Mutual Fands) ۳۹۸
- میوچول فنڈس اور مسلمان ۳۹۹
- کیش بیک (Cashback) ۴۰۰
- ڈرابیک (Draw back) ۴۰۲
- چٹھی کا کاروبار ۴۰۲
- کمیشن کی چٹھی ۴۰۳

- سرکاری اسکیموں سے استفادہ اورتجاویز ۴۰۳
- بچیوں کی پیدائش پر تعاون کی اسکیم ۴۰۵
- چینل مارکٹنگ کا حکم شریعت کی روشنی میں ۴۰۸
- حلال وحرام کی پہچان ۴۰۸
- نفع لینا کب جائز ہوتا ہے؟ ۴۰۹
- چینل مارکیٹنگ کے اندر پائی جانے والی قباحتیں ۴۰۹
- چینل مارکیٹنگ کا حکم ۴۱۲
- ملٹی لیول مارکیٹنگ کے نقصانات ۴۱۲
- اہل علم ودعوت متوجہ ہوں ۴۱۳
- خیر خواہانہ نصیحت، دردمندانہ اپیل ۴۱۴
- جیونا کمپنی ۴۱۶
- ایزی پیسہ ایپ (Easy Paisa App) ۴۱۷
- زیسٹ منی (Zest Money) اور Zero Cost ۴۱۸
- بٹ کوئن (Bit Coin) ۴۲۰
- ورچوئل کرنسی ۴۲۳
- بانڈ وڈبنچر (Bonds Debentures) ۴۲۴
- شیئر اور بانڈ میں فرق اور اس کا حکم ۴۲۵
- فارن ایکسچینج ۴۲۵
- انعامی بانڈس (Prize bonds) کا مفہوم ۴۲۶
- انعامی بانڈز کی رقم کا شرعی حکم ۴۳۱
- انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کا حکم ۴۳۲
- بونڈس اور حکومت کو بطورِ قرض دی گئی رقم کی زکوۃ ۴۳۲

- ریٹائرمنٹ پالیسی کا حکم ۴۳۳
- نیشنل بینک سیونگ اسکیم ۴۳۳
- ایکسس بینک(Axis Bank)والی اسکیم ۴۳۳
- پیکنگ کریڈٹ ۴۳۵
- بل پرچیز (B.P.) ۴۳۵
- بل پرچیز میں مکمل سود کا دخل ہے ۴۳۵
- بیعانہ(Advanced) کی رقم ضبط کرنا ۴۳۶
- انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے فکس ڈپازٹ میں رقم جمع کروانا ۴۳۶
- ہاؤس فائنانسنگ کا شرعی حکم ۴۳۷
- ڈیبٹ کارڈ اور کریڈٹ پر ملنے والی پوائنٹس کا شرعی حکم ۴۳۷
- اخباری معمے ۴۳۹
- ڈپازٹ سرٹیفکٹ خرید کر اس پر نفع حاصل کرنا ۴۴۰
- قرض کے بدلے قرض کی بیع ۴۴۰
- حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنا ۴۴۰
- شرط پر قرض ۴۴۱
- مال حرام کی زکوۃ ۴۴۱
- **خلاصۂ کتاب** ۴۴۳
- **فہرست مراجع** ۴۶۵
- قرآن وتفسیر قرآن ۴۶۵
- کتب حدیث اور شروحات حدیث ۴۶۶
- کتب فقہ، اصول فقہ اور فتاوی ۴۶۹
- متفرق کتب ۴۷۴

تقریظ

حضرت مولانا مفتی محمد جمال الدین صاحب قاسمی دامت برکاتہم

نائب شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد

سودی لین دین حرام اور ناجائز ہے، اللہ کے غضب وغصے کا ذریعہ ہے، خدائے وحدہ لاشریک لہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ کے مترادف ہے، جو معاشرہ اور سماج سودی معاملات میں ملوث ہوتا ہے وہاں بغض وعداوت اور نفرت و دشمنی کی ناخوش گوار فضا عام ہوتی ہے، قتل وغارت گری اور جنگ وجدال کا مسموم ماحول پروان چڑھتا ہے، سودی کاروبار کی وجہ سے سماج میں معاشی و اقتصادی ناہمواری پیدا ہوتی ہے، چند لوگوں کے ہاتھوں میں مال و دولت اکٹھا ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے مالدار اور غریب لوگوں کے درمیان فاصلے بڑھتے ہیں، محبت و ہمدردی اور تعاون و دستگیری کا صالح جذبہ ختم ہوجاتا ہے، اس کے علاوہ سود کی وجہ سے معاشرے میں بے شمار مفاسد اور نقصانات جنم لیتے ہیں۔

اسلام ایک دین عدل و رحمت ہے، اس کی تعلیمات عدل وانصاف سے بھر پور، رموز فطرت سے ہم آہنگ اور عقل انسانی کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں؛ اس لئے مذہب اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے، اور سماج میں کسی بھی قیمت پر سودی لین دین کو برداشت نہیں کیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالی نے دوٹوک انداز میں اعلان فرمایا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرة) ''اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام فرمایا ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے بھی سود کی حرمت کو واضح فرمایا ہے، اور سودی لین دین پر ایسی وعیدیں بیان فرمائی ہیں جن کے تصور ہی سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، چنانچہ ایک روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے آج رات دو شخصوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے اور مجھے بیت المقدس تک لے گئے، پھر ہم آگے چلے تو ایک خون کی نہر دیکھی جس کے اندر ایک آدمی کھڑا ہوا ہے اور دوسرا آدمی اس کے کنارہ پر کھڑا ہے، جب یہ نہر والا آدمی اس سے باہر آنا چاہتا ہے تو کنارہ والا آدمی اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے جس کی چوٹ سے بھاگ کر پھر وہ وہیں چلا جاتا ہے جہاں کھڑا ہوا تھا، پھر وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر یہ کنارہ کا آدمی یہی معاملہ کرتا ہے، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ان دو ساتھیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ انہوں نے بتلایا کہ خون کی نہر میں قید کیا ہوا آدمی سود کھانے والا ہے (اپنے عمل کی سزا پا رہا ہے)۔ (بخاری)

ایک روایت میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: سود کے ستر گناہ ہیں، کم از کم گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔ (ابن ماجہ) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص سودی مال کو کتنا ہی بڑھا لے انجام کار خسارہ اور نقصان ہی ہوگا۔ (ابن ماجہ) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرب قیامت میں سود، زنا اور شراب نوشی عام ہو جائے گی۔ (المعجم الاوسط) عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی نبی کی قوم ہلاک نہیں ہوئی جب تک ان میں زنا اور سود عام نہیں ہوا۔ (المعجم الکبیر)

سود خوری کے جتنے نقصانات اور مفاسد ہیں، اور اس پر جو بے شمار وعیدیں ہیں ان کا تقاضا یہ تھا کہ ہمارا مسلم معاشرہ اس سے مکمل طور پر محفوظ و مامون ہوتا، اور ان کے گناہ سے بالکلیہ دامن کش ہوتا؛ لیکن افسوس خود ہمارا مسلم سماج اس فتنہ کا شکار ہے، اور سود کی تباہ کاریوں کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس میں ملوث ہے، گویا اللہ کے رسول ﷺ کی وہ

پیشن گوئی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں سوائے سود خود کے اور کوئی نہیں ہوگا، اگر کھلا ہوا سود نہ بھی کھایا تو اس کا دھواں بہر حال اس تک پہنچے گا۔ (صحیح مسلم)

آج روز بروز کاروبار کی نئی نئی صورتیں بازاروں میں آرہی ہیں، مارکیٹوں میں سرمایہ کاری کی نت نئی شکلیں فروغ پارہی ہیں، پیسہ کمانے اور مال وزر اکھٹا کرنے کے متعدد ذرائع متعارف کیے جارہے ہیں، ان میں سے بیشتر صورتیں حرام اور ناجائز ہیں، اور ان کی سرحدیں سود سے جاکر ملتی ہیں، ضرورت تھی اس تعلق سے کہ ایک ایسی کتاب ترتیب دی جائے جس میں سود کی حرمت، سود کے نقصانات اور سماج میں سودی کاروبار کی جو صورتیں رائج ہیں ان کو وضاحت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہو، بڑی خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ مفتی ابوبکر جابر صاحب قاسمی ناظم مدرسہ کہف الایمان جو سنجیدہ اور علمی وتحقیقی مزاج کے حامل نوجوان عالم دین ہیں، قلم وقرطاس کی دھنی اور علمی وتحقیقی سفر کے رہرو ہیں، آپ کی متعدد کتابیں اس سے پہلے بھی منظر عام پر آچکی ہیں، اور عوام وخواص کے حلقوں میں شوق سے پڑھی گئی ہیں اور ان کے معاون مفتی محمد منیر قاسمی نے اپنے ایک علمی رفیق مولانا محمد منیر صاحب قاسمی کے ساتھ اس جانب توجہ مبذول کیا، اور اس کتاب میں سود کی حرمت، سود کے نقصانات، رہن کی صورتیں اور عصر حاضر میں سودی کاروبار کی نت نئی صورتوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، زبان وبیان عام فہم ہے، ہر بات باحوالہ اور مستند کتابوں سے رجوع کر کے لکھی گئی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب بھی دیگر کتابوں کی طرح قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی، لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔ اللہ تبارک وتعالی سے دعا ہے کہ دونوں مولفین کی اس کاوش کو قبول فرمائے، ان کے اشہب قلم کو علمی وتحقیقی میدانوں میں تازہ دم اور جواں رکھے اور ان کی خدمات کو قبول وتاثیر کی نعمتوں سے سرفراز کرے۔ آمین

(مولانا مفتی) محمد جمال الدین قاسمی

نائب شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدرآباد

پہلی بات

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔أما بعد

اس کتاب کا تقاضہ اس طور پر پیدا ہوا کہ عوامی رہبری کے میدان میں محسوس ہوا کہ سود کے نقصانات گلی کوچے کے بیاج سے بین الاقوامی سودی نظام کے روشنی میں سمجھا جانے کی ضرورت ہے، یوں مسئلہ کے عمومی اور استثنائی پہلو کا سامنے ہونا ضروری ہے اور اس کے بغیر جواب سوال کے مطابق نہیں ہوگا، متداول معاصر اُردو وعربی فتاویٰ میں صاحب فتاوی شخصیت کی رائے تو موجود ہوتی ہے، مگر دیگر ہم زمانہ شخصیات کی آراء ذکر نہیں کی جاتی ہیں، اسی طرح مفتی کسی ایک مجموعۂ فتاوی کو دیکھ کر مسئلہ نہیں بتا سکتا، قدیم صورت مسئلہ کے مطابق ایک جواب لکھا ہوا ہوتا ہے جب کہ جدید صورتِ حال اُس سے قدرے مختلف ہوتی ہے، اب بدلے ہوئے حکم شرعی کی وضاحت لازم ہوجاتی ہے، اسلامی بنک کاری کی عملی شکل تو بڑے نظام ومحنت کو چاہتی ہے، لیکن سود میں مبتلی یا سودی تقاضے کو جھیلنے والے عام مسلمان کو جتنا ہوسکے آسان قابل عمل حل اور متبادل بتلایا جانا ضرورت ہے، کم از کم حرام کے چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کے وعدے، صبر واستقامت کے ساتھ تلاشِ حلال کے فائدے سُنائے جانا چاہئے، جیسے کمیشن کی چٹھی، انشورنس، ملٹی لیول مارکیٹنگ، رہن کی ناجائز وجائز مروجہ شکلوں کی وضاحت، انسٹالمنٹ (قسطوں) پر سامان کی خریداری، ورچول کرنسی، شیئر مارکٹنگ، زیسٹ منی، فارن ایکسچینج، بٹ کوئن وغیرہ۔

آراء وحوالہ جات کی کثرت، مرکزی اداروں اور علمی شخصیات کے نقطۂ نظر کو جاننے سے مسئلہ میں پائے جانے والی لچک، فقہی توسع، انداز استدلال کا اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے، پھر پیش آمدہ صورت مسئلہ کے جواب کے استخراج میں سہولت ہوتی ہے، میرے بڑوں نے بہت کچھ لکھا ہے، یہ بھی ایک طالب علمانہ حاصلِ مطالعہ، ذاتی بیاض ہے، انہیں کی تحریروں کی تسہیل وتلخیص ہے، زمینی سطح پر کام میں شاید مدد مل جائے، اس کام میں میرے عزیز دوست مفتی محمد منیر صاحب قاسمی حفظہ اللہ کا از اول تا آخر تعاون رہا بار بار تنقیح تصحیح، مذاکرے، اکابرِ علماء سے رجوع میں مجھے دھکا دیتے رہے۔ رب ذوالجلال قبول فرما، ذخیرۂ آخرت بنا۔ (آمین بجاہ سید المرسلین)

ابوبکر جابر

۲/ذی قعدہ، ۱۴۴۱ھ

۲۰۲۰/۶/۲۳ء

ربا(سود) کے مبادیات

ربا کی تعریف

لغت کے اعتبار سے ربا کے معنی ''زیادتی 'بڑھوتری بلندی'' کے آتے ہیں اوراصطلاح شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جوکسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہوتی ہے۔(۱)

الربا عبارة من فضل مال لايقابله عوض فی معاوضة مال بمال (۲)

فرانسی زبان میں Usure انگریزی میں Usury، فارسی زبان میں بھی عربی سے نقل ہوکر لفظ ''ربا'' ہی مستعمل ہے، اردو میں ''سود'' سنسکرت میں ''مول بیاج''، ہندی میں: ''بیاج بٹا'' اورموجودہ زمانے میں قانون ومعاشیات اورمالی معاملے کی زبان میں سود کو Interst کہا جاتا ہے۔(۳)

سود کی حقیقت قرآنی آیات کے ذیل میں

۱) ربا اپنی تمام قسموں سمیت حرام ہے۔(۴)

---

(۱) مظاہر حق جدید: ۳/ ۶۳

(۲) الفتاوی الهندیة:

(۳) مروجہ سودی معاملات نقل وعمل کی روشنی میں، ص:۱۹، ادارہ علم وحکمت رانی گنج، اررریہ، بہار

(۴) بقرہ:۲۷۵، مرقاۃ احکام القرآن

۲) سود کھانے والا شخص ایسا ہے کہ اسے شیطان نے چھو کر باؤلا (مجنون، بے ہوش) بنادیا ہے۔(۱)

۳) سود کی حرمت کو جاننے کے باوجود سودی معاملہ میں لگنے والے کو جہنم کا مژدہ سنایا گیا ہے۔(۲)

۴) سود کی حرمت کے اعلان کے بعد بھی سودی معاملہ میں لگنے والوں کو جنگ کا اعلان کیا گیا ہے، (۳) اور جو خدا اور رسول سے جنگ مول لیتا ہے تو وہ کہیں کا نہیں رہتا ہے۔(۴)

۵) سود سے باز نہ آنا یہودیوں کی بری خصلتوں میں سے ہے جس پر اللہ نے تنبیہ فرمائی ہے۔(۵)

۶) سود گھٹتا ہے بڑھتا نہیں ہے، (۶) سود سے برکت ختم ہوجاتی ہے بے برکتی آجاتی ہے۔(۷)

۷) سود سے نہ حج قبول ہوتا ہے، نہ صدقہ، نہ جہاد نہ کوئی صلہ رحمی۔(۸)

۸) جس سود کو انسان بڑھتا ہوا سمجھے وہ خالقِ کائنات کے نزدیک نہیں بڑھتا۔(۹)

۹) سود خوروں کو کافروں کے لیے تیار کی گئی آگ سے ڈرایا گیا ہے، یعنی سود خوروں

---

(۱) بقرہ:۲۷۵

(۲) حوالہ سابق

(۳) بقرہ:۲۷۹

(۴) مرقاۃ المفاتیح:۶/۵۵،اشرفی بکڈپو

(۵) نساء:۱۶۱

(۶) بقرہ:۲۷۶

(۷) مرقاۃ المفاتیح:۶/۴۲،روح المعانی:۲/۵۰،دار الکتب العلمية، تفسير قرطبي:۳/۳۶۰، دار إحياء التراث العربي، بيروت

(۸) تفسير قرطبي:۳/۳۶۰،دار إحياء التراث العربي، بيروت

(۹) سورۂ روم:۳۹

کے لیے بھی وہی آگ ہے جو کافروں کے لیے ہے۔(۱)

۱۰) اس مذکورہ آیت میں اشارہ ہے کہ سود خور اور کفار پہلو بہ پہلو رہیں گے۔(۲)

۱۱) سودی معاملہ ظلم ہے(۳) اور ظلم قیامت کے دن اندھیروں میں ہوگا۔

سود کی حقیقت احادیث کے ذیل میں

۱) سود سات مہلک اور تباہ کن گناہوں میں سے ایک ہے۔(۴)

۲) سود کھانے والوں کے پیٹ ایسے گھروں کی طرح بڑے ہو جائیں گے جن میں سانپ ہوں گے جو باہر سے نظر آئیں گے۔(۵)

۳) سود خوری کے ستر حصے ہیں ان میں سے ادنیٰ اور معمولی ایسا ہے جیسے کہ اپنی ماں کے ساتھ منھ کالا کرے۔(۶)

۴) سود چاہے کتنا ہی زیادہ ہو جائے اس کا آخری انجام قلت اور کمی ہے۔(۷)

۵) سود کھانے والا، کھلانے والا (یعنی سود دینے والا) سودی دستاویز لکھنے والا اور اس پر گواہ سب برابر ہیں (نفس گناہ میں) سب پر اللہ اور اس کے رسول کی لعنت ہے۔(۸)

۶) سود جاننے کے باوجود سود کا ایک درہم کھانا چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ

---

(۱) آل عمران:۱۳۱

(۲) روح المعانی:۳/۸۸، زکریا بکڈپو

(۳) بقرہ:۲۷۹

(۴) صحيح البخاري، كتاب الوصايا، باب قول الله تعالى إن الذين يأكلون، حدیث نمبر: ۲۷۶۶

(۵) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۳

(۶) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۴

(۷) سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ في الربا، حدیث نمبر: ۲۲۷۹

(۸) صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب لعن أكل الربا و مؤكله، حدیث نمبر: ۱۵۹۸

بڑا گناہ ہے۔(۱)

۷) جس کا جسم حرام مال (سود رشوت وغیرہ) سے نشو نما ہوا ہو اس کے لیے تو جہنم کی آگ زیادہ بہتر ہے۔(۲)

۸) شریعت نے قرض خواہ کو قرض دار کے تحفہ کو قبول کرنے سے بھی محتاط رکھا ہے۔(۳)

۹) سود خور کو خون کی نہر میں پتھروں سے مارا جائے گا اور اسے اس سے نکلنے نہیں دیا جائے گا۔(۴)

۱۰) سود خور کو جنت میں داخل نہ کرنے کا اللہ نے التزام کیا ہے۔(۵)

۱۱) جب سود اور زنا پھیل جاتا ہے تو اللہ کا عذاب ان پر اترتا ہے۔(۶)

۱۲) سود کھانے، شراب پینے، ریشم پہننے وغیرہ سے اس امت کے چہرے بندر اور خنزیر کے بن جائیں گے۔(۷)

۱۳) سود خور قیامت میں مجنون اور مخبوط الحواس ہو کر اٹھایا جائے گا۔(۸)

۱۴) سود خوری کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔(۹)

۱۵) سودی لین دین کرنے والے ذلیل وخوار ہوں گے اور دوسری قومیں ان پر غالب آجائیں گی۔(۱۰)

---

(۱) مسند أحمد، مسند الأنصار، حديث عبد الله بن حنظلة بن الراهب، حدیث نمبر: ۲۱۹۵۷

(۲) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۴/ ۱۴۱، دار الكتب العلمية، حدیث نمبر: ۷۱۶۴

(۳) سنن ابن ماجه، كتاب الصدقات، باب القرض، حدیث نمبر: ۲۴۳۲

(۴) صحيح البخاري، باب ماقيل في أولاد المشركين، حدیث نمبر: ۱۳۸۶

(۵) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۲/ ۴۳، دار الكتب العلمية، حدیث نمبر: ۲۲۶۰

(۶) المستدرك على الصحيحين للحاكم: ۲/ ۴۳، دار الكتب العلمية، حدیث نمبر: ۲۲۶۱

(۷) مسند أحمد، حديث عبادة بن صامت، حدیث نمبر: ۲۲۷۹۰، مؤسسة الرسالة

(۸) عمدة القاري، باب آكل الربا: ۱۱/ ۲۰۰، دار الإحياء التراث العربي، بيروت، والترغيب والترهيب: ۲/ ۱۳۵، حدیث نمبر: ۱۴۰۱، دار الحديث القاهرة

(۹) المعجم الكبير للطبراني: ۱۷/ ۴۳، حدیث نمبر: ۱۲۰، مكتبة ابن تيمية

(۱۰) سود، جوا، رشوت، قرض کے شرعی احکام ص ۱۲، صفائی معاملات ص ۱۶

سود دیگر مذاہب میں

سود کو اسلام ہی برا نہیں کہتا بلکہ یونان کا ارسطو بھی ، روما کے مقنن بھی ہندو اور یہودی مصلح بھی اور سب سے عجیب یہ کہ جدید ترین رجحانات ۔۔۔۔کیمرج اور امریکہ کے پروفیسر یہ سب کے سب۔۔۔۔سود کی حرمت ہی کے قائل ہیں۔(۱)

دنیا کے قدیم معاشروں میں بھی سود کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، ارسطو نے زر کو لڑک مرغی قرار دیا ہے جو انڈے نہیں دیتی، ارسطو کے قول کے مطابق زر کے استعمال کا مقصد ہی یہ تھا کہ مبادلہ دولت میں آسانی پیدا کی جائے اور انسانی احتیاجات کو پورے طور پر پورا کیا جائے ،غرض ارسطو کا نظریہ تھا کہ روپیہ روپیہ کو نہیں جنتا ارسطو کے علاوہ افلاطون بھی سود کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔(۲)

چوں کہ سود ہر دور میں بنی نوع انسان کے لیے جاں گسل مسئلہ کی حیثیت سے موجود رہا ہے، اس لیے ہر دین ومذہب میں اسے حرام قرار دیا گیا ہے، چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

"أجمع المسلمون على تحريم الربا، وقيل: إنه كان محرما في جميع الشرائع"(۳)

اور اسی کی طرف علامہ قرطبی رحمہ اللہ اور ماوردی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے۔

یہودی مذہب میں

تورات کی کتاب "استثنا" میں ہے: "تم اپنے بھائی کو سودی قرض نہ دینا خواہ روپے کا سود ہو یا اناج کا یا کسی ایسی چیز کا جو بیاج پر دی جایا کرتی ہے"۔(۴)

(۱) فتاوی بینات: ۱۰/۴

(۲) حوالہ سابق: ۲۱/۴

(۳) فقہ الربا ص: ۵، نقلا عن المجموع: ۹/۳۸۷، ط: موسسۃ الرسالۃ، مستفاد: مروجہ سودی معاملات نقل وعقل کی روشنی میں۔

(۴) الاصحاح الثالث والعشرين من سفر التثنية (۲۱٦) الربا وأثره في المجتمع الإنساني

سفر الخروج میں ہے:

''اگر تم لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو کچھ قرض دو تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا'' (۱)

عیسائی مذہب میں

انجیل لوقا میں ہے:

''اگر تمہارا کوئی بھائی مفلس ہو جائے اور وہ تمہارے سامنے تنگ دست ہو تو اسے سنبھالنا وہ پردیسی اور مسافر کی طرح تیرے ساتھ رہے، تم اس سے سود یا نفع مت لینا، بلکہ اپنے خدا کا خوف رکھنا، تا کہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگی بسر کر سکے، تم اپنا روپیہ اسے سود پر مت دینا اور اپنا کھانا اسے نفع کے خیال سے نہ دینا'' (۲)

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں

''ترتیا جگ'' کے نارائن اپنیشد میں لکھا ہے کہ سود پاپ ہے، ''منوسمرت'' میں برہمن اور چھتری جیسے عام طبقوں کے لیے سود قطعی طور پر ممنوع ہے، مہا بھارت کی ایک کہانی کا ٹکڑا ہے کہ ''ادھاری دی ہوئی رقم پر سود لینے والا دولت مند، اپنی لڑکی کے پیسے کھانے والا باپ، جھوٹی گواہی دینے والا، غداری کرنے والا، چِتا پر مرے کتے کا پکا ہوا گوشت کھانے والے سے سوگنا زیادہ بُرا پاپی (گنہگار) ہے۔

گیانیشور مہاراج سود کھانے والوں سے طنزاً کہتے ہیں: ''گھر میں آگ لگنے پر جو لالچ ساہوکار (سود بیاج چلانے والا) اپنے بیاج کے کاغذات نکال لینے کے لیے جلتی آگ میں کودنے سے باز نہیں آتے، ایسے لالچی لوگ مفت ملنے والی روح کی مٹھاس پتا نہیں کیسے ٹھکرا دیتے ہیں؟؟'' (۳)

---

(۱) الآیۃ: (۲۵) من الفصل (۲۲) سفر الخروج

(۲) انجیل لوقا/الربا و آثارہ فی مختلف الدیانات لعیاش حمود (۳) بیاج بٹا، ص: ۲۶

عقلاء کی نظر میں

اوپر کی وضاحت سے معلوم ہوگیا کہ: سود نہ صرف اسلام میں بلکہ اسلام کے ساتھ ساتھ مذاہب منسوخہ (جیسے عیسائیت، یہودیت، غیر آسمانی مذہب مثلاً: ہندومت) میں بھی حرام قطعی ہے؛ بلکہ دیگر غیر مسلم عقلاء کے نزدیک بھی یہ کسی ناسور سے کم نہیں۔

"ارسطو" کا نظریہ

ارسطو جن کا زمانہ چوتھی یا پانچویں قبل المیلاد ہے اور جو یونان کے فلسفیوں میں سے ایک ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: روپے پیسے معاملات کرنے کے لیے منافع بخش ہوتے ہیں؛ لیکن جب یہ لوگوں کو منافع کے ذریعہ دھوکہ میں ڈال دیں جنہیں وہ استعمال نہ کرسکیں، یا معاملہ قرض کے راستے مال جمع کرنے لگیں تو یہ نقدی مال بے قیمت، بے فائدہ ہوجاتے ہیں اور مال داری اور قلت مالی کے درمیان تفاوت پر معین ہوتے ہیں، وہ مثال دیتے ہیں کہ جس طرح کڑک مرغی انڈے نہیں دے سکتی اسی طرح رکھے ہوئے پیسے دوسرے پیسے نہیں پیدا کرسکتے۔

گاندھی جی کا نظریہ

گاندھی جی کہتے ہیں کہ: آج جس طرح کا بیاج، بٹا دنیا میں چل رہا ہے، وہ یا تو غیر ملکی تاجروں کی دلالی یا آڑھت کا پیشہ ہے، یا کسانوں اور دوسرا دھندا کرنے والوں کی زمین، جائیداد نیز مال ملکیت کو آہستہ ہضم کرجانے کے کھوٹے طریقے ہیں، اَن پڑھ، بھولے اور دوسروں کی باتوں پر بے تکا یقین کرلینے والوں یا عیش پسند امیروں یا راجہ اور رئیسوں کو ناجائز خرچ اور عادت میں پڑنے کی ترغیب دے کر انہیں قرض میں پھنسانا، لین دین کے بیوپار میں انہیں ٹھگنا، جھوٹے بھی کھاتے اور دستاویز بنانا، ساہوکاری نہیں؛ بلکہ بدترین گناہ اور ہنسا (ظلم) ہے، ایسے ادھ مرے بیاج بٹے کے روزگار سے فائدے میں نہیں، بلکہ نقصان میں اضافہ ہوا ہے۔(۱)

---

(۱) بیاج بٹا، ص: ۷

الغرض سود ہر مذہب میں حرام ہے، یہ شریعت محمدی کی نہ سختی ہے نہ یہود وعیسائی مذہب کی آزادی ہے، عمومی طور پر کسی مذہب والوں کے ترک عمل سے وہ حرام حلال نہیں ہوجاتا، کم علمی یا ناواقفیت جواز کی دلیل نہیں بن سکتی، تمام ساوی وارضی مذہب میں اس کے نقصانات اور حرام ہونے کا مواد کافی وافی موجود ہے جس سے اس کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔

بتدریج سود کی ممانعت

جس وقت کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اہل عرب میں بہت سی عادتیں راسخ ہوچکی تھیں، بعض عادتیں تو ایسی تھیں کہ ان سے قوم کے نشوونما میں کوئی ضرر نہیں پہنچتا لیکن کچھ عادتیں مضر تھیں اس لیے شارع (اللہ تعالیٰ) نے ان سے ان کو الگ رکھنا چاہا، اس لیے اس نے اپنی حکمت سے آہستہ آہستہ ان کے لیے اپنے حکم کو ظاہر کیا اور رفتہ رفتہ اپنے دین کو کمال کے درجہ تک پہنچایا، اس اصول کو پیش نظر رکھ کر جو بھی غور کرے گا اس کو معلوم ہوگا کہ دوسرے حکم سے پہلا حکم باطل نہیں ہوجاتا بلکہ اس کی تکمیل ہوتی ہے یہی اصول سود کے بارے میں بھی برتا گیا ہے۔

عرب میں سودخوری عام تھی، سرمایہ داروں کا دعویٰ تھا کہ سود بھی تو ایک طرح کا لین دین ہے جس میں روپیہ کی تجارت ہوتی چنانچہ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے کہ ''قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا''(۱) وہ کہتے تھے کہ سود تجارت ہی کا سا ہے''۔ عرب سرمایہ دار اور یہودی ساہوکار عام طور پر سودی کاروبار کرتے تھے، حجاز کی منڈی خیبر ان ہی سرمایہ دار یہودیوں کے ہاتھ میں تھی بعض یہودیوں مثلاً ابو رافع یہودی کو ''تاجر حجاز'' کا لقب دیا گیا تھا یہ سرمایہ دار یہودی پختہ گڑھیاں بنا کر اس میں رہتے اور غریب طبقہ پر ظلم ڈھاتے تھے۔

سود کے انسدادی سلسلہ میں پہلے پہل یہ بتایا گیا کہ سود کھانا یہودیوں کی

---

(۱) بقرہ:۲۷۵

عادت ہے کہ وہ ناحق لوگوں کا مال کھاتے ہیں۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○(۱)

ترجمہ:وہ سود لیا کرتے تھے، حالاں کہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا، اور ناحق طریقہ پر لوگوں کے مال کھالیا کرتے تھے اور ہم نے ان میں سے کفر پر جمے رہنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کررکھا ہے۔

واضح ہو کہ سود کی شرح نہایت گراں ہوا کرتی تھی، اکثر سود رہم بطور قرض دے دیئے جاتے ، یہ سود اصطلاحی کمپونڈ انٹرسٹ (Compund Intrext) کہا جاتا ہے، سال تمام ہونے پر اگر مقروض قرض ادا نہ کرتا تو دوسرے سال بجائے سو کے ساہوکار دوسو طلب کرتے اگر وہ پھر بھی ادا نہ کرتا تو تیسرے سال چار سو طلب کرتے اور یونہی ہر سال مدت کے گزرنے پر دوگنا ہوتا چلا جاتا یا مقروض ادا کردیتا اور یہی سود درسود''اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً'' تھا جس سے مسلمانوں کو ابتداء میں روک دیا گیا کہ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲)

مسلمانو! سود درسود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرتے رہو کہ فلاح پاؤ۔

اس آیت کے نزول کے بعد بھی سودی کاروبار کچھ نہ کچھ باقی رہا، ظاہر ہے کہ ''سود درسود'' کی ممانعت کی گئی تھی، معمولی شرح کا سود ابھی ممنوع نہ ہوا تھا کیوں کہ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک سودی کاروبار جاری رہا، چنانچہ اسلامی ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سودی کاروبار کی محدود اجازت تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کے باشندوں سے جو معاہدہ کیا اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ ایک محدود مدت تک کے لیے سود کی اجازت

---

(۱) نساء:۱۶۱

(۲) آل عمران:۱۳۰

دی گئی تھی، (۱) پھر ہر قسم کے سودی کاروبار کی ممانعت کردی گئی، چنانچہ سود کی پوری تحریم کا جو ابتدائی حکم صادر ہوا وہ یہ ہے:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ○ (۲)

”جو لوگ سود کھاتے ہیں تو وہ قیامت کے دن اس طرح اٹھیں گے جس طرح کہ شیطان سے لپٹا ہوا کوئی شخص حواس باختہ اٹھتا ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے تھے کہ تجارت سود ہی کی طرح ہے، حالانکہ تجارت کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام، پھر جس نے اپنے رب کی نصیحت سن لی تو ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے لیکن جس نے دوبارہ سود لیا تو وہ دوزخی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، خدا سود کو گھٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے، خدا کسی ناشکرے گنہگار کو پسند نہیں کرتا“۔

پھر یہ حکم ہوا:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳)

---

(۱) کتاب الأموال لأبی القاسم بن سلام، باب کتب العهود التی کتبها رسول الله ﷺ و أصحابه لأهل الصلح: ۲۰۶، دار الکتاب العلمیه بیروت

(۲) البقرة: ۲۷۵-۲۷۶

(۳) الروم: ۳۹

''اور جو تم لوگ سود دیتے ہو تا کہ لوگوں کے مال میں اضافہ ہو تو وہ خدا کے ہاں نہیں بڑھتا اور جو تم خدا کی رضا جوئی کے لیے زکوۃ دیتے ہو تو وہی لوگ اللہ کے ہاں اپنے دیے کو بڑھا رہے ہیں''۔

پھر نبوت کے آخری سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کا یہ قطعی حکم سنا دیا:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (۱)

''مسلمانو! خدا سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو سود کی بابت جو تمہارا مطالبہ لوگوں کے ذمہ ہے اس کو چھوڑ دو اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر توبہ کر لو تو اصل رقم تم کو ملے گی، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے اور اگر مقروض تنگدست ہو تو فراخی تک مہلت دو، اور اگر سمجھو تو (اصل قرضہ بھی) بخش دو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے''۔

سود کی پوری ممانعت کے احکام کا تعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری زمانے سے ہے چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

''آخری آیت جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ آیت ربوا تھی''۔(۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے:

''سب سے آخر میں ربوا کی آیت نازل ہوئی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

(۱) البقرۃ:۲۷۸-۲۸۰

(۲) جامع البیان، سورۃ البقرۃ:۲۷۸، ۷۵/۳، دار المعرفۃ بیروت

نے وفات پائی بغیر اس کے کہ اس آیت کی تشریح فرماتے، پس تم ربوا اور جو چیز شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دو''۔(۱)

سود کیوں حرام ہے؟

آج کل لوگوں میں یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ لوگ یہ دریافت کرتے ہیں کہ سود کیوں حرام ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ جان کا بیمہ کیوں ناجائز ہے؟ اس میں تو بڑا نفع ہے۔ یاد رکھو! کہ اس سوال کا کسی مسلمان کو حق نہیں، مسلمان کے لیے اتنی وجہ کافی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس فعل سے ناراض ہیں، عاشق کو اتنی بات معلوم کرنے کے بعد کہ محبوب اس بات سے ناراض ہو جاتا ہے کسی اور وجہ کا انتظار نہیں ہوتا، پھر مسلمان کو گناہ کے متعلق علتوں اور حکمتوں کی تلاش کا انتظار کیوں ہے؟ اور اگر تم عاشق نہیں بنتے تو خدا کے غلام تو ہو، اب خود ہی انصاف کرلو کہ اگر تمہارا کوئی نوکر یا غلام یہ دریافت کرنے لگے کہ آپ فلاں کام سے کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ بتلا دیجئے تب میں اس کام سے باز آؤں گا، ورنہ میں اپنی رائے پر عمل کروں گا، تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ افسوس! کہ ہم اس غلام سے بھی گئے گذرے ہو گئے جس کو ایک شخص نے خریدا اور پھر پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: اب تک خواہ کچھ بھی نام تھا لیکن اب تو وہی نام ہے جس نام سے آپ پکاریں، آقا نے پوچھا کہ تو کیا کھاتا ہے؟ کہنے لگا: جو حضور کھلائیں گے وہی کھاؤں گا، جو آپ پہنائیں گے وہی پہنوں گا۔

افسوس! ہم خدا کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور خدا کے احکام کی علتیں ڈھونڈتے ہیں، آج کل اکثر تعلیم یافتہ ہیں کہ ان کو یہ جواب کافی نہیں ہوتا کہ سود اس واسطے حرام ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہیں، بلکہ وہ اس کی عقلی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں اور جب تک علت معلوم نہ ہو اس وقت تک ان کو تسلی نہیں ہوتی۔(۲)

---

(۱) فتاوی بینات: ۴/۱۴، ۱۷

(۲) سود، رشوت، جوا قرض کے شرعی احکام ص: ۱۰

سود کو حلال سمجھنے والا مرتد ہے

سود کو حلال سمجھنا کفر ہے اور اسلام کے بعد کفر کرنا ارتداد ہے اس لیے یہ شخص (جو سود کو حلال سمجھتا ہے) مرتد ہو جائے گا، اگر از سرِ نو اسلام قبول نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جاتا ہے اور اس کا تمام مال اس کی ملکیت سے زائل ہو جاتا ہے۔

سود کو نہ چھوڑنا اگر اس طرح ہے کہ حلال تو نہیں سمجھتا (لیکن باز نہیں آتا تو اگر اسلامی حاکم ہے اس کے لیے شرعی حکم یہ ہے کہ) اس پر جبر کرنا چاہیے اور اگر وہ جبر کو نہ مانے بلکہ گروہ بنا کر مقابلہ میں آجائے تو ان سے جہاد کرنا چاہئے، کیونکہ ایسے لوگوں کا حکم باغیوں کا سا ہوگا اور باغی کے احکام میں یہ ہے کہ ان میں جو لوگ قتل سے بچے رہیں ان کا مال ان کی ملکیت سے تو زائل نہیں ہوتا مگر ان کے قبضے سے نکال لیا جاتا ہے یعنی چھین کر اپنے قبضے میں امانت کے طور پر رکھا جاتا ہے، وہ لوگ جس وقت توبہ کر لیں گے ان کے اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں، یہ سب مسائل ہدایہ میں موجود ہیں۔(۱)

سود کا انجام

سود کے ذریعہ دولت خواہ کتنی ہی بڑھ جائے لیکن آخر کار دنیا میں بھی اس پر زوال آئے گا تو ظاہر بینوں (ظاہری حالت پر نظر رکھنے والوں) کو تو اس میں شک اور کلام ہوسکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جن کو حقائق دیکھنے والی نگاہ دی ہے انھیں اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہ ہوگا بکثرت ایسے واقعات مشہور ہیں کہ ایک شخص سود کے ذریعہ اپنی دولت میں اضافہ کرتا رہا اور وہ اپنے وقت کا قارون بن گیا، پھر کبھی اس شخص کی زندگی ہی میں اور کبھی اس کے بعد کوئی ایسا حادثہ رونما ہوا اور ایسی کوئی آفت آئی جس نے سارا حساب برابر کر دیا اور کبھی کبھی تو لکھ پتی اور کروڑ پتی دیوالیہ اور محتاج ہو کر رہ گیا، اور یہ بات سو فیصد مشاہدہ اور تجربہ میں ہے کہ سود خور لوگ اس حقیقی راحت اور عزت واحترام سے یکسر محروم رہتے ہیں جو دولت کا اصل مقصد اور ثمرہ ہے، اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے

---

(۱) بیان القرآن: ۱/ ۱۶۷

کہ کوئی سود خور سودی کاروبار کے ذریعہ خواہ کتنی ہی دولت پیدا کرلے وہ دولت کے حقیقی لطفِ ثمرہ سے ہمیشہ محروم رہتا ہے، اس حساب سے وہ دولت مند ہونے کے باوجود مفلس اور تہی دست ہی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے **يَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا** (ربا اور سود سے کمائی ہوئی دولت کو اللہ تعالیٰ برکت سے محروم رکھتا ہے اور اس پر دیر سویر بربادی آتی ہے) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اسی ارشادِ خداوندی کی ترجمانی کی گئی ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: الرِّبَا وَإِنْ كَثُرَ، فَإِنَّ عَاقِبَتَهُ تَصِيرُ إِلَى قُلٍّ(۱)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہوجائے لیکن اس کا آخری انجام قلت اور کمی ہے۔

الغرض سودی معاملہ (لین دین) ایسا خبیث اور لعنتی معاملہ ہے کہ اس میں کسی طرح کی شرکت بھی لعنتِ الٰہی کا موجب ہے اس بنا پر سود دینے والا، سودی دستاویز کا کاتب اور اس کے گواہ بھی لعنت میں حصہ دار ہیں، لہٰذا جو خدا اور رسول کی لعنت اور ان کے غضب سے بچنا چاہے اور اپنے آپ کو ذلت سے بچانا چاہے تو وہ اس سودی معاملہ سے دور رہے۔ (۲)

الغرض سود چاہے جتنا بڑھ جائے آخرت کے اعتبار اور برکت کے اعتبار سے گھٹتا ہی جائے گا۔ **يَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ.**

حرام مال کی نحوست اور بدانجامی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ حرام مال اتنا خبیث اور ایسا منحوس ہے کہ اگر کوئی آدمی سر سے پاؤں تک درویش اور قابل رحم فقیر بن کے کسی مقدس مقام پر جاکے

---

(۱) مسند أحمد بن حنبل، مسند عبداللہ بن مسعود، رقم: ۳۷۵۴

(۲) مستفاد معارف الحدیث جلد سوم حصہ ہفتم، ص: ۵۰۶، ۵۰۸

دعا کرے لیکن اس کا کھانا پینا اور لباس حرام سے ہو تو اس کی دعا قبول نہ ہوگی۔ نیز حرام مال سے کیا ہوا صدقہ قبول نہیں ہوتا اور حرام کمائی میں برکت نہیں ہوتی، اور جب کوئی آدمی ناجائز وحرام طریقہ سے کمایا ہوا مال مرنے کے بعد وارثوں کے لیے چھوڑ گیا تو وہ آخرت میں اس کے لیے وبال ہی کا باعث ہوگا اس حرام کو کمانے کا بھی گناہ ہوگا اور وارثوں کو حرام کھلانے کا بھی (حالانکہ وارثوں کے لیے حلال مال چھوڑ جانا ایک طرح کا صدقہ ہے اور اس پر یقیناً اجر وثواب ملنے والا ہے) صدقہ اگر صحیح وپاک مال سے نہ ہو تو وہ گناہوں کا کفارہ اور مغفرت کا وسیلہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا جس طرح گندے اور ناپاک پانی سے ناپاک کپڑا صاف نہیں کیا جاسکتا۔ "إن الله لا يمحوا السيئ بالسيئ" (۱)

ایک لقمہ بھی حرام کا جو منہ تک جاتا ہے اس کے وبال سے چالیس دن تک دعا قبول نہیں ہوتی۔

اور اگر دس درہم کی پوشاک میں ایک درہم یعنی چار آنہ کی بھی مقدار حرام مال ہو تو جب تک وہ لباس بدن پر رہتا ہے اس کی نماز (عنداللہ) مقبول نہیں ہوتی، اور حرام مال سے نہ صدقہ خیرات قبول نہ اس سے خرچ کرنے میں برکت ہوتی ہے، اور جو شخص حرام مال چھوڑ جائے وہ مال اسکو دوزخ میں لے جانے کا رہبر ہو جاتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت میں داخل نہیں ہوگا وہ گوشت جو بڑھا ہوا ہو حرام سے (یعنی جس کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہو) اور جو گوشت حرام سے بڑھا ہوا اس کے لائق تو دوزخ ہی ہے۔

پیٹ بدن کے حوض کی طرح ہے اور دوسرے اعضاء نالیوں کی طرح ہیں جو اس سے پھوٹی ہوئی ہیں، پس جیسا حوض میں پاک وصاف پانی ہے تو نالیوں میں بھی پاک وصاف ہوگا اور اگر حوض میں ناپاک اور خراب پانی ہے تو نالیوں میں بھی خراب پانی ہوگا،

---

(۱) معارف الحدیث: ۷/ ۴۸۷، ۴۸۸

پس اگر پیٹ میں حرام غذا ہے تو اعضاء سے اعمال بھی خبیث ہی صادر ہوں گے اور اگر حلال غذا ہے تو اعمال بھی نیک ہوں گے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ کھانا حرام، کپڑا حرام، روپیہ حرام۔(۱)

سود لینا اور دینا برابر ہے

قرآن وحدیث میں جن گناہوں کی سخت مذمت کی گئی ہے، غالبا کفر کے بعد سود، ان میں سرفہرست ہے، سود کے باب میں نہ صرف سود لینے کو منع کیا گیا؛ بلکہ سود دینے والے، سودی کاروبار کو لکھنے والے اور سودی معاملہ پر گواہ بننے والے پر بھی لعنت کی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سب گناہ میں برابر ہیں:

"عن جابر رضی اللہ عنہ لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء"(۲)

اسی لیے فقہاء نے قاعدہ مقرر کیا ہے:

"ما حرم أخذه حرم أعطائه"(۳)

''جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے''

اس لیے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس طرح سود کا لینا حرام ہے، اسی طرح اصلی طور پر اس کا دینا بھی حرام ہے؛ لیکن ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ سود کا لینا حرام لیعنہ ہے اور سود کا دینا حرام لغیرہ، اگر کوئی شخص قرض لے اور قرض لیتے وقت قرض دہندہ کی طرف سے زیادہ پیسے ادا کرنے کی شرط نہ ہو؛ لیکن قرض لینے والا اپنے طور پر زیادہ رقم ادا کردے تو اس کی ممانعت نہیں ہے؛ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ادائیگی کا بہتر طریقہ قرار دیا ہے:

---

(۱) احکام المال ص: ۲۰۷، ۳۰۲ محمد زید مظاہری صاحب

(۲) مسلم

(۳) الأشباہ والنظائر: ۱/ ۴۴۹، قاعدہ: ۱۴

"إِنَّ خِيَارَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً"(۱)

لیکن چوں کہ سود دینے سے بھی سود لینے والے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے؛ کیوں کہ اگر سود دینے والے موجود نہ ہوں، تو کوئی شخص سود دے نہیں سکتا؛ اسی لیے سود دینے کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے، فقہاء کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام لعینہ اور حرام لغیرہ کے احکام میں کسی قدر فرق ہے، حرام لعینہ کی تو اصطلاحی ''ضرورت'' (انتہائی درجہ مجبوری) کی بنیاد پر ہی گنجائش ہوتی ہے؛ لیکن جو چیزیں حرام لغیرہ ہیں اصطلاحی ''حاجت'' کے تحت بھی ان کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

اس حوالہ سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

اطلاقِ حدیث سے تو دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال لعن رسول الله ﷺ أكل الربوا و موكله و كاتبه و شاهديه وقال هم سواء (۲)

مگر شراح حدیث کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ مقدارِ گناہ میں تفاوت ہے اگرچہ نفسِ گناہ میں دونوں شریک ہیں

كما في المرقاة تحت الحديث المذكور في أصل الإثم وإن كانوا مختلفين في قدره. (۳)

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دینے والے کو صرف دینے کا گناہ ہوگا اور لینے والے کو لینے کا بھی اور اس کے صرف واستعمال کا بھی، یا یہ کہ دینے والے کو بہ نسبت لینے والے کے کچھ اضطرار ہے واللہ اعلم

---

(۱) بخاری: ۲۳۹۳ (۲) رواہ مسلم: ۱۵۹۸

(۳) مرقاۃ المفاتیح، کتاب البیوع، باب الربا: ۶/۵۱، نعیمیہ

بحقیقة الحال لیکن جب دونوں میں گناہ ہے تو اب کم وزائد ہونے سے کچھ حرمت تو زائل نہیں ہوتی، جیسا کہ پاخانہ بھی گندہ ہے اور پیشاب بھی گندہ ہے اگر چہ ایک دوسرے سے زیادہ گندہ ہے مگر گندگی دونوں میں ہے سب سے بچنا چاہئے‘‘۔(۱)

نام بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ کسی چیز کا نام بدلنے سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی کسی جانور کو انسان کا نام دیدیا جائے تو وہ جانور انسان نہیں بن جاتا، ایک شخص نے چینی کے ڈبہ پر لکھ دیا کہ یہ ’’نمک کا ڈبہ‘‘ ہے تاکہ چیونٹی دھوکہ کھا جائیں، مگر ہوا یوں کہ چونٹیاں ڈبہ پر نام بدلنے سے دھوکہ نہیں کھائیں اور اپنے قدرتی حواس کے ذریعہ وہ چینی تک پہنچ گئیں، اس لیے آپ بینک کے سود کا نام چاہے جو رکھ لیں ’’نفع رکھ لیں یا ’’بونس‘‘ (Bounes) رکھ لیں یا ’’احسان‘‘ رکھ لیں اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی، ایک سچا پکا مسلمان اپنی مومنانہ فراست سے اس کو سود ہی سمجھے گا۔

اگر کوئی کہے کہ شریعت نے خنزیر کو اس لیے حرام کیا ہے کہ وہ غلاظت کھاتا ہے اب اگر کسی خنزیر کو ابتداء سے حلال اور پاک صاف ستھری غذائیں کھلائی جاتی ہوں اور اس کی نگہداشت کی جائے تو کیا وہ جانور حلال ہوجائے گا؟ جس طرح شراب کو Bear,Brandy,Whisky,Coke وغیرہ نام دیدیں تو شراب کی حقیقت نہیں بدلتی، وہ شراب بہر حال شراب رہتا ہے اسی طرح دنیا والے سود کو Finance Comershelloan,FixDiposit,Intrest وغیرہ جو بھی دیدیں وہ بدستور سود ہی رہے گا۔(۲)

الغرض کسی چیز کے سود ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے سود کا نام دیا

(۱) امداد الفتاوی جدید مطول: ۵/ ۲۵-۲۶

(۲) مستفاد از بینک کا سود، معارف القرآن

جائے، اگر سود کی حقیقت پائی جائے اور اسے نام کچھ اور دے دیا جائے تو یہ بھی سود ہی میں داخل ہے، فینانس کمپنیاں قرض فراہم کرتی ہیں اور اضافہ کے ساتھ اسے وصول کرتی ہیں، یہ واضح طور پر سود کی صورت ہے، جو چٹھیاں نقصان کے ساتھ اٹھائی جاتی ہیں، اس میں بعض تو زیادہ رقم ادا کرتے ہیں اور بعض کم وصول کرتے ہیں، اس طرح سود دینے کی صورت پائی گئی، اور بعض لوگ کم رقم ادا کرتے ہیں اور کمیشن کے نام پر بحیثیت سود کا لینا پایا گیا، لہٰذا خواہ اسے نام کچھ بھی دیا جائے یہ صورتیں سود کی لین دین کی ہیں، اس لیے ناجائز ہیں۔

سودخوروں کے بدترین حیلے

بعض سودخوروں نے یہ حیلہ نکالا ہے کہ ان کے پاس کوئی شخص قرض مانگنے آیا، انہوں نے ایک رومال میں سو روپیہ باندھ کر کہا کہ یہ پورا ایک سو پچیس روپئے کا ہے سو روپئے کے بدلے میں سو روپئے اور رومال کے بدلے میں پچیس روپئے (حالانکہ رومال کی قیمت زائد سے زائد دو چار روپئے ہوگی) دوسرے شخص نے قبول کرلیا اور ادا کرتے وقت ایک سو پچیس روپیہ دے دیا، یہ بالکل حرام ہے کیونکہ اصل مقصود یہ ہے کہ ایک سو روپیے کے بدلے میں ایک سو پچیس روپیے لوں گا، رومال کو بیچنا ہرگز مقصود نہیں، محض حیلے کے لیے بیع کی صورت اختیار کی ہے۔

اور اگر بیع کو مقصود بھی مان لیا جائے تب بھی چار روپیے کا رومال پچیس روپیے میں صرف اس دباؤ سے خریدا ہے کہ اگر نہیں خریدتے تو قرض نہیں ملتا، اور راقم کا یہ قاعدہ ہے کہ جو نفع قرض کے دباؤ سے حاصل ہو وہ سود ہے، حدیث شریف میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

اسی طرح جس جگہ چاندی کو چاندی کے بدلے اور سونے کو سونے کے بدلے کم وزیادہ کرکے بیچنا منظور ہو مگر جائز کا حیلہ اختیار کرنے کے لیے کم جانب میں ایک روپیہ مثلاً ملالیں کہ جس کی قیمت اس قدر نہ ہو جس قدر دوسری طرف زیادہ مال ہے، یہ بھی مکروہ

تحریمی ہے۔ (کذافی الوقائع)

اسی طرح حیلہ کی ایک صورت اور نکالی ہے، وہ یہ کہ مثلاً زید نے عمرو سے دس روپے قرض مانگے، عمرو نے کہا کہ قرض تونہیں دیتا مگر ہاں دس روپے کا مال بارہ روپے میں لے جاؤ اور کسی کے ہاتھ فروخت کر کے اپنا کام چلالو، اور جب تمہارے پاس وہ بارہ روپے ہو اس سامان کی قیمت ادا کردینا، یہ بھی مکروہ تحریمی ہے۔ سودخوروں نے یہ صورت اختیار کی ہے۔

امام محمد علیہ الرحمہ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ایسی بیع پہاڑ کے برابر گراں معلوم ہوتی ہے، اور حدیث شریف میں بھی اس کی مذمت آئی ہے، اور پیشین گوئی فرمائی گئی ہے کہ جب تم ایسا کروگے ذلیل وخوار ہوگے اور غیر قومیں تم پر غالب آجائیں گی۔ (۱)

فتاوی رحیمیہ میں لکھا ہے:

ایک آدمی کے پاس سودی رقم ہے وہ زکوۃ کے حقدار کو یہ رقم بطور ہدیہ (بخشش) دیتا ہے، اس شرط سے کہ تو اس میں سے تھوڑی رقم بطور بخشش مجھے دیدے، اب اس غریب نے وہ رقم بلانیت ثواب قبول کر کے اصل مالک کو بخش دیدی جس سے اس مالک کا مقصد رقم کو اپنے استعمال میں لانا ہے تو اس طرح سود کی رقم کو حلال کرنے کے لیے حیلہ کیا جاتا ہے) یاد رکھنا چاہیے کہ سودی رقم میں حیلہ صحیح نہیں ہے (اس سے اپنے آپ کو بچائیے)۔ (۲)

سلف صالحین کے واقعات

حرام مال سے باطن کا جو نقصان ہوتا ہے اس کو اہلِ بصیرت خوب جانتے ہیں۔ محمد زید صاحب مظاہری فرماتے ہیں کہ عبدالرحمن خان صاحب نے مولانا ابوالحسن لکھنوی علیہ الرحمہ

---

(۱) صفائی معاملات ص: ۱۶، سود، رشوجوا، قرض کے شرعی احکام ص: ۲۳، ۲۴

(۲) مستفاد از فتاوی رحیمیہ: ۵/۲۷۵

کی مجھ سے حکایت بیان کی تھی کہ ایک مرتبہ ان پر اور ان کے خادموں اور متعلقین پر کئی روز کا فاقہ ہوا، پھر ایک دن ایک شخص نے آپ کے لیے بہت عمدہ بریانی لایا آپ کو کشف ہوا کہ یہ بریانی حرام مال سے تیار ہوئی ہے آپ نے خادم کو حکم دیا کہ اس کو کوئی نہ کھائے بلکہ اس کو زمین میں دفن کر دیا جائے، بعض مریدوں کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شیخ کے دماغ میں کثرت سے خشکی پیدا ہوگئی ہے بھلا کئی روز کے فاقہ کے بعد تو خدا نے رزق دیا ہے آپ نے اس کو دفن کرا دیا، مولانا کو اس خیال کا بھی کشف ہوگیا تو حکم دیا کہ اچھا اس بریانی کو کھود کر دیکھو، دیکھا گیا تو برتن کیڑوں سے بھرا ہوا تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے اس کو اس لیے دفن کرایا تھا کہ تمہارے پیٹ میں جا کر اس بریانی سے بلائیں (مصیبتیں اور ظلمت) پیدا ہو جاتی اور تم کو تکلیف ہوتی۔

ایک حکایت حرام کھانے کی مولانا محمد یعقوب صاحب نے خود اپنی بیان کی کہ ایک رئیس کے یہاں سے لڈو آئے تھے اس میں سے ایک میں نے کھالیا (جو مشتبہ اور ناجائز آمدنی کے ہوں گے) تو ایک مہینہ تک دل کی یہ حالت تھی کہ یوں وسوسہ آتا تھا کہ نعوذ باللہ کوئی حسین عورت ہو تو اس سے متمتع ہوں، فرماتے تھے کہ خدا خدا کر کے ایک مہینہ کے بعد اس کا اثر زائل ہوا، اور میں سخت پریشان رہا، اگر حرام سے خود نہ بچو تو دوسروں کو مت کھلاؤ، خصوصاً ایسے مال سے قربانی ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

حرام کھانے سے ظلمت پیدا ہوتی ہے اور بعض اللہ والوں کو پتا بھی چل جاتا ہے اور ان کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے حتیٰ کہ کبھی قے بھی ہو جاتی ہے جیسے مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کاندھلوی کی مشہور کرامت تھی کہ مولانا کو مشتبہ کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا، اسی وقت قئے ہو جاتی تھی ورنہ ظلمت کی پریشانی تو ضرور ہوتی ہے۔

ایک بزرگ کا لڑکا بہت شریر تھا کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ یہ اس رات کا نطفہ ہے جس رات میں بادشاہ کے باورچی نے میری دعوت کی تھی اور شاہی باورچی خانے کا کھانا کھلایا تھا اور یہ اس کا نتیجہ ہے، غرض اس کی ظلمت بڑی سخت ہوتی ہے اس

لیے اپنے بچوں کو بھی حرام سے بچانا چاہئے۔(۱)

چند شبہات واعتراضات

صفحات بالا میں ربا اور سود کے بارے میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے بعد یہ گنجائش معلوم نہیں ہوتی کہ کسی مسلمان اور خاص طور پر کسی صحیح الفہم اور سلیم الطبع مسلمان کے ذہن میں کچھ شبہات واعتراضات پیدا ہوں اور وہ اس بارے میں تردد کرے کہ کیا واقعتاً شریعت نے ربا کی رائج الوقت صورتوں کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ ان شبہات کی وجہ سے (جو افسوس ہے کہ بار بار اور طرح طرح سے دہرائے جارہے ہیں) کچھ حلقوں میں واقعتاً غلط فہمیاں پائی جارہی ہوں اس لیے ذیل میں ان شبہات کا جواب بھی بیان کیا جارہا ہے۔

(۱) قرآن پاک میں ربا کی تعریف کا نہ ہونا

ایک بات جو بار بار کئی حلقوں کی طرف سے دہرائی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے ربا کی کوئی تعریف نہیں کی اور اس اہم چیز کو حرام قرار دینے کے باوجود غیر مبین (Undefined) چھوڑ دیا ہے، اس کے معنی ان حلقوں کے نزدیک یہ ہیں کہ قرآنِ پاک ربا کی کوئی متعین اور طے شدہ تعریف نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے یہ گنجائش باقی رہنے دی کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے زمانہ اور حالات کی رعایت کرتے ہوئے ربا کی ازسرِ نو تعریف کرسکیں، اس تمہید کے بعد یہ حلقے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بینک انٹرسٹ کو ربا قرار دینا یا نہ قرار دینا ہماری اپنی صوابدید پر مبنی ہے اور ہمارے حالات اور مصالح کا تقاضا ہے کہ بینک انٹرسٹ کو ربا نہ سمجھا جائے اور قرآنی ربا کو صرف روایتی مہاجنی سود تک محدود رکھا جائے۔

اس پوری دلیل میں اصل کانٹے کی یہ بات ہے کہ قرآن پاک نے ربا کی تعریف نہیں کی، قبل اس کے کہ اس بات کا جواب دیا جائے یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ قرآن

---

(۱) احکام المال ص: ۲۸، ۳۰

پاک نے کسی چیز کی بھی فقہی، قانونی یا فنی انداز کی تعریف نہیں کی، قرآن پاک نے بار بار اقامت صلوۃ کا حکم دیا لیکن کہیں بھی صلوۃ کی تعریف بیان نہیں کی، زکوۃ ادا کرنے کی تاکید کی لیکن کہیں بھی زکوۃ کی فقہی تعریف نہیں کی، زنا کو جرم قبیح قرار دیا لیکن کہیں بھی زنا کی قانونی تعریف نہیں کی، بیع کو جائز ٹھہرایا لیکن کہیں بھی بیع کی فنی تعریف سے تعرض نہیں کیا، مذکورہ بالا استدلال کی بنیاد پر کیا یہ کہا جائے کہ قرآن پاک میں صلوۃ، زکوۃ، زنا، بیع اور اس جیسی بہت سی اصطلاحات کا متعین اور طے شدہ مفہوم نہیں ہے اور ہر زمانہ اور علاقہ میں ان کا نیا مفہوم متعین کرلیا جائے گا، ظاہر ہے کہ یہ بات بالبداہت غلط ہے اسی طرح یہ بات بھی بالبداہت غلط ہے کہ چوں کہ قرآن پاک نے کہیں بھی کمپنیز آرڈیننس کے انگریزی اسلوب کے مطابق ربا کو (Define) نہیں کیا اس لیے ربا کا قرآن کی نظر میں کوئی طے شدہ مفہوم نہیں ہے بلکہ اس نے محض ایک مبہم، غیر متعین اور غیر واضح عمل کے ارتکاب پر بلاوجہ ہی اعلانِ جنگ سنا دیا ہے۔

دراصل یہ ہے کہ قرآن پاک کا اسلوب ایک عام فنی کتاب کی پیشہ ورانہ اصطلاحی زبان سے بہت مختلف ہے، وہ نہ علم کی فنی زبان میں ہے اور نہ کسی اور علم کی اصطلاحی زبان وہ اختیار کرتا ہے، مسائل کے بارے میں راہنمائی فراہم کرنے کا اس کا ایک منفرد اسلوب ہے، وہ طرح طرح سے جزوی مثالیں دے کر اخلاقی اصولوں کا حوالہ دے کر پچھلے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کر کے، سابقہ منحرفین کے انجام یاد دلا کر ایک چیز کو ذہن نشین کراتا ہے اور پھر اس کی عملی شکل میں انفرادی طور پر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اور اجتماعی طور پر جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمومی طرز عمل کے ذریعہ ہمارے سامنے آتی ہے، کسی ایک آیت یا ایک حدیث کو لے کر بقیہ تمام نصوص وسنن سے صرف نظر کرلینا صحیح طرز اجتہاد نہیں ہے۔

جوں ہی ہم ان تینوں مصادر میں موجود احکام کو سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں ہمارے سامنے فوراً ربا کا ایک واضح تصور آجاتا ہے، جس کے بنیادی عناصر پر پوری امت کا

اتفاق ہے، یعنی کسی بھی واجب الاداء رقم میں صرف اس لیے اضافہ کہ ادا کرنے والا مزید مہلت کا خواہاں ہے ربا کہلاتا ہے، یعنی وہ اضافہ جس کے بالمقابل نہ محنت ہو، نہ کوئی مال ہو، نہ کوئی خطرہ (رسک) ہو اور نہ کوئی فنی مہارت ہو جو محنت ہی کی ایک شکل ہے ربا قرار دیا جائے گا، یہاں ہم نے واجب الاداء رقم کی اصطلاح استعمال کی ہے جو عربی لفظ دین کا ترجمہ ہے جو انگریزی اصطلاح میں (Debt) کا مترادف ہے، اس میں نقد رقم (مثلاً کرنسی، زر، سونا چاندی وغیرہ) بھی شامل ہے اور تمام مثلی چیزیں بھی شامل ہیں جو بارٹر لین دین میں بطور ثمن استعمال ہوتی رہی ہیں، مثلی سے مراد فقہ اسلامی کی اصطلاح میں وہ اشیاء ہیں جن کے افراد (یونٹوں) کے مابین اتنی گہری مماثلت پائی جاتی ہو کہ بازار میں پائے جانے والے تمام افراد (یونٹوں) کے سائز، مالیت اور بازاری قیمت میں کوئی خاص قابل ذکر فرق نہ پایا جاتا ہو اور ایک یونٹ کی جگہ دوسرا یونٹ عام طور پر لین دین میں چل جاتا ہو، اسی طرح کی مثلی چیزوں میں بھی اگر لین دین میں کمی بیشی ہوگی تو اس کو ربا قرار دیا جائے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بہت سی چیزوں میں کمی بیشی اور ادھار کو ربا قرار دیا ہے، چنانچہ ایک بہت مشہور روایت میں سونا، چاندی، گندم، جو، نمک اور کھجوروں کے آپس میں لین دین میں کمی بیشی اور ادھار کو آپ نے ربا قرار دے کر منع فرما دیا ہے۔

(۲) حرمت ربا کا اضعافاً مضاعفہ تک محدود ہونا

بعض حضرات ربا سے متعلق تمام دیگر آیات واحادیث کے ذخیرہ سے صرف نظر کر کے صرف اس ایک آیت پر تصور ربا کی بنیاد اٹھاتے ہیں جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اے ایمان والو! سود در سود (اضعافاً مضاعفة) مت کھاؤ، اس کا مفہوم وہ یہ نکالتے ہیں کہ مرکب سود یا کمپاؤنڈ انٹرسٹ تو حرام ہے لیکن مفرد، عام یا سادہ یعنی سمپل انٹرسٹ حرام نہیں ہے، اگرچہ قرآن وسنت کی دیگر نصوص کے پیش نظر اس مفہوم کی گنجائش نہیں ہے اور سود چاہے وہ مرکب ہو یا مفرد بہر صورت حرام ہے اس لیے کہ جو خرابیاں اضعافاً

مضاعفہ میں پائی جاتی ہیں وہ مفرد سود میں بھی پائی جاتی ہیں (صرف ڈگری اور درجہ کا فرق ہے) لیکن اس شبہ کا جواب دینا بھی ضروری ہے اس لیے مختصر طور پر درج ذیل گزارشات پیش خدمت ہیں۔

قرآن پاک ایک معروف اسلوب ہے کہ وہ بعض اوقات کسی جرم کی شناعت اور قباحت کو نمایاں کرنے کے لیے ایسی قیود بھی بیان کرتا ہے جو جرم کا لازمی عنصر نہیں ہوتیں، ان کا مقصد صرف قاری کے ذہن میں اس کی کراہیت کا پختہ تصور پیدا کرنا ہوتا ہے، مثال کے طور پر ارشاد فرمایا گیا کہ لَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ(۱) ''فقر و فاقہ کے خوف سے اولاد کو قتل نہ کرو'' اس کے یہ معنی نہیں ہیں اور نہ کوئی عاقل وفہیم شخص اس کا مفہوم لے سکتا ہے کہ کسی اور وجہ سے اولاد کو بے شک قتل کرو لیکن فقر و فاقہ کے خوف سے نہ کرو، ظاہر ہے کہ یہاں فقر و فاقہ کے خوف کا ذکر عربوں کی اس مکروہ رسم کی کراہیت کو ذہن نشین کرانے کے لیے کیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور بہانہ یہ بتاتے تھے کہ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں، ان پر کیوں پیسہ برباد کیا جائے اور کیوں ان کی پرورش کی جائے۔

یہ اسلوب قرآن پاک ہی کا نہیں، حدیث پاک کا بھی ہے، چنانچہ ایک جگہ کبائر کے ذکر میں فرمایا گیا: أَنْ تُزَانِيَ حَلِيلَةَ جَارِكَ (۲) ''یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو'' ظاہر ہے کہ اس کا یہ مفہوم کوئی عاقل انسان نہیں لے سکتا کہ محلہ دار کی بیوی سے بدکاری تو گناہ کبیرہ ہے لیکن دوسرے محلہ کی کسی شخص کی بیوی سے بدکاری گناہ کبیرہ نہیں، یہاں پڑوسی کی بیوی کا لفظ صرف غیرت دلانے اور جرم کی شناعت کی طرف توجہ دلانے کی خاطر استعمال کیا گیا ہے۔

---

(۱) الاسراء:۳۱

(۲) صحيح البخاري، كتاب التفسير، سورة البقرة، باب: قوله تعالى: فلا تجعلوا الله أندادًا وأنتم تعلمون، حدیث نمبر: ۴۴۷۷

قرآن وحدیث کے علاوہ یہ اسلوب عام بول چال میں بھی استعمال ہوتا ہے، آپ ننھے بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا بڑی بہن کو نہیں مارتے، یا مسجد میں چوری نہیں کرتے یا اسکول میں شرارت نہیں کرتے تو اس کا یہ مفہوم کوئی ننھا بچہ بھی نہیں لیتا کہ بڑی بہن کو تو مارنا برا ہے لیکن دوسری لڑکیوں کو مارنا درست ہے، مسجد میں چوری کرنا برا ہے اور باہر چوری کرنا اچھا ہے یا اسکول میں شرارت کرنا بری بات اور باہر شرارت کرنا اچھی بات ہے۔

اسی اسلوب کے تحت قرآن پاک نے یہاں دوگنا چوگنے سود کی حرمت بیان کرکے اس کے ایک پہلو کی شناعت کی طرف توجہ دلائی ہے، لہذا یہ قید احترازی نہیں اتفاقی ہے۔

(۳) کرایہ مکانات پر قیاس

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ کچھ حضرات بار بار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مکانات اور دوسری جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ کا کرایہ وصول کرنا جائز ہے تو آخر سرمایہ کا کرایہ کیوں وصول نہیں کیا جاسکتا، یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سود کا اصل مفہوم اور علت حرمت نہیں سمجھتے، سود کا اصل مفہوم جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا یہ ہے کہ کسی واجب الاداء رقم میں کسی معاوضہ (محنت، مال، خطرہ) کے بغیر محض وقت اور مہلت کے مقابلہ میں کسی مشروط اضافہ کا مطالبہ کیا جائے، ظاہر ہے کہ کرایہ مکان پر یہ تعریف صادق نہیں آتی کرایہ مکان تو معاوضہ ہے اس منفعت کا جو ایک شخص مکان سے اٹھاتا ہے اور پھر مکان جوں کا توں اس کو واپس کردیتا ہے، مکان، جائیداد وغیرہ استعمالی اشیاء ہیں جن میں ربا نہیں ہوتا، اس کے برعکس سونا، چاندی، روپیہ، گندم، نمک، جو، استہلالی اشیاء ہیں جن کو خرچ کیے بغیر ان سے مستفید نہیں ہوا جاسکتا، لہذا ان میں ربا ہوتا ہے، پھر مکانات اور جائیدادیں قیمتی ہوتی ہیں جن میں ربا نہیں ہوا کرتا اور روپیہ، سونا، چاندی مثلی ہوتے ہیں جن میں ربا ہوتا ہے۔

مزید برآں حدیث مبارکہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

نَھَی رَسُولُ اللهِ... عَنْ رِبْحِ مَالَمْ یَضْمَنْ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر اس چیز کے منافع حاصل کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا خطرہ انگیز نہ کیا گیا ہو۔

اس اصول کی روشنی میں کرایہ پر مکان دینے والا شخص مکان کو پہنچ سکنے والا ہر خطرہ انگیز کرتا ہے اس لیے وہ اس سے حاصل ہونے والے منافع اور فوائد کا حقدار ہے، لیکن روپیہ قرض دینے والا شخص اس رقم پر کوئی خطرہ انگیز نہیں کرتا بلکہ وہ محفوظ ہوتی ہے اور مقروض کو لازماً ادا کرنی ہوتی ہے، اس لیے قرض خواہ اس پر کوئی نفع لینے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔

(۴) صرفی اور تجارتی سود

بعض حضرات بڑے شدومد سے یہ بحث اٹھاتے ہیں کہ اسلام نے جس سود کو حرام قرار دیا ہے وہ صرفی اور ذاتی مقاصد کے لیے لیے جانے والے قرضوں پر عائد کیا جانے والا سود ہے، اس لیے کہ اس دور میں یہی سود عرب میں رائج تھا اور سود کی اسی قسم سے قرآن پاک کے اولین مخاطبین مانوس تھے، رہا تجارتی اغراض کے لیے حاصل کیے جانے والے قرضوں پر سود تو چوں کہ اس میں سب سے زیادہ ظلم واستحصال نہیں ہے اس لیے وہ جائز ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ جن حضرات نے حلت سود کا یہ جواز تلاش کیا ہے ان کو اس کی تائید میں تاریخ، سیرت، فقہ، حدیث اور قرآن سے کوئی شہادت نہیں ملی، ان کی بنیاد صرف ان کے اپنے بلا دلیل دعاوی پر ہے چنانچہ:

☆ صرفی اور تجارتی قرضوں کے درمیان فرق کی کوئی تعلیل موجود نہیں ہے۔

☆ ''صدر اسلام میں صرف صرفی قرضوں پر سود رائج تھا'' اس بیان کی تائید میں تاریخ کی کوئی شہادت نہیں ہے۔

---

(۱) سنن سنائي، كتاب البيوع، شرطان في بيع...، حديث نمبر:۴۶۳۱

☆ ''تجارتی قرضوں پر سود سے عرب نا مانوس تھے'' یہ ایک بے دلیل بات ہے۔

☆ ''تجارتی قرضوں پر سود میں ظلم واستحصال نہیں ہے'' یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجارتی اور صرفی قرضوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا اور ہر صورت میں صرف اصل رقوم ''رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ'' کی وصولیابی کی اجازت دی ہے۔''رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ'' کی صراحت سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم سود کے تمام ممکنہ شکلوں پر حاوی ہے، بلکہ اس کا اطلاق تجارتی سود پر زیادہ ہوتا ہے اس لیے کہ راس المال کی اصطلاح تجارت اور کاروبار کے سیاق وسباق میں استعمال ہوتی ہے، شخصی ادھار اور ذاتی قرضوں میں سرمایہ اور راس المال وغیرہ اصطلاحات عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔

مزید براں احادیث میں صراحت موجود ہے کہ اس دور میں نہ صرف تجارتی اغراض کے لیے قرض لیے جاتے تھے بلکہ ان پر سود بھی لینے اور دینے کا رواج تھا، جیسا کہ اس موضوع پر موجود احادیث اور تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے پھر علاوہ احادیث اور تاریخ کی صراحت کے، جو شخص عرب جاہلیہ کی تاریخ اور مزاج سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے اس کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیے کہ عرب میں صرفی قرضوں پر سود وصول کرنے کا کوئی رواج ہی نہیں تھا، عربوں کا جذبہ مہمان نوازی، غریب پروری اور جود وسخاء پہلے بھی ضرب المثل تھا اور آج بھی ضرب المثل ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ اقدار ان میں نہ صرف موجود تھیں بلکہ ایک عام عرب ان پر عمل کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، چور اور ڈاکو''لصوص'' تک ان اقدار کا فخریہ ذکر کرتے تھے، جیسا کہ کلام عرب سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ سے مخفی نہیں ہے، ان حالات میں صرفی قرضوں پر سود کی وصولیابی کی مثالیں شاذ ونادر ہی ہو سکتی ہیں۔

البتہ تجارتی اغراض کے لیے قرضے لینے اور دینے کا عرب میں عام رواج تھا اور اس پر سود بھی لیا اور دیا جاتا تھا اور قرآن پاک نے اس سود کی ممانعت کی ہے، حضرت

عباس ﷛ کا سود جس کو سرکار دو عالم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ختم کیا کسی طرح بھی صرفی قرضوں پر عائد سود نہیں ہو سکتا تھا، ان جیسا دولت مند رئیس جو اپنی جیب خاص سے پورے موسم حج میں حجاج کے پانی کا بندوبست کرتا ہو، جس کو سرکار دو عالم ﷺ نے قریش کا سخی ترین سردار قرار دیا ہو وہ بھلا صرفی اغراض کے لیے قرضہ کیوں لے گا حضرت عباس ﷛ عرب کے نامور تاجروں میں سے تھے اور دوسرے تاجروں کو تجارت کے لیے قرض بھی دیا کرتے تھے جو سودی اور غیر سودی دونوں طرح کے ہوتے تھے، ان جیسے سخی انسان کے لیے یہ بات بعید از امکان ہے کہ وہ ضرورت مند اور محتاج لوگوں کو سود پر صرفی قرض دیتے ہوں۔

جہاں تک اس دلچسپ دعوے کا تعلق ہے کہ تجارتی قرضوں پر لیے جانے والے سود میں ظلم اور استحصال نہیں ہوتا تو اس کے جواب میں یہی گزارش کی جاتی ہے کہ صرفی قرضے والے سود کی برائی دو افراد تک محدود رہتی ہے، جبکہ تجارتی قرضوں پر لیے جانے والے سود کی قباحتیں اور مفاسد پورے معاشرہ کو گھن لگا دیتے ہیں، ان صفحات میں سود کی جو قباحتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے آخر کونسی قباحت ہے جو صرف صرفی قرضہ میں ہوتی ہے اور تجارتی قرضہ میں نہیں ہوتی؟(۱)

ربا اور سود میں فرق

قرآن کریم میں جس چیز کو لفظ ''ربا'' کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے اس کا ترجمہ اردو میں عام طور پر ''سود'' کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے عموماً لوگ غلط فہمی میں مبتلاء ہیں کہ ربا اور مروجہ سود، دونوں عربی اور اردو میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یعنی جس چیز کو عربی میں ربا کہتے ہیں اسی کو اردو میں سود کہا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ربا ایک عام اور وسیع مفہوم کا حامل ہے، جبکہ مروجہ سود ربا کی ایک قسم یا اس کی ایک شاخ ہے۔ کیوں کہ مروجہ سود کے معنی ہیں روپیہ کی ایک متعین مقدار، ایک متعین میعاد کے لیے قرض دے کر

---

(۱) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام: ۴۱، ۵۰

متعین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینا۔ بلاشبہ یہ بھی ربا کی تعریف میں داخل ہے مگر صرف اسی ایک صورت یعنی قرض وادھار پر نفع وزیادتی لینے کا نام ربا نہیں ہے بلکہ ربا کا مفہوم اس سے بھی وسیع ہے کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں ربا کے مفہوم کو وسعت دے کر لین دین اور خرید وفروخت کے معاملات کی بعض ایسی صورتیں بھی بیان فرمائی ہیں جن میں چیزوں کے باہم لین دین یا ان کی باہمی خرید وفروخت میں کمی بیشی کرنا بھی ربا ہے اوران میں ادھار لین دین کرنا بھی ربا ہے اگر چہ اس ادھار میں اصل مقدار پر کوئی زیادتی نہ ہو بلکہ برابر سرابر لیا دیا جائے۔(۱)

لیکن آج اردو زبان عرف ومعاشرہ میں سود کے مفہوم کو وسیع قرار دیتے ہوئے ربا کی تمام شکلوں کو اس میں شامل مانا جارہا ہے، تب ہی تو مقروض سے کسی بھی قسم کے فائدہ اٹھانے کو، ادھار پر نفع لینے کو، ربا الفضل کی تمام شکلوں کو ناجائز مروجہ چٹھیوں اور رہن کی شکلوں کو بھی سود کا نام دے کر حرام کا حکم لگایا جاتا ہے۔

ربا اور بیع میں فرق

بیع یہ ہے کہ بیچنے والا ایک چیز کو فروخت کرنے کے لیے پیش کرتا ہے، خریدنے والے اور بیچنے والے کے درمیان اس چیز کی ایک قیمت طے پاتی ہے اور اس قیمت کے بدلہ میں خریدنے والا اس چیز کو لے لیتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ربا یہ ہے کہ ایک شخص اپنا رأس المال ایک دوسرے شخص کو قرض دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ اتنی مدت میں اتنی رقم تجھ سے رأس المال پر زائد لوں گا اسی زائد رقم کا نام سود ہے جو کسی چیز کا عوض نہیں بلکہ محض مہلت کا عوض ہوتا ہے۔

بیع اور ربا کے معاملوں میں غور کرنے پر درج ذیل فرق معلوم ہوگا:

۱) بیع میں خریدنے اور بیچنے والے کے درمیان منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ ہوتا

---

(۱) مظاہر حق جدید: ۳/ ۶۳

ہے کیوں کہ خریدنے والا اس چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس نے بیچنے والے سے خریدی ہے، اور بیچنے والا اپنی محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے جس کو اس نے خریدنے والے کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے۔

اس کے مقابلے میں سودی لین دین میں منافع کا برابری کے ساتھ تبادلہ نہیں ہوتا سود لینے والا تو مال کی ایک مقررہ مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے یقینی طور پر نفع بخش ہے لیکن سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا غیر یقینی ہے، کیوں کہ قرض دار نے اگر اپنی شخصی ضرورت کے لیے قرض لیا ہے تب تو مہلت یقینا نقصان دہ ہے اور اگر اس نے یہ قرض تجارت کی غرض سے لیا ہے تو مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے، لیکن قرض خواہ بہر حال اس سے نفع کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے، خواہ قرض دار کو اپنے کاروبار میں فائدہ ہو یا نقصان۔

معلوم ہوا کہ سود کا معاملہ تو ایک فریق کے فائدہ اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے یا ایک کے یقینی اور متعین فائدہ اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدہ پر۔

۲) خرید وفروخت کے معاملہ میں بیچنے والا خریدنے والے سے خواہ کتنا ہی زیادہ نفع لے، بہر حال وہ صرف ایک مرتبہ لیتا ہے، جبکہ سود کے معاملہ میں روپیہ دینے والا مسلسل اپنے روپے پر نفع وصول کرتا رہتا ہے، اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا نفع بڑھتا چلا جاتا ہے، قرض دار نے اس کے روپے سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو بہر حال اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا، مگر اس کے معاوضہ میں روپیہ دینے والا جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی۔

۳) خرید وفروخت میں چیز اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد خریدنے والے کو کوئی چیز بیچنے والے کو واپس نہیں دینی پڑتی لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار روپیہ لے کر خرچ کر چکا ہوتا ہے اور پھر

اس کو وہ خرچ کیا ہوا روپیہ دوبارہ حاصل کر کے سود کے اضافہ کے ساتھ واپس دینی پڑتی ہے۔

۴) خرید وفروخت میں انسان اپنی محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لیتا ہے مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت ومشقت کے دوسروں کی کمائی میں حصہ دار بن جاتا ہے۔(۱)

۵) سود میں طئے شدہ شرح کے مطابق نفع یقینی ہوتا ہے جبکہ تجارت میں نفع کے ساتھ نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے۔

۶) کاروبار میں لگا ہوا پیسہ ڈوب بھی سکتا ہے جبکہ سودی معاملہ میں اصل سرمایہ محفوظ رہتا ہے، نقصان ہونے یا سرمایہ ڈوب جانے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ لہذا تجارت کے منافع بالکل الگ چیز ہے اور سود بالکل الگ چیز، اس میں قرض لینے والے قرض دینے والے کے ذریعہ بہرحال استحصال ہوتا ہے، اسی وجہ سے اللہ نے سود اور تجارت کے منافع میں فرق کر کے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

۷) بیع اور ربا میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ بیع میں لیا جانے والا روپیہ کسی مال کا معاوضہ ہوتا ہے، لیکن ربا میں سود خور جو زائد دولت وصول کرتا ہے وہ کسی مال کا معاوضہ نہیں ہوتا۔

۸) بیع اور ربا میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ بیع وخرید وفروخت تجارت کو فروغ دیتے ہیں جس سے دولت پھیلتی ہے لیکن ربا میں دولت سمٹتی چلی جاتی ہے اور سود خور دولت مند سے دولت مند ہوتا چلا جاتا ہے۔

۹) ایک فرق یہ بھی ہے کہ بیع میں ہر شخص اپنے قبضہ میں موجود مال کے نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن ربا میں سود خور صرف نفع کا حقدار ہوتا ہے اور نقصان کی ذمہ داری مقروض پر ڈال دیتا ہے۔

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۲۴

۱۰) بیع میں نفع کی جو بھی شرح ہو وہ ایک بار وصول ہو جانے کے بعد بائع کے مطالبات ختم ہو جاتے ہیں، لیکن سود خور کے مطالبات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے منافع اور وصولیابی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔(۱)

ربا اور شراکت میں فرق

۱) شراکت میں سرمایہ لگانے والا معاشرہ کے پیداواری عمل میں خود براہ راست شریک ہوتا ہے جبکہ سود خور سرمایہ کی سرکولیشن روک کر صرف سود وصول کرنے سے دلچسپی رکھتا ہے، اس کو پیداواری عمل سے دلچسپی نہیں ہوتی۔

۲) شراکت میں سرمایہ لگانے والا نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے لیکن سود خور صرف اپنے نفع سے دلچسپی رکھتا ہے اور وہ اس کو مع اصل زر وصول کر کے چھوڑتا ہے، اس کو نقصان کی ذرہ برابر فکر نہیں ہوتی۔

۳) شراکت میں سرمایہ لگانے والا دوسروں کی مشکلات میں کام آتا ہے جبکہ سود خور مشکلات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۴) شراکت میں سرمایہ لگانے والا پیداواری کام میں شرکت کے لیے ہمہ وقت آمادہ اور تیار رہتا ہے لیکن سود خور اس عمل سے باہر رہتا ہے۔

۵) شراکت میں سرمایہ لگانے والا یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کی بچتوں میں معاشرہ کا بھی حق ہے لیکن سود خوار سرمایہ دار ایسا کوئی حق تسلیم نہیں کرتا۔

۶) شراکت میں سرمایہ لگانے والا کسی کے خلاف اپنے کسی غیر مشروط، مطلق اور مستقل حق کا مدعی نہیں ہوتا جبکہ سود خور پورے معاشرہ کے خلاف اپنا حق جتاتا ہے اور چاہے سارا معاشرہ افلاس اور بھوک کا شکار ہو جائے اور ساری کاروباری دنیا کساد بازاری کا شکار ہو اس کو اپنے اصل اور سود کی وصولیابی سے دلچسپی ہوتی ہے۔

---

(۲) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام: ۱۵

۷) شراکت میں سرمایہ لگانے والا تبادلہ زر کی تجارتی اور اقتصادی اہمیت کو سمجھتا اور تسلیم کرتا ہے لیکن سود خور کو اس کی سرے سے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

۸) شراکت سے پیداوار کے عمل کو مدد ملتی ہے، سود خور پیداوار کے معاملہ میں لاتعلق رہتا ہے۔

۹) شراکت دار دولت کے باب میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے جبکہ سود خور اس طرح کی ہر ذمہ داری سے لاتعلق رہتا ہے۔

۱۰) شراکت دار جائز اور کھلے طریقے اپناتا ہے اور اس کو جوا، قمار، سٹہ اور دوسرے استحصالی، غیر اخلاقی اور غیر قانونی طریقوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، جبکہ سود خور کو کمانے اور وصول کرنے سے غرض ہوتی ہے، اس کو جائز اور ناجائز کی پرواہ نہیں ہوتی۔

۱۱) شراکت دار کو وقت کی کمی بیشی کی بنیاد پر کوئی مفاد یا نفع نہیں ملتا، لیکن سود کا سارا دارومدار وقت اور مہلت کی کمی بیشی پر ہے۔

۱۲) شراکت دار اگر یہ محسوس کرے کہ اس کا شریک مشکل اور تنگی کا شکار ہے تو وہ مہلت دے دیتا ہے لیکن سود خور ایسی کوئی مہلت نہیں دیتا۔(۱)

ربا اور اجرت میں فرق

سود لغت میں زیادتی کو اور اضافہ کو کہتے ہیں، اور اجرت لغت میں خدمت کے مقابلہ میں عوض یا بدلہ کو کہتے ہیں اور اجارہ اس متعین منفعت کی قیمت کو کہتے ہیں جس پر طرفین آپس میں اتفاق کر لیتے ہیں، معلوم ہوا کہ اجرت اور منفعت کے مابین گہرا تعلق ہے۔

۱) اجرت اور سودی قرض میں فرق یہ ہے کہ اجرت میں دائن اور مدیون کا کوئی علاقہ وتعلق نہیں ہوتا، بلکہ اس میں مزدور اور مزدوری کرانے کا علاقہ ہوتا ہے اور اجرت اور تجارتی سود میں فرق یہ ہے کہ اس میں دو اموال کے درمیان تبادلہ نہیں ہوتا،

---

(۱) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام: ۳۹، ۴۰

بلکہ اس میں مال یعنی مزدوری اور عمل یعنی منفعت کا معاوضہ ہوتا ہے۔

۲) کسی چیز سے فائدہ اٹھانے اور اس پر اجرت دینے کے لیے شرط یہ ہے کہ اس چیز سے فائدہ اٹھانے کا امکان اس طرح سے ہو کہ اس کا عین ضائع نہ ہوتا ہو۔ مثلاً روشنی کے لیے موم بتی کو کرایہ پر دینا اور اس کی اجرت لینا جائز و درست نہیں ہے اور قرض میں روپے کا عین باقی نہیں رہتا، بلکہ اس کی قیمت باقی رہتی ہے اور اس کا عین ضائع ہو جاتا ہے۔(۱)

ربا اور مضاربت میں فرق

بینک کے سود کو جائز قرار دینے کے لیے ایک عجیب وغریب منطق یہ دی جاتی ہے کہ بینک کا کاروبار شرعی مضاربت کا کاروبار ہے، یعنی بینک کھاتہ داروں سے روپیہ مضاربت کے طور پر لیتا ہے اور کھاتہ دار اس کے مالک ہیں، پھر بینک اس روپیہ کا مالک بن کر دوسروں کو روپیہ دیتا ہے اور جس کو روپیہ دیتا ہے وہ بینک کا مضارب ہے، یہ تعبیر شرعی مضاربت کے بالکل خلاف ہے، کیوں کہ مضاربت میں مضارب مال کا امانت دار ہوتا ہے، قرض دار نہیں، اور مال واپس دینے کی ضمانت صرف اس صورت میں لازم آتی ہے، جبکہ مضارب نے اس مال میں خیانت یا حفاظت میں عمداً کوتاہی و بددیانتی کا ارتکاب کیا ہو، اور جب مضاربت میں مضارب پر مال کی ضمانت کی شرط عائد کی جائے، تو مضاربت کی شرعی حیثیت باطل اور ختم ہو جاتی ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ بینک کھاتہ دار کے مال کا ضمانت دار ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بینک ایک ساتھ مال کا امانت دار اور ضمانت دار دونوں ہو؟ نیز شرعی مضاربت اس بات کا متقاضی ہے کہ فریقین نفع ونقصان دونوں میں شریک ہوں کوئی فریق دوسرے فریق کے حساب میں متعین نفع یا مخصوص مال کا یقینی حقدار نہ ہو، صاحب مال یا مضارب کی طرف سے متعین مقدار کی یقینی ضمانت حاصل کر لینا اس مضاربت کو باطل کر دیتا ہے اور اس کو حلال کے دائرہ سے

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۲۵

نکال کر حرام کے دائرہ میں داخل کر دیتا ہے، کیوں کہ اسلامی مضاربت میں ایک فریق کا روپیہ ہوتا ہے تو دوسرے فریق کی محنت رسک (Risk) سے مال بڑھتا ہے، جبکہ سودی معاملہ میں مال والے کو نفع کی متعین مقدار کی یقینی ضمانت وگارنٹی ہوتی ہے گرچہ اس نے اپنی کچھ بھی محنت صرف نہ کی ہو اور نہ رسک (Risk) لیا ہو۔

بخاری ومسلم کی روایت ہے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طرفین میں سے کسی ایک فریق کے لیے زمین کے کسی حصہ کو خاص کرنے سے منع فرمایا ہے، کیوں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہی خاص کیا ہوا حصہ آفت سے محفوظ ہو اور کبھی وہی حصہ آفت کا شکار ہو جائے جس کی وجہ سے طرفین میں سے ایک فریق کا یقینی فائدہ ہو اور دوسرے کا نقصان اور یہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ بات نہیں۔ رافع بن خدیج بیان کرتے ہیں:

كُنَّا أَكْثَرَ الأَنْصَارِ حَقْلًا، فَكُنَّا نُكْرِي الأَرْضَ، عَلَى أَنَّ لَنَا هٰذِهِ، وَلَهُمْ هٰذِهِ، فَرُبَّمَا أَخْرَجَتْهُ هٰذِهِ، وَلَمْ تُخْرِجْ هٰذِهِ، فَنَهَانَا عَنْ ذٰلِكَ (۱)

نیز نفع کی امید ہونا اس بات کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا کہ وہ معاملہ جائز بھی ہے، اس لیے کہ نفع کی امید تو کاشتکار کو مخابرہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے، اور اسی لیے تو وہ یہ معاملہ کر لیتا ہے مگر اس کے باوجود بصراحت حدیث مخابرہ، ناجائز ہے، اور اس سے باز نہ آنے والے کے ساتھ بھی اعلان جنگ فرمایا ہے: مَنْ لَّمْ يَذَرِ الْمُخَابَرَةَ فَلْيَأْذَنْ بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (۲)

ادھار بیچنے پر زیادہ رقم لینے اور سود لینے میں فرق

کسی کی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانا الگ چیز ہے اور سود الگ چیز ہے،

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۳۲، مسلم: ۲۹۳۰

(۲) عون المعبود: ۲۷۱/۲۷۲، حاکم کتاب التفسیر: ۲۸۶/۲، میں کہا ہے: یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ مستفاد از: بینک کا سود: ۸۰،۸۱

روپے کے بدلے روپیہ جب زیادہ لیا جائے گا تو یہ ''سود'' ہوگا۔لیکن چیز کے بدلے میں روپیہ زیادہ بھی لیا جاتا ہے اور کم بھی۔ زیادہ لینے کو گراں فروشی تو کہتے ہیں مگر یہ سود نہیں اسی طرح اگر نقد اور ادھار کی قیمت کا فرق ہو تو یہ بھی سود نہیں۔(۱)

مولانا یوسف لدھیانوی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''قسطوں پر گھروں میں مال سپلائی کرنا اور مقررہ وقت پر وصول کرنا جائز ہے؛ لیکن اس میں جو یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ اگر رقم وقت پر نہیں ادا کی تو یومیہ اتنے پیسے بڑھتے رہیں گے، یہ صریح ناجائز ہے اور اس کی وجہ سے پورا کا پورا کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے''(۲)

قسطوں (Finance) پر بیچنے میں اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ اگر خریدنے والے کے دھوکہ دینے کا گمان ہو اور اس سے بچنا چاہتا ہو تو مکمل رقم ادا کرنے تک کوئی چیز رہن میں رکھ لی جائے، لیکن اس بات کی ہرگز گنجائش نہیں ہے کہ وقت پر ادا نہ کرنے یا تاخیر سے ادا کرنے پر سود میں اضافہ کر دیا جائے، یا قسطیں بڑھادی جائیں اور بازار میں یہی صورت ظلم وسود کی چلتی ہے۔اس لیے یہ بیع ناجائز ہو جاتی ہے۔

قانوناً سودخوری کا آغاز کب سے ہوا؟

توریت میں یہودیوں کو تاکید کے ساتھ سود سے منع کیا گیا تھا (جیسا کہ ابھی توریت کے حوالے کے ساتھ گزرا)، لیکن سب سے پہلے یہی امت اللہ پاک کی نافرمانی کرتے ہوئے سود جیسے مہلک میں ملوث ہوئی، اس کی وجہ سے اللہ پاک نے بہت سی حلال چیزوں کو ان پر حرام کر دیا اور آخر میں انہیں سخت عذاب کا مستحق قرار دیا، ارشاد خداوندی ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ ... (۳)

---

(۱) آپ کے مسائل اور انکا حل: ۷/ ۱۰۰

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۸/ ۱۸۵

(۳) النساء: ۱۶۰

اس آیت کریمہ سے پتا چلا کہ یہودی (اللہ پاک کی نافرمانی کرکے) سودی معاملات میں بہت پہلے سے پھنسے ہوئے تھے،لیکن دوسری قوموں میں سود کے جراثیم کب پھیلے؟اور پھر قانونی طور پر سود کو جواز کا درجہ کب حاصل ہوا؟ تو اس سلسلے میں آراء مختلف ہیں:

اپّا پٹ وردھن کا کہنا ہے کہ عیسائی مذہب نے بھی سودخوری کی مذمت کی ہے، یہی سبب ہے کہ یورپ میں یہودی لوگ سودخوری کے لیے مشہور ہو گئے،(حالاں کہ) خود یہودی مذہب بھی سودخوری کی ممانعت کرتا ہے،روم کی مذہبی حکومت (ہولی رومن امپائر) نے سودخوری کی ممانعت کردی تھی،لیکن آگے چل کر جب باغی فرقے، پروٹسٹنٹ کا ظہور ہوا، اور انفرادی آزادی کو موقع ملا، تب ہی سے دوسری چیزوں کے ساتھ سودخوری کی بھی توسیع ہوئی، اس کے علاوہ بھی لوگوں کا مختلف خیال ہے؛لیکن اتنی بات تو ضرور ہے کہ سنہ ۸۹ ۷ء کے قریب یورپ میں باتفاق سود قانونی طور پر حرام تھا،قرون وسطی تک یورپ میں سود قانونی طور پر ممنوع تھا، اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب فرانس کا انقلاب آیا اس کے بعد سے ہی سود کو قانونی جواز حاصل ہو گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب ہر ایک شخص سودی کاروبار کر سکتا ہے،قانونی طور پر بھی ایسے آدمی کی مدد کی جائے گی۔(۱)

یہی انقلاب اور یہی صدی سود کے شیوع (پھیلاؤ) کی پہلی صدی ٹھہری، تب سے اب تک دنیا کے ہر کونے میں سود نے اپنے پیر جما لئے، اب عالم یہ ہے کہ سود کے بغیر لین دین کا کوئی بھی معاملہ ناقص اور نا تمام سمجھا جاتا ہے اور سود سے بچنا ناممکنات میں سے شمار کیا جانے لگا ہے؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، معاشرے کو سود کی لعنت سے بچایا جاسکتا ہے، اگر ہر آدمی چاہ لے تو سود سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں۔(۲)

ربا کی قسمیں

ربا کی اصلا (ابتداءً) دو قسمیں ہیں: (۱) ربا النسیئۃ (۲) ربا الفضل

---

(۱) الربا وآثارہ الاجتماعیۃ والسیاسیۃ والاقتصادیۃ فی مختلف الدیانات

(۲) مستفاد: مروجہ سودی معاملات نقل وعقل کی روشنی میں

ربا النسیئہ کا مفہوم اور اس کی قسمیں

ربا النسیئۃ: کا مطلب ہے دو چیزوں کے باہم لین دین یا دو چیزوں کے باہم خرید وفروخت میں ادھار کرنا خواہ اس ادھار میں اصل مال پر زیادتی لی جائے۔ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے کو ایک من گیہوں دے اور دوسرا شخص اس کے بدلہ میں اسے ایک ہی من گیہوں دے مگر ایک دو دن یا ایک دو ماہ کے بعد دے۔ یہ اس صورت کی مثال ہے کہ دو چیزوں میں باہم تبادلہ ہوا مگر یہ تبادلہ دست بدست نہیں ہوا بلکہ ایک طرف سے نقد اور دوسری طرف سے ادھار معاملہ ہوا نیز اس ادھار میں اصل مال پر کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ کمی بیشی کے ساتھ ادھار لین دین کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے کو ایک من گیہوں دے اور دوسرا شخص اس کے بدلہ میں اسے دو من گیہوں ایک دو دن میں یا ایک دو ماہ کے بعد دے۔ اس کو ربا الجاہلیۃ بھی کہا جاتا ہے۔(۱)

نوٹ: قرض دیکر بحسب شرط' متعینہ میعاد کے بعد اپنے اصل مال پر کچھ زائد مقدار لینا بھی ربا النسیئۃ میں داخل ہے۔

پھر اصل سرمایہ پر اضافہ کا مطالبہ عرب میں مختلف طریقوں سے ہوتا تھا:

۱) پہلا یہ کہ قرض دیتے وقت قرض خواہ اصل سرمایہ پر ایک اضافی رقم کا مطالبہ کیا کرتا تھا اور یہ بات قرض کے معاہدے میں واضح شرط کے طور پر کی جاتی تھی جس کو امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ (المتوفی ۲۸۰ھ) نے اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں ربا کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

وَالرِّبَا الَّذِی كَانَتْ الْعَرَبُ تعرفه وتفعله إنما كان قرض والدراهيم وَالدَّنَانِيرِ إِلَى أَجَلٍ بِزِيَادَةٍ عَلَى مِقْدَارِ مَا أُسْتُقْرِضَ عَلَى مَا يَتَرَاضَوْنَ بِهِ (۲)

---

(۱) مظاہر حق جدید: ۳/ ۶۳

(۲) أحكام القرآن للجصاص: ۲/ ۱۸۴، دار إحياء التراث العربي- بيروت

ترجمہ: اور وہ ربا جو اہل عرب کے درمیان معروف اور مستعمل تھا، اس کی صورت یہ تھی کہ وہ درہم (چاندی کے سکے) یا دینار (سونے کے سکے) کی شکل میں مخصوص مدت کے لیے اپنے اصل سرمایہ پر متعین اضافہ کی شرط کے ساتھ قرض دیا کرتا تھا۔

۲) دوسرا یہ کہ قرض خواہ مقروض سے ایک متعین ماہانہ آمدنی کا مطالبہ کیا کرتا تھا، جبکہ اصل سرمایہ مدت کے اختتام تک بحال رہتا تھا۔ جس کو امام فخر الدین الرازی علیہ الرحمۃ نے دور جاہلیت میں مروج ربا کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

أَمَّا رِبَا النَّسِيئَةِ فَهُوَ الْأَمْرُ الَّذِي كَانَ مَشْهُورًا مُتَعَارَفًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَذَلِكَ أَنَّهُمْ كَانُوا يَدْفَعُونَ الْمَالَ عَلَى أَنْ يَأْخُذُوا كُلَّ شَهْرٍ قَدْرًا مُعَيَّنًا. وَيَكُونُ رَأْسُ الْمَالِ بَاقِيًا. ثُمَّ إِذَا حَلَّ الدَّيْنُ طَالَبُوا الْمَدْيُونَ بِرَأْسِ الْمَالِ، فَإِنْ تَعَذَّرَ عَلَيْهِ الْأَدَاءُ زَادُوا فِي الْحَقِّ وَالْأَجَلِ، فَهَذَا هُوَ الرِّبَا الَّذِي كَانُوا فِي الْجَاهِلِيَّةِ يَتَعَامَلُونَ بِهِ. (۱)

ترجمہ: جہاں تک ربا النسیئہ کا تعلق ہے تو یہ دور جاہلیت کا ایک مشہور ومعروف عقد تھا اور وہ یہ کہ لوگ اس شرط کے ساتھ روپے دیا کرتے تھے کہ وہ ایک متعین رقم ماہانہ وصول کیا کریں گے، اور اصل سرمایہ ویسا ہی واجب الاداء رہے گا، پھر مدت کے اختتام پر وہ مقروض سے اصل سرمایہ کی واپسی کا مطالبہ کرتے تھے، اب اگر وہ ادا نہ کرسکا تو وہ مدت اور واجب الاداء رقم بڑھا دیتے تھے، یہ تھا وہ ربا جو جاہلیت کے زمانہ میں رائج رہا ہے۔

۳) تیسرا یہ کہ ایک شخص متعین مدت کے ادھار پر کوئی چیز فروخت کرتا ہے، جب وہ

(۱) التفسير الكبير: ۷/۷۲، دار إحياء التراث العربي-بيروت

مدت آجاتی اور خریدار قیمت کی ادائیگی نہ کرسکا تو بیچنے والا قیمت میں اضافہ کر کے خریدار کو مزید وقت کی مہلت دے دیتا تھا۔ جس کو ابن جریر علیہ السلام نے قتادہ علیہ السلام کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

عن قتادة: أن ربا أهل الجاهلية: يبيعُ الرجل البيع إلى أجل مسمًّى، فإذا حل الأجل ولم يكن عند صاحبه قضاء، زاده وأخَّر عنه.(١)

ترجمہ: جاہلیت کے زمانے کا ربا یہ تھا کہ ایک شخص متعین مدت کے ادھار پر کوئی چیز فروخت کرتا تھا، جب وہ مدت آجاتی اور خریدار قیمت کی ادئیگی نہ کرسکتا تو بیچنے والا قیمت میں اضافہ کر کے خریدار کو مزید وقت کی مہلت دے دیتا تھا۔ (٢)

خلاصہ: ان تمام معاملات میں مشترک بات یہ تھی کہ ادھار کی رقم پر ایک اضافی رقم کا مطالبہ کیا جاتا تھا، پھر بعض اوقات یہ ادھار خرید وفروخت کے عقد کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات قرضہ دینے کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اضافی رقم بعض مرتبہ ماہانہ وصول کی جاتی جبکہ اصل سرمایہ متعینہ مدت میں ادا کیا جاتا تھا، اور بعض مرتبہ یہ اضافی رقم اکٹھی اصل سرمایہ کے ساتھ وصول کی جاتی، ان تمام شکلوں کو ربا النسیئہ کہا جاتا تھا۔ (٣)

ربا الفضل کا مفہوم

ربا الفضل: قرآن کریم نے جاہلیت کے ربا کی ان تمام صورتوں کو حرام قرار دیا تھا جن کا ذکر پیچھے گزرا ہے، یہ تمام صورتیں یا تو قرض کے معاملات سے متعلق تھیں یا اس دین

---

(١) جامع البيان في تأويل القرآن لابن جرير: ٨/٦، مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ١٤٢٠

(٢) مستفاد: از سود پر تاریخی فیصلہ

(٣) سود پر تاریخی فیصلہ: ٤١/١، ٤٢

کے متعلق جو بیع کے نتیجے میں وجود میں آیا ہو، لیکن ان آیات کے نزول کے بعد حضور ﷺ نے کچھ دوسرے معاملات کو بھی حرام قرار دے دیا تھا جو پہلے ربا قرار نہ دیے جاتے تھے، حضور ﷺ نے محسوس فرمایا کہ اس زمانہ کی مروجہ تجارتی فضا میں بارٹر (اجناس کا باہم تبادلہ) کی بعض صورتیں ربا کے کاروبار میں لوگوں کو ملوث کرسکتی ہیں، اہل عرب بعض اجناس مثلاً گندم، جو، کھجور وغیرہ کو ذریعۂ تبادلہ (Medium of exchange) کے طور پر استعمال کرتے تھے، حضور ﷺ نے ان اشیاء کو پیسے کی مانند تبادلہ کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے مندرجہ ذیل احکامات جاری فرمائے۔

الذَّهَبُ بِالذَّهَبِ، وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ، وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ، وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ، وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ، وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ، مِثْلًا بِمِثْلٍ، يَدًا بِيَدٍ، فَمَنْ زَادَ، أَوِ اسْتَزَادَ، فَقَدْ أَرْبَى، الْآخِذُ وَالْمُعْطِي فِيهِ سَوَاءٌ(۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر گندم کا تبادلہ گندم سے کیا جارہا ہو تو مقدار دونوں طرف بالکل برابر ہونی چاہئے، چنانچہ اگر کسی بھی طرف زیادتی یا کمی پائی جائے، تو وہ معاملہ ربا بن جائے گا، کیوں کہ عرب کے قبائل میں یہ اشیاء بطور رقم کے استعمال کی جاتی تھیں، اور ایک کلو گندم کو ڈیڑھ کلو گندم کے بدلے فروخت کرنے کا حکم بالکل ایک درہم کو ڈیڑھ کے بدلے فروخت کرنے کی طرح تھا، تاہم اس معاملہ کو آنحضرت ﷺ نے ربا قرار دیا اور یہ ''ربا الجاہلیہ'' کی اصطلاح میں شامل نہیں تھا، بلکہ اسے ''ربا الفضل'' یا ''ربا النسیئۃ'' کا نام دیا گیا ہے۔(۲)

ربا الفضل اور ربا النسیئہ میں فرق

جب تعریف میں مزید وضاحت کی جائے گی تو ربا الفضل اور ربا النسیئہ کا فرق میں سمجھ آجائے گا؛ کیوں کہ ان کے درمیان فرق کرنے میں عموماً دشواری ہوتی ہے، مثلاً

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف وبیع الذهب بالورق نقدا، حدیث نمبر: ۱۵۸۴

(۲) سود پر تاریخی فیصلہ: ۴۷

یوں کہا جاسکتا ہے کہ ربا الفضل خاص ہے اور ربا النسیئہ عام ہے، چنانچہ ربا الفضل کا تحقق صرف پارٹنر سسٹم میں ہی ہوگا، جبکہ ربا النسیئہ کا تحقق پارٹنر میں بھی ہوسکتا ہے اور دین میں بھی ہوسکتا ہے، (دین چاہے کسی وجہ سے ہو، یعنی بیع کے ذریعہ وجود میں آیا ہو یا پھر قرض کے ذریعہ، قرض کی مثال: دس روپیہ قرض لیا اور بارہ واپس کیا (شرح کے ساتھ) بیع کی مثال: عین قرض پر مطلوب نفع بیع کے ذریعہ واجب الاداء دین بنا کر قسط وار یا یک مشت وصول کیا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کتاب چوں کہ ربا سے متعلق ہے تو قارئین کے لیے ربا کی تشفی بخش تعریف وضاحت اور فرق ضروری ہے، ورنہ نامکمل تعریف یا غیر تشفی بخش تحریر تو اور کتب میں بھی موجود ہیں۔

عموماً اجناس کے تبادلہ میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر دونوں طرف کے موجود اشیاء کی کوائیلٹی (کیفیت) میں فرق ہے تو کیا حکم میں کوئی فرق پڑے گا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ جب فرق ہو تب ہی کے لیے یہ کلام ہے ورنہ جب دونوں طرف کی کیفیت یکساں ہو تو تبادلہ چہ معنی دارد؟

ربا الفضل کی وجہ حرمت

کیوں کہ اسلام جب کسی کو حرام کرتا ہے تو اس کی طرف جانے کے جتنے راستے ممکن ہیں ان سب کو بند کردیتا ہے، بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی ابتداء جس مقام سے ہوتی ہے وہیں پر روک لگا دیتا ہے تاکہ انسان اس کے قریب بھی نہ جانے پائے، یہی سبب ہے کہ اسلام نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو سود تک پہنچائے اور سود کھانے کا وسیلہ بنے۔(۱)

یہاں تک کہ شریعت نے قرض خواہ کو قرض دار کے تحفہ کو قبول کرنے سے بھی محتاط رکھا ہے:

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے:۲۹

إذا أقرض إليه طبقا فلا يقبله أو حمله علی دابة فلا يركبها (۱)

البتہ جب اس قسم کے تحفوں کے تبادلہ کا ان دونوں کے درمیان قرضے کے معاملہ سے پہلے معمول رہا ہو (تو گنجائش ہے) إلا أن يكون بينه و بينه قبل ذلك ۔ حتی کہ شریعت نے ان تمام نفعوں کو بھی ربا قرار دیا ہے جو نفع قرض کی وجہ سے آئے تا کہ سود کا دروازہ بند ہو جائے ۔ **کل قرض جر منفعه فهو ربا**۔ یہ حدیث حارث بن ابی اسامہ سے ان کی مسند میں مذکور ہے جس کے راوی علی رضی اللہ عنہ ہے۔ (۲)

خرید و فروخت کی چند ممنوع قسمیں

سود کا مادہ ختم کرنے اور اس کا دروازہ بند کرنے کے لیے اسلام نے خرید و فروخت کے بعض معاملات کو حرام ٹھہرا دیا ہے مثلاً ''مخابرہ'' یعنی کھیت کی پیداوار میں سے اپنے لیے کچھ خاص کر لینا جیسے کسی درخت یا زمین کے بعض حصہ کو خاص کر لینا وغیرہ، اور مثلاً ''مزابنہ'' یعنی درخت میں لگی ہوئی کچی کھجور کو پکی کھجور سے بیچنا، اور مثلاً ''محاقلہ'' یعنی کھیت میں لگے ہوئے کچے اناج کو پکے ہوئے اناج سے خریدنا، وغیرہ۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: ان خرید و فروخت کے معاملے کو اور ان جیسے دیگر معاملات کو اس وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے تا کہ سود کا مادہ ختم ہو اور اس کی جڑ کٹ جائے کیوں کہ سوکھنے سے پہلے دونوں چیزوں میں ہم وزنی، مماثلت اور برابری معلوم نہیں ہے، اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے ''الجهل بالمماثلة كحقيقة المفاضلة'' یعنی دو چیزوں میں برابری، مماثلت معلوم نہ ہونا ہی سود کی حقیقت ہے۔ (۳)

ربا کے تحقق کے شرائط

ربا کے تحقق کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

---

(۱) ابن ماجہ بحوالہ مشکوۃ: ۲۴۶

(۲) السیوطی، الجامع الصغیر: ۲/ ۹۴، بحوالہ سود پر تاریخی فیصلہ: ۷۸

(۳) تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۵۸۱، بحوالہ بینک کا سود حلال ہے: ۳۲

۱) زیادتی کسی عوض کے مقابلہ میں نہ ہو۔
۲) صلبِ عقد میں کسی ایک جانب سے اس زیادتی کی شرط لگائی گئی ہو۔
۳) بیع وشراء کے اندر زیادتی اموال ربویہ کے اندر ہو۔
۴) دو ہم جنس اشیاء کا باہمی تبادلہ ہو۔
۵) بدلین معصوم ہو۔
۶) یہ دونوں کسی ایک شخص کی ملکیت میں نہ ہو۔(۱)

سود کی مختلف مثالیں

۱) کسی کو سال یا چھ ماہ کے لیے ہزار روپے قرض دیے، تو اس سے یہ شرط کرلی کہ وہ ہزار روپے کے پندرہ سو روپے لے گا، مہلت کے عوض، یہاں پانچ سو ل روپے جو زیادہ لیے گئے ہیں وہ سود ہے۔
۲) ایک من گیہوں کے عوض دو من گیہوں کا تبادلہ کرنا۔
۳) دو من گیہوں کے عوض دو من گیہوں کا ادھار معاملہ کرنا۔
۴) کسی ضرورت مند کو دس ہزار روپے دیئے، اس کے عوض اس کی زمین، مکان یا اس کی کوئی چیز گروی رکھ لی اور اس سے اس وقت تک فائدہ اٹھاتا رہے جب تک اپنے پورے روپے واپس وصول نہ کرلے۔
۵) بینک وغیرہ میں روپے بطورِ حفاظت رکھے؛ لیکن وقت بہ وقت اصل رقم کے علاوہ اضافی ملے اسی کو سود کہتے ہیں۔(۲)

سرکاری اور غیر سرکاری سود کا فرق

سود ''سود'' ہے اس میں سرکاری وغیر سرکاری بینک کا کوئی فرق نہیں ہے البتہ ایک فرق یہ ہے کہ غیر سرکاری بینک یا افراد سے حاصل ہونے والا سود ٹیکس میں نہیں دیا جاسکتا

---

(۱) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل:۲۵۶ بحوالہ اعلاء السنن، ردالمحتار

(۲) ص:۲۲-۲۳

ہے؛ کیونکہ سرکاری بینک سے حاصل ہونے والے سود کو ٹیکس میں دینے کی گنجائش اس لیے ہے کہ سودی رقم کا اصل حکم یہ ہے کہ وہ رقم اصل مالک تک پہنچ جائے جو ٹیکس ادا کرنے سے ہو رہا ہے، لیکن غیر سرکاری بینک یا افراد سے حاصل ہونے والے سود کو اگر ٹیکس میں دیا جائے تو مقصود حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اس کی گنجائش نہ ہوگی، بلکہ اس کو اس کے حقیقی مالک تک پہنچایا جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو صدقہ کردیا جائے۔

اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کا فرق

سود و رشوت ان دونوں کا لینا دینا دونوں حرام ہیں۔ نصوص دونوں کو عام ہیں لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ الرَّاشِیَ وَالمرْتَشِیَ (۱) لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ آکِلَ الرِّبَا وَمُوْکِلَہ (۲) ہاں یہ ضرور ہے کہ سود و رشوت کا لینا، حرام مال کا کمانا اور جمع کرنا، حرام کھانا اور استعمال میں لانا زیادہ سخت ہے، دینے والا حرام فعل کا ارتکاب کرتا ہے مگر حرام مال کو استعمال نہیں کرتا، اسی لیے فقہاء کرام نے جو استثناءات ذکر کئے ہیں ان میں رشوت دینے یا سود دینے کا ذکر آیا ہے، البتہ اس میں حرام کام کا ارتکاب اور اس پر تعاون ہے اس لیے فقہاء نے اس کو ضرورت کے ساتھ مقید کیا ہے۔

رشوت کے سلسلے میں شامی میں ہے کہ اگر دین کی حفاظت کے لیے رشوت دے تو جائز ہے اسی طرح اگر ظالم حاکم کو اپنی جان یا مال سے ظلم کو دفع کرنے کے لیے اور اپنا حق لینے کے لیے دے تو یہ رشوت نہیں ہے۔

اور سود سے متعلق الاشباہ کا یہ جزئیہ معروف ہے وَیَجُوْزُ لِلْمُحْتَاجِ الْاِسْتِقْرَاضُ بِالرِّبْحِ جب سودی قرض لینے اور سود دینے کے جواز کا مدار ضرورت ہے تو ضرورت وحاجت تو ایک خاص حالت کا نام ہے جو کہیں بھی پیش آسکتی ہے۔

اس لیے نفس حکم میں تو اسلامی بینک وغیر اسلامی ملک کے درمیان فرق کا سوال

---

(۱) ترمذی، کتاب الأحکام، حدیث نمبر: ۱۳۳۶

(۲) صحیح البخاري، کتاب البیوع، باب ثمن الکلب، حدیث نمبر: ۲۲۳۸

نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلم ملک میں چونکہ اسلامی نظام رائج ہوتا ہے اور اسلامی معاشرہ ہوتا ہے اس لیے ضرورت مندوں کی ضروریات کی کفالت کی مختلف صورتیں موجود ہوتی ہیں، اعانت وامداد کے قبیل کی بھی کہ ان کو رقم کا مالک بنا دیا جائے اور بغیر سود کے قرض کی بھی۔

مگر غیر اسلامی ملک میں نہ تو اسلامی نظام بیت المال اور عشر وخراج اور زکوۃ وصدقات وغیرہ ہیں اور نہ اسلامی معاشرہ وایثار اس لیے نہ بطور ملک آسانی سے ملنے کا سوال ہے اور نہ بطورِ قرض، یوں بھی اب جو حالات ہیں ان میں افراد شخصی طور پر قرض دینے سے گھبراتے ہیں کہ بکثرت لینے والے نہ صرف یہ کہ دینے سے انکار کرتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ فساد کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔

اسلامی ملک وغیر اسلامی ملک کے درمیان اس نمایاں فرق کی بنا پر ضرور یہ کہا جاسکتا ہے کہ غیر اسلامی ملک کے اندر رہنے والا مسلمان زیادہ اس بات پر مجبور ہوسکتا ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان بچانے کے لیے ایسا قرض لینے پر مجبور ہوجائے چنانچہ مفتی نظام الدین صاحب نے ہندوستان کی نسبت سے متعدد مواقع پر اس قسم کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔(۱)

سود تباہی کا سبب کیسے؟

عقلمند لوگ اس میں مختلف نہیں کہ قوم کی تباہی کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اصل سبب معاملہ کی خرابی ہے، قوم کے بعض لیڈر کہتے ہیں کہ سود بند کرنے سے تباہی آئی ہے، جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کررہی ہیں، میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ سود لیتے ہیں، لیکن ان کے کچھ کام نہیں آتا، کیونکہ مال سے مقصود دنیوی نفع اٹھانا ہے اور سود خور جمع کرتے کرتے مرجاتے ہیں ان کو بھی نہیں ملتا، اور فرض کرو اگر نفع بھی اٹھایا تو روحانی نقصان سے خالی رہتے ہی نہیں، یعنی دل سخت ہوجاتے ہیں کسی کو ان پر

---

(۱) مستفاد: الربا،ص:۲۸۹-۲۹۰

رحم نہیں آتا، کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے، جیسے بیرسٹروں (وکیلوں) کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے، سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا جائے تو بھاؤ بگڑ جائے گا اور اکثر سودخوروں کو دنیوی ترقی بھی نہیں ہوتی، اکثر سودخوروں کا مال ضائع ہوتے ہی دیکھا ہے، اور اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لے کر کیا کریں گے؟ یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔

دوسرے ایک دنیوی غلطی بھی ہے، وہ یہ کہ ترقی کا سبب وہ شئی ہوسکتی ہے جس سے عام لوگ نفع اٹھائیں اس لیے ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس کے سب افراد کو ترقی ہو، اور عام طور پر ان میں مالدار پیدا ہوں، اور سود ایسی چیز ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہوسکتا اول تو سب کے پاس مال نہیں، دوسرے آخر لے گا کون؟ اس لیے لامحالہ بعض لیں گے اور بعض نہیں، تو جو لوگ لیں گے وہ ترقی کریں گے اور جو نہیں لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے، جو دیں گے تباہ و برباد ہوں گے، پس ترقی کا یہ طریقہ نہیں ہوسکتا ترقی کا صحیح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار کرنا ہے۔

مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس (تنگدستی) نہیں، مسلمانوں میں تاجر، اہل ملک، رئیس سب طرح کی مخلوق ہے، مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوم کو سود دیتے ہیں اسی وجہ سے تباہی آتی ہے، تو ایسی صورت ہونا چاہئے کہ سود نہ دینا پڑے، اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی (یعنی اچھا معاملہ کرنا ہے)۔(۱)

---

(۱) سود، رشوت، جوا قرض کے احکام ص:۱۵

سود کے نقصانات

اخلاقی نقصانات

سود کے حرام ہونے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ وہ تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر کے خود غرضی ، بے رحمی ، سنگ دلی ، زبردستی اور کنجوسی کی صفات پیدا کرتا ہے اس کے برعکس اسلام ایک ایسے صحت مند معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا ہے جو رحم و کرم محبت ومودت، ایثار وتعاون اور بھائی چارے کی بنیاد پر قائم ہو، اس میں تمام انسان مل جل کر زندگی گزاریں ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آئیں، غریبوں اور ناداروں کی امداد کریں، دوسرے کے نفع کو اپنا نفع اور دوسرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں ، رحم دلی اور سخاوت کو اپنا شعار بنائیں اور اجتماعی مفاد کے آگے کچھ نہ سمجھیں۔ انسان میں یہ تمام صفات پیدا کر کے اسلام انہیں انسانیت اور شرافت کے اس اوجِ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے جہاں سے انہیں ''اشرف المخلوقات'' کا خطاب عطا ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف سود (خواہ وہ تجارتی ہو یا مہاجنی) جس ذہنیت کو جنم دیتا ہے اس میں ان اخلاقی اوصاف کی کوئی جگہ نہیں ، قرض دینے والے ساہوکار کو بس اپنے سود کی پروا ہوتی ہے، آگے اسے اس سے کچھ سروکار نہیں کہ مقروض کو نفع ہو یا نقصان؟ نفع ہوا تو کتنا؟ کتنی مدت میں؟ اور کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد؟ وہ مسلسل اپنے دیے ہوئے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے، اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مقروض کو جتنا ہو سکے دیر میں نفع ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا سود بڑھتا اور چڑھتا رہے، اسے

مدیون کے نقصان کا بھی غم نہیں ہوتا کیوں کہ نفع نقصان کی ہر شکل میں اس کا نفع کھرا رہتا ہے۔ یہ چیز خود غرضی کو بڑھا دیتی ہے۔ الخ۔(۱)

سود کے نتیجے میں افراد کے درمیان خاص طور پر آپس میں بغض و عناد پیدا ہوتا ہے جو ایک واضح حقیقت ہے جس سے وہی شخص انکار کرسکتا ہے جو سود خوری میں انتہاء تک پہنچ گیا ہو۔(۲)

پھر جس معاشرہ میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک کی حاجت مندی دوسرے کے لیے نفع اندوزی کا موقع بن جائے، ایسا معاشرہ کبھی مستحکم نہیں ہوسکتا وہ ہمیشہ انتشار و پراگندگی کی طرف مائل رہے گا اس کے برعکس جس معاشرہ کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، ایسے معاشرہ میں باہمی محبت اور خیر خواہی نشو و نما پائے گی اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلے معاشرہ کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔(۳)

سود کی سب سے بڑی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ یہ نہ صرف خود سراسر ظلم ہے بلکہ وہ ایک ایسے ظالمانہ سلسلہ کی بنیاد رکھ دیتا ہے جس میں آنے والا ہر دن اور ہر دن میں آنے والا ہر لمحہ ظلم کے اس سلسلہ کو دراز تر اور وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔(۴)

سودی نظام کی ایک خرابی یہ ہے کہ اس سے مال و دولت کو اولین ترجیح حاصل ہوتی ہے اور انسان کو ثانوی درجہ حاصل ہوجاتا ہے انسانوں سے زیادہ مال و دولت کی

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل:۶/ ۳۱۳

(۲) محاضرات معیشت وتجارت:۲۹۱

(۳) بینک کا سود ۳۶

(۴) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام ۲۲

اہمیت ہونے لگتی ہے۔(۱)

ایک خرابی یہ بھی ہے کہ انسان رزق حلال کی لذت کو بھول جاتا ہے اور حرام خوری کا عادی ہوجاتا ہے۔(۲)

الغرض سودی معاملہ کرنے اور سودخوری سے بہت سے اسلامی تعلیمات پر پردہ پڑ جاتا ہے اور بے شمار بداخلاقی کے صفات پیدا ہوجاتے ہیں۔مثلاً

۱) رحم وکرم اور ہمدردی ختم ہوکر بے رحمی، سنگ دلی پیدا ہوجاتی ہے۔

۲) محبت ومودت اور صلہ رحمی ختم ہوکر خودغرضی اور قطع تعلقی پیدا ہوجاتی ہے۔

۳) ایثاروتعاون کا جذبہ ختم ہوکر زبردستی اور کنجوسی کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے۔

۴) بھائی چارگی اور دوستی ختم ہوکر دشمنی اورعداوت پیدا ہوجاتی ہے۔

۵) خدا کو بھول کر پیسہ کو جمع کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے جس پر اللہ کی لعنت ہے۔(۳)

۶) سخاوت اور دوسروں پر خرچ کرنے کی صفت ختم ہوکر لالچ اور دنیا کی ہوس لگ جاتی ہے۔

۷) حتی کہ انسانیت اور شرافت ختم ہوکر حیوانیت اور ظالمیت غالب آجاتی ہے۔

۸) عجب وتکبر پیدا ہوجاتا ہے اور تحقیر وتنقید پیدا ہوجاتی ہے۔

۹) غریبوں اور ناداروں کی مدد کرنے ، مصیبت میں دوسروں کے کام آنے کے بجائے غریبوں کی غربت اور ناداروں کی ناداری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا خون چوسا جاتا ہے۔

۱۰) دل سخت ہوجاتا ہے، دعائیں قبول نہیں ہوتی، خدا کی لعنت اترتے رہتی ہے۔

---

(۱) مستفاد حوالہ سابق

(۲) حوالہ سابق:۲۳

(۳) سورہ ھمزہ

۱۱) ایمانداری، سچائی، وفاداری، احسان شناسی کے اوصاف ختم ہوجاتے ہیں اور بے ایمانی، کذب بیانی، بے وفائی اور احسان فراموشی جیسے اوصافِ خبیثہ پیدا ہوجاتے ہیں۔

معاشی وسماجی نقصانات

۱) سودی قرضوں کا دائمی رجحان یہ ہے کہ وہ مالداروں کو فائدہ اور عام آدمیوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیر فقیر ہی رہتا ہے اور مالدار مالدار ہی رہتا ہے فقیر کبھی مالدار نہیں بنتا۔

۲) موجودہ بینکاری نظام میں قرضے زیادہ تر ان لوگوں کو دیے جاتے ہیں جو مال و دولت کے اعتبار سے خوب مضبوط ہوتے ہیں، جو حاجت منداور مستحق ہوں ان کو بہت کم دیے جاتے ہیں۔

۳) مالدارلوگ صرف پیداواری مقاصد کے لیے قرضے نہیں لیتے بلکہ عیاشانہ خرچوں کے لیے بھی قرضے لیتے ہیں، جس سے پیداوار پر برے اثرات واقع ہوتے ہیں۔

۴) اسی طرح حکومت صرف حقیقی ترقیاتی پروگرام کے لیے قرضے نہیں لیتی بلکہ فضول اخراجات اور اپنے ان سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے بھی قرضے لیتی ہے جو صحت مند معاشی فیصلوں پر مبنی نہیں ہوتے۔

۵) سود کی ادائیگی نے چھوٹے تاجروں کو تباہ کر دیا ہے اور ہمارے موجودہ بینکاری نظام میں تمویل کرنے والے (Financer) کے ساتھ ہونے والا ظلم بھی زیادہ ہے، اس کی وجہ سے تقسیم دولت کا نظام بہت بری طرح متاثر ہوا ہے۔

۶) موجودہ بینکاری نظام میں بینک ہی کھاتہ داروں کا سرمایہ بڑے بڑے تاجروں کو فراہم کرتے ہیں، تمام بڑے تجارتی منصوبوں کی تمویل بینکوں یا مالیاتی اداروں کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، متعدد حالات میں تاجروں کا اپنی جیب سے لگایا ہوا

سرمایہ اس سرمایہ کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے جو انہوں نے عوام کا سرمایہ بینکوں اور مالیاتی اداروں سے قرض کی صورت میں لیا ہوا ہوتا ہے۔(۱)

۷) سود سوسائیٹی میں دولت کی آزادانہ گردش کو روکتا ہے، بلکہ دولت کی گردش کا رخ ناداروں سے مالداروں کی طرف پھیر دیتا ہے اس کی وجہ سے جمہور کی دولت سمٹ کر ایک طبقہ کے پاس اکٹھی ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ چیز آخر کار سوسائیٹی کے لیے بربادی کی موجب ہوتی ہے، جیسا کہ معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے، سود کے یہ تمام اثرات نا قابل انکار ہیں۔(۲)

۸) اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس ترکیب سے حکومتوں کو اپنے جال میں پھانسنے کے بعد سرمایہ دار طبقہ ان ہی حکومتوں کو اپنے استحکام کا ذریعہ بنالیتا ہے، وہ نہ صرف افراد اور تعمیری اداروں کی آمدنی کے ایک معتد بہ حصہ کا مالک بن جاتا ہے بلکہ آمدنی کے اس کثیر حصہ پر قابض ہو جاتا ہے جو قرضوں پر سود کی شکل میں حکومتوں کو ادا کرنا پڑتا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے تابع تمام حکومتوں کا وہی حال ہے جو پاکستان کا ہے کہ ہر سال کھربوں روپیہ قرض لیا جاتا ہے اور اربوں روپیہ سالانہ سود ادا کیا جاتا ہے۔(۳)

۹) شریعت کا مزاج ہے کہ تجارت اور کاروبار لوگوں کی آپس کی رضامندی سے ہو، شفاف انداز سے، عدل و انصاف کے ساتھ ہو، ہر شخص کو اس کی محنت کا مکمل پھل ملے، جو جتنا سرمایہ لگائے اتنا اجر اس کو ملے، ایک شخص اپنی محنت داؤ پر لگائے، دوسرا شخص اپنا سرمایہ داؤ پر لگائے دونوں کی کوئی نہ کوئی چیز داؤ پر لگی ہو اور دونوں کی کوششوں سے جو تجارت یا کاروبار یا مشینری چلے پھر اس کا نفع اعتدال

---

(۱) سود پر تاریخی فیصلہ: ۱۱۲

(۲) بینک کا سود حلال ہے: ۲۴

(۳) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام: ۲۸

اور عدل کے ساتھ مناسب انداز میں تقسیم ہونا چاہیے۔(۱)

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک آدمی تو محنت بھی کرے اور پیسے بھی لگائے دوسرا شخص (سود خور) گھر بیٹھے کھاتا رہے جس کا نہ پیسہ لگتا ہے نہ محنت لگتی ہے، اس کی نظر تو سودی مال پر ہوتی ہے کہ ماہانہ کیسے محنت و مزدوری کرنے والے شخص کا پیسہ سودی رقم میں شامل ہو کر آجائے، یہ تو سراسر ظلم ہے، لوگوں کے خون پسینے سے کمائے ہوئے مال کو چھین لینا ہے، یہ تو حیوانیت ہے جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔

پھر ایک خاص بات جو بہت سے ماہرینِ معیشت نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ سودی معیشت کے نتیجہ میں بے روزگاری اور بے کاری بڑھ جاتی ہے، جہاں کوئی تجارت کام کر رہی ہو، کوئی صنعت حقیقی طور پر لگائی جا رہی ہو، کوئی واقعی ترقی ہو رہی ہو جس کے نتیجہ میں اصل اثاثہ جات پیدا ہو رہے ہوں وہاں تو تجارتی سرگرمی پھیلتی اور بڑھتی ہے اس کے نتیجہ میں دولت کی گردش بھی تیز ہوتی ہے، دولت کا پھیلاؤ بھی عام ہوتا ہے اور روزگار کے نئے نئے مواقع بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں، لیکن جہاں ساری ترقی فرضی اور کاغذی ہو وہاں روزگار کے نئے مواقع پیدا ہونا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لیے کہ جہاں نہ حقیقی صنعت ہے نہ حقیقی تجارت ہے نہ حقیقی خدمات پیدا ہو رہے ہے تو وہاں روزگار کہاں سے پیدا ہوگا۔

پھر جو شخص سودی رقم کھانے کا عادی ہو جاتا ہے اس کے مزاج میں کام اور محنت سے فرار کی عادت پیدا ہو جاتی ہے، اگر سود خور کو گھر بیٹھے دولت مل رہی ہو تو اس کو محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کو دماغ سوزی کی کیا ضرورت ہے، اس نئی صنعتیں اور انڈسٹری لگانے کی کیا ضرورت ہے، یہ سب دردِ سر کے کام ہیں۔ وہ جوے سے اور سود خوری سے مزید دولت پیدا کرتا چلا جائے گا اور لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتا چلا جائے گا۔(۲)

پھر سودی معیشت جہاں جہاں پھیلتی ہے وہاں تجارت سے بے توجہی پیدا ہوتی

---

(۱) محاضرات معیشت و تجارت: ۲۹۳

(۲) محاضرات معیشت و تجارت: ۲۹۲

ہے،صنعت اور زراعت سے بے توجہی پیدا ہوتی ہے، چنانچہ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جو لوگ سود خوری میں زیادہ نمایاں ہیں وہ نہ زراعت میں دلچسپی رکھتے ہیں نہ صنعت میں، نہ تجارت میں ، اس لیے کہ ان کو زراعت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی ، صنعت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی، تجارت سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی، جتنی آمدنی گھر بیٹھے سود کے نتیجے میں ہوجاتی ہے۔(۱)

سود کا ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ جس کو اقتصادیات کے ایک اسپیشلسٹ (Specilist) نے بیان کیا ہے: سود اقتصادی زندگی کے لیے ایڈز کے مانند ہے، جو اس کی دفاعی قوت کو گھن لگا دیتا ہے اور اسے ہلاکت و بربادی کے گڈھے میں جا گراتا ہے۔(۲)

۱۰) سود کی خرابیاں متقدمین نے بھی بیان کی ہیں متاخرین نے بھی بیان کی ہیں قرآن کریم کی آیت يَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِي الصَّدَقٰتِ (۳) کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے ان خرابیوں کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سود کو ختم کرتا اور مٹاتا ہے،سود کے نتیجے میں جو اضافی دولت حاصل ہوتی نظر آتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے اور صدقات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے جو لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سود بالآخر زوال کا باعث ہوتا ہے، سود کے نتیجے میں عارضی ترقی تو بہت ہو جاتی ہے، بظاہر خوشحالی قائم ہو جاتی ہے، لیکن بالآخر معیشتیں تباہی کا شکار ہو جاتی ہیں، یہ تباہی کبھی تو بہت جلدی آجاتی ہے، چالیس پچاس سال بعد ہی آجاتی ہے، کبھی اس کے ظہور میں عرصہ لگتا ہے، سو دو سو سال لگتے ہیں، آج کل چوں کہ بہت بڑی بڑی معیشتیں ہوگئی ہیں، کھربوں ڈالر پر مبنی معیشتیں قائم ہیں بلکہ اتنے ڈالر اور پونڈوں پر مبنی ہیں جن کو گننے کے

---

(۱) حوالہ سابق

(۲) بینک کا سود حلال ہے: ۳۷

(۳) البقرۃ: ۲۷۶

لیے اردو میں ہندسہ نہیں ہے۔سینکڑوں، ہزاروں، کھرب ڈالر پر مبنی معیشتیں ہیں اس لیے ان بڑی معیشتوں کے بیٹھنے میں وقت لگتا ہے، چھوٹی کشتی یا ناؤ جلدی ڈوب جاتی ہے بڑا جہاز ڈوبنے میں بھی مہینے اور ہفتے لگا تا ہے،لیکن ڈوبنا بالآخر سودی معیشت کے بادبانوں سے چلنے والی کشتی کا مقدر ہوتا ہے۔(۱)

۱۱) سود معاشی انصاف کے راستے میں بہت بڑی بلکہ شاید سب سے بڑی رکاوٹ ہے،قرآن کریم نے حکم دیا تھا کہ دولت کا ارتکاز ایک طبقے میں نہیں ہونا چاہیے كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ سود اس حکم کے راستے میں واضح طور پر رکاوٹ ہے،سود کے نتیجے میں دولت کا ارتکاز ہوتا ہے۔

۱۲) مزید برآں یہ تو ہر شخص مانتا ہے کہ سودی معیشت ضرورت مند کی ضرورت کا استحصال کرتی ہے، خاص طور پر اگر سودی قرضہ صرفی قرضہ ہو، ذاتی اور شخصی ضروریات کے لیے ہو، اس میں تو استحصال کے ہونے پر خود سود خور بھی متفق ہیں اور مانتے ہیں کہ یہ استحصال کا ایک ذریعہ ہے لیکن جو تجارتی قرضے ہیں وہاں بھی شدید استحصال کا عنصر پایا جاتا ہے۔(۲)

اس لیے ''ہابلر'' (Habler) نے لکھا ہے کہ ایک طویل زمانے سے سود کا نظریہ علم معاشیات کی ایک دکھتی رگ بنا ہوا ہے۔(۳)

۱۳) موجودہ سودی نظام میں جگہ جگہ غبنِ فاحش کی برائی پائی جاتی ہے (جو شرعاً حرام ہے) اگر ایک شخص بینک سے قرض لیتا ہے اور اس کا کاروبار یا صنعت خوب چلتی ہے لیکن وہ بنک کو دس فیصد، بارہ فیصد سود دے رہا ہے تو یہ بھی غبن فاحش ہے اس لیے کہ اگر یہ شراکت ہے تو شراکت میں دونوں فریقوں کے نفع میں کوئی مناسبت

---

(۱) محاضرات معیشت وتجارت: ۲۹۰

(۲) حوالہ سابق: ۲۹۳

(۳) فتاویٰ بینات: ۹/۴

ہونی چاہیے، ایک شخص سو روپے کے دو سو کما رہا ہے، خود نوے رکھتا ہے دوسرے کو دس دیتا ہے، یہ یقیناً غبن فاحش ہے۔(۱)

سود سے چند لوگوں کا نفع

سود میں چند افراد کا نفع اور پوری انسانیت کا نقصان ہے مثلاً ایک سرمایہ دار نے کسی کاروبار میں اپنی جیب سے صرف دس لاکھ روپے لگائے اور نوے لاکھ روپے بینک سے قرض لے لیے، اور اس طرح ایک کروڑ روپے سے تجارت شروع کی، فرض کیجیے کہ کاروبار میں پچاس فیصد کا سالانہ نفع ہوا اور ایک کروڑ روپے کے اب ڈیڑھ کروڑ بن گیے، یہ سرمایہ دار پچاس لاکھ کے نفع سے صرف پندرہ لاکھ روپے بطور سود بینک کو دے گا اور جس میں سے بینک اپنا نفع رکھ کر بمشکل دس یا بارہ لاکھ روپے ان ہزاروں اکاؤنٹ ہولڈروں میں تقسیم کرے گا؛ جن کی امانتیں اس کے پاس جمع ہیں، جس کا خالص نتیجہ یہی ہے کہ اس کاروبار میں جن ہزاروں افراد نے نوے لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا تھا اور ان ہی کے سرمائے نے درحقیقت اتنے بھاری نفع کو ممکن بنایا، ان میں تو کل دس بارہ لاکھ روپے تقسیم ہوئے ، اور جس سرمایہ دار نے کل دس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی تھی ، اسے کاروبار کے نفع کی صورت میں پینتیس لاکھ روپے ملے، پھر دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ پندرہ لاکھ روپے جو بینک کو دیے گئے ، اور بینک کے واسطے سے عوام تک پہنچے ، ان کو سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی لاگت (Cost) میں شامل کر لیتا ہے، جو بالآخر اس کی جیب پر نہیں پڑتے بلکہ عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں ، کیوں کہ اس کاروبار میں اس نے جو مصنوعات تیار کیں ، ان کی قیمت متعین کرتے وقت بینک کو دیے گیے سود کی رقم بھی قیمت میں شامل کر لی جاتی ہے، اور اس طرح درحقیقت اس کی اپنی جیب سے کچھ بھی خرچ نہیں ہوا، اور اگر کاروبار میں کسی آسمانی آفت یا کسی حادثہ کی وجہ سے نقصان ہونے لگے تو اس نقصان کی تلافی انشورنس کمپنی کے ذریعہ کر لی جاتی ہے، اور اس انشورنس

---

(۱) حوالہ سابق

کمپنی میں بھی ان ہزار ہا عوام کا سرمایہ جمع رہتا ہے جو حسب اتفاق ماہ بماہ یا سال بسال اپنی کمائی کا ایک حصہ یہاں جمع کراتے رہتے ہیں، لیکن نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اور نہ کوئی حادثہ پیش آتا ہے، اس لیے عموماً پیسے جمع ہی کراتے ہیں نکلوانے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔

دوسری طرف اس قسم کے بہت سے سرمایہ دار اگر کسی بھاری نقصان کے سبب بینک کو قرضے واپس نہ کرسکیں اور اس کے نتیجہ میں بینک کا دیوالیہ ہوجائے (یعنی بینک مفلسی کا اعلان کردے) تو اس صورت میں ان سرمایہ داروں کی تو بہت کم رقم گئی، نقصان تو ان سارے امانت داروں کا ہوا جن کے پیسے کے بل بوتے پر سرمایہ دار کاروبار کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ سود کے اس نظام کی وجہ سے پوری قوم کے سرمائے کو چند بڑے سرمایا دار اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس کے بدلہ میں قوم کو بہت تھوڑا سا حصہ واپس کرتے ہیں اور یہ تھوڑا حصہ بھی اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے دوبارہ عام صارفین عوام سے ہی وصول کرلیتے ہیں اور اپنے نقصان کی تلافی بھی عوام کی بچتوں سے کرتے ہیں، اس طرح سود کا مجموعی رخ اس طرف رہتا ہے کہ عوام کی بچتوں کا کاروباری فائدہ زیادہ تر بڑے سرمایہ داروں کو پہنچے اور عوام اس سے کم سے کم مستفید ہوں، اس طرح دولت کے بہاؤ کا رخ ہمیشہ سرمایہ داروں کی طرف ہی رہتا ہے۔(۱)

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ موجودہ سودی نظام امیروں کے لیے کام کرتا ہے اور غریبوں کو مار دیتا ہے کہ غریب کی غربت ختم نہیں ہوتی اور امیروں کی مالداری میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

اور یہ بات جس میں رابرٹسن نے بھی بیان کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: سود کا ایک عام کردار معاشی نظام میں یہ ہوتا ہے کہ خودکار طریقے سے غریب سے امیر کی طرف

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۴-۱۳

سرمایہ کے انتقال کا سبب بنتا ہے، اور پھر غریب سے امیر کی طرف انتقال سرمایہ تیسری دنیا کے ممالک کے قرضوں کے ذریعہ اور بھی زیادہ چونکا دینے کی حد تک واضح ہوگیا ہے۔(۱)

سود کا نقصان غریب اور متوسط طبقہ کو زیادہ ہے

دنیا میں سب سے زیادہ سودخواری اس کاروبار میں ہوتی ہے جو مہاجنی کاروبار (Lending business) کہلاتا ہے، یہ بلا صرف ہندوستان تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر بلا ہے جس سے کوئی ملک بچا ہوا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی یہ انتظام نہیں ہے کہ غریب اور متوسط طبقہ کے لوگوں کو ان کی ہنگامی ضروریات کے لیے آسانی سے قرض مل جائے، اس کی وجہ سے ہر ملک میں مزدور، کسان، چھوٹے چھوٹے کاروباری آدمی اور کم تنخواہ والے ملازم مجبور ہوتے ہیں اپنے برے وقت پر مہاجنوں سے قرض لیں، اس کاروبار میں اپنی بھاری شرح سود رائج کہ جو شخص ایک مرتبہ سودی قرض کے جال میں پھنس جاتا ہے وہ پھر اس سے نہیں نکل سکتا، بلکہ دادا کا لیا قرض پوتوں تک وراثت میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر یہ شرح سود انگلستان میں سرکاری 48% فیصدی سالانہ اور غیر سرکاری 25% سے 400% فیصدی ہے، امریکہ میں سرکاری 30% سے 60% فیصدی سالانہ اور غیر سرکاری 100% سے 260% فیصدی ہے اور اکثر 480% فیصدی تک پہنچ جاتی ہے۔ اور خود ہمارے ملک ہندوستان میں 75% فیصدی سالانہ ہے جو اکثر 150% تک پہنچ جاتی ہے بلکہ 300% اور 350% فیصدی سالانہ شرح کی مثالیں بھی پائی گئی ہیں، اس بلائے عظیم میں ہر ملک کے غریب اور متوسط طبقہ کی اکثریت بری طرح پھنسی ہوئی ہے، شب وروز کی انتھک محنت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہیں یا مزدوریاں ان کو ملتی ہیں، ان میں سے سود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں، اس سے ان کے

(۱) مستفاد از سود پر تاریخی فیصلہ: ۱۱۷

صرف اخلاق میں بگاڑ اور جرائم کی طرف ان کا رجحان، ان کے معیار زندگی کی پستی اور ان کی اولاد کے معیار تعلیم وتربیت میں کمی ہی نہیں آتی؛ بلکہ اس کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ دائمی فکر اور پریشانی ملک کے عام کارکنوں کی قابلیت کار کو بہت گھٹا دیتی ہے اور اب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی محنت کا پھل دوسرا لے اڑتا ہے تو اپنے کام سے ان کی دلچسپی ختم ہوجاتی ہے۔

اس لحاظ سے یہ سودی کاروبار ایک ظلم ہی نہیں بلکہ اجتماعی معیشت کا بھی بھاری نقصان ہے اور اس کا براہ راست اثر معاشی پیداوار پر پڑتا ہے اگر دنیا میں پانچ کروڑ آدمی بھی ایسے ہیں جو مہاجنوں کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور وہ اوسطاً ۱۰/روپئے ماہانہ سود ادا کررہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر مہینہ ۵۰/کروڑ روپئے کا مال فروخت ہونے سے رہ جاتا ہے اور اتنی بھاری رقم معاشی پیداوار کی طرف پلٹنے کے بجائے مزید سودی قرضوں کی تخلیق میں ماہ بماہ صرف ہوتی رہتی ہے، ۱۹۴۰ء میں یہ اندازہ کیا گیا تھا کہ صرف ہندوستان کے مہاجنی قرضے کم از کم دس ارب روپئے تک پہنچے ہوئے تھے۔(۱)

چھوٹا سرمایہ دار بینک سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا

کون نہیں جانتا کہ یہ چند آنے فی سیکڑہ کا سود سیونگ بینکوں میں اور ڈاکخانہ جات سے لوگوں کو ملتا ہے یہ کسی طرح ان کے معاش کی کفالت نہیں کرسکتا، اس لیے وہ مجبور ہیں کہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی مزدوری یا ملازمت تلاش کریں، تجارت کی طرف اول تو ان کی نظر خود نہیں جاتی اور اگر کسی کو اس طرف توجہ بھی ہوجائے تو پوری ملت کا سرمایہ بینکوں میں جمع ہوکر جو صورت تجارت کی بن گئی ہے اس میں کسی چھوٹے سرمایہ والے کو داخل ہونا خود اپنی موت کو دعوت دینے سے کم نہیں کیوں کہ بینک کوئی بڑا سرمایہ قرض پر صرف اسی کو دے سکتے ہیں جس کی بازار میں اپنی ساکھ ہو اور بڑا کاروبار ہو، دس لاکھ کے

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۳۸، ۴۰

مالک کو ایک کروڑ قرض مل سکتا ہے وہ اپنے ذاتی روپیہ کی نسبت سے دس گنا زیادہ کی تجارت چلا سکتا ہے اور تھوڑے سرمایہ والے کی نہ کوئی ساکھ ہوتی ہے نہ بینک اس پر اعتماد کرتے ہیں، کہ ان کو دس گنا زیادہ قرض دیدیں ایک ہزار کی مالیت والے کو دس ہزار تو کیا ایک ہزار ملنا بھی مشکل ہے اور جب کہ ایک شخص جو ایک لاکھ کی ملکیت رکھنے والا ہو نو لاکھ بینک کا سرمایہ لگا کر دس لاکھ کی تجارت کرتا ہے، اور فرض کر لیجیے کہ اس کو ایک روپیہ فی صد نفع ہوتا ہے تو گویا اس کو اپنے ایک لاکھ پر دس فیصد نفع ہوا اس کے بالمقابل اگر کوئی شخص صرف اپنے ذاتی روپے سے ایک لاکھ کی تجارت کرتا ہے اس کو ایک لاکھ پر صرف ایک ہی فیصد کا نفع ہوگا، جو اس کے ضروری اخرجات کے لیے بھی کافی نہ ہوں گے، ادھر مارکیٹ میں بڑے سرمایہ والے کو خام سامان جس نرخ اور رعایت کے ساتھ ملتا ہے وہ چھوٹے سرمایہ والے کو میسر نہیں آسکتا اس لیے چھوٹے سرمایہ والا مفلوج اور محتاج ہو کر رہ جاتا ہے اور اگر اس کی شامت آئی اور اس نے بھی کسی ایسی تجارت میں ہاتھ ڈالدیا تو بڑے سرمایہ والا اس کو اپنی خدائی کا شریک سمجھ کر کچھ اپنی گرہ سے نقصان اٹھا کر بھی بازار کو ایسا ڈاؤن کر دیتا ہے کہ چھوٹے سرمایہ والا اصل اور نفع سب سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تجارت صرف ان چند افراد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے جو بڑے سرمایہ دار ہیں:

۱) یہ ملت پر کتنا بڑا ظلم ہے کہ ساری ملت اصلی تجارت سے محروم ہو کر صرف بڑے سرمایہ داروں کی دست نگر بن جائے، ان کو وہ جتنا نفع دینا چاہیں بخشش کے طور پر دیدیں۔

۲) اور دوسرا اس سے بڑا نقصان جس کی زد میں پورا ملک آجاتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں اشیاء کے نرخ پر ان بڑے سرمایہ داروں کا قبضہ ہو جاتا ہے، وہ گراں سے گراں فروخت کر کے اپنی گرہ مضبوط کر لیتے اور پوری ملت کی گرہیں کھلوا لیتے ہیں اور قیمت بڑھانے کے لیے جب چاہیں مال کی فروخت بند

کر دیتے ہیں اگر ساری ملت کا سرمایہ بینکوں کے ذریعہ کھینچ کر ان خودغرض لوگوں کی پرورش نہ کی جاتی اور یہ مجبور ہوتے کہ صرف اپنے ذاتی سرمایہ سے تجارت کریں، تو نہ چھوٹے سرمایہ والوں کو یہ مصیبت پیش آتی اور نہ یہ خودغرض درندے پوری تجارت کے ناخدا بنتے، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دسروں کا حوصلہ بڑھتا، تجارت کا کاروبار عام ہوتا، جس سے ہر ایک کا اسٹاف علیحدہ ہوتا، جس سے ہزاروں حاجتمندوں کی روزی پیدا ہوتی، اور تجارتی نفع بھی عام ہوتا، اور اشیاء کی ارزانی پر بھی یقینی اثر ہوتا، کیوں کہ باہمی مقابلہ (کمپٹیشن) ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ کوئی آدمی اس پر تیار ہوتا ہے کہ اپنا نفع کم کرے، اس عیارانہ طریق کار نے پوری قوم کو ایک مہلک بیماری لگادی اور دوسرے اس کی ذہنیت خراب کردی کہ اس بیماری ہی کو شفا سمجھتی۔

۳) سود سے ایک معاشی نقصان یہ بھی ہے کہ سودخور جب گھاٹے میں آجائے تو پھر وہ پنپنے کے قابل نہیں رہتا، کیوں کہ اتنا سرمایہ تو تھا نہیں جس کے نقصان کو یہ برداشت کرسکے، نقصان کے وقت اس پر دوہری مصیبت ہوتی ہے، ایک تو اپنا نفع اور سرمایہ گیا اور اوپر سے بینک کے قرض میں دب گیا، جس کی ادئیگی کے لیے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں، اور بے سود کی تجارت میں اگر سارا سرمایہ بھی کسی وقت چلا جائے تو فقیر ہی ہوگا مقروض تو نہ ہوگا۔(۱)

حکومت کے ملکی قرضے

عموماً حکومتیں نفع آور کاموں پر لگانے کے لیے لمبی مدت کے قرضے لیتی ہیں مگر کوئی حکومت بھی ایک مقرر شرح پر قرض لیتے وقت یہ نہیں جانتی کہ آئندہ بیس تیس سال کے دوران میں ملک کے اندرونی حالات اور دنیا کے بین الاقوامی معاملات کیا رنگ اختیار کریں گے، اوران میں اس کام کی نفع آوری کا کیا حال رہے جس پر خرچ کرنے

---

(۱) معارف القرآن: ۱/۶۷۱، ۶۷۴

کے لیے وہ یہ سودی قرض لے رہی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کے اندازے غلط نکلتے ہیں اور وہ کام شرح سود کے برابر نفع نہیں دیتا کجا کہ اس سے زیادہ، اب حکومت اس کے سود کا بار عام باشندوں پر ڈال دیتی ہے ٹیکسوں کے ذریعہ سے ہر شخص کی جیب سے بالواسطہ یا بلا واسطہ یہ سود نکالا جاتا ہے اور سال کے سال لاکھوں روپے کی رقمیں جمع کرکے سرمایہ داروں کو مدت ہائے دراز تک پہنچائی جاتی رہتی ہیں۔فرض کیجیے کہ آج پانچ کروڑ روپے سے آب پاشی کی ایک بڑی اسکیم عمل میں لائی جاتی ہے اور یہ سرمایہ ۶ فیصدی سالانہ سود پر حاصل کیا جاتا ہے اس حساب سے حکومت کو ہر سال ۳۰ لاکھ روپیہ سود ادا کرنا ہوگا، اب یہ ظاہر ہے کہ حکومت اتنی بڑی رقم کہیں سے زمین کھود کر نہیں نکالے گی ، بلکہ اس کا باران زمین داروں پر ڈالے گی جو آب پاشی کے اس منصوبہ سے فائدہ اٹھائیں گے ، ہر زمین دار جو آبیانہ لگائے گا اس میں ایک حصہ لازماً اس سود کا بھی ہوگا اور زمین دار خود بھی یہ سود اپنے گھر نہیں دے گا بلکہ وہ اس کا بار غلہ کی قیمت پر ڈالے گا، اس طرح یہ سود بالواسطہ ہر اس شخص سے وصول کیا جائے گا جو اس غلے کی روٹی کھائے گا، اس طرح ایک ایک غریب اور فاقہ کش آدمی کی روٹی میں لازماً ایک ایک ٹکڑا توڑا جائے گا اور ان سرمایہ داروں کے پیٹ میں ڈالا جائے گا جنھوں نے ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ سود پر اس منصوبہ کے لیے قرض دیا تھا، اگر حکومت کو یہ قرض ادا کرتے کرتے ۵۰ برس لگ جائیں تو وہ غریبوں سے چندہ جمع کرکے امیروں کی مدد کرنے کا یہ فریضہ نصف صدی تک برابر انجام دیتی چلی جائے گی۔

یہ عمل اجتماعی معیشت میں دولت کے بہاؤ کو ناداروں سے مالداروں کی طرف پھیر دیتا ہے، حالانکہ جماعت کی فلاح کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مالداروں سے ناداروں کی طرف جارہی ہو۔(۱)

خلاصہ:الغرض ربا اور اس کی تمام قسمیں اور شکلیں وہ تمام خرابیاں رکھتی ہیں جو

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے:۴۱، ۴۲

اسلامی معاشرے کی اساس کو مختل کرنے کے مترادف ہیں اور آج پوری دنیا کی یہ خطرناک صورتحال دراصل سود پر مبنی نظام کو معیشت پر بے قابو اختیار دیے جانے کا نتیجہ ہے۔

روحِ شریعت کی خلاف ورزی

سطور بالا میں سود کی جو قباحتیں بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شریعت نے سود کو اتنا بڑا جرم کیوں قرار دیا ہے اور کیوں سود خور کے خلاف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ کیا گیا ہے، لیکن سود کے مفاسد یہاں ختم نہیں ہوتے، ان کے علاوہ بھی شریعت کے بہت سے احکام ایسے ہیں جن سے سود کا تعارض ہوتا ہے اور اگر تجارت، کاروبار اور معاشیات کی بنیاد سود پر ہو تو قدم قدم پر ہر چیز شریعت کے اصولوں سے متصادم ہوگی، ذیل میں چند ایسے اہم اصولوں کی نشان دہی کی جارہی ہے جو بالبداہت سود کے تصور سے متعارض ہیں اور سود کی موجودگی میں ان پر عمل درآمد کرنا ممکن نہیں۔

۱) اسلامی معاشرے کے بنیادی اصول جن کی وضاحت اور تشریح سے قرآن مجید اول سے لے کر آخر تک بھرا پڑا ہے، جن کے مفصل احکام سے حدیث کی درجنوں کتابیں بھری پڑی ہیں وہ یہ ہیں کہ مسلمان ایک دوسرے کے کفیل ہوں یعنی تکافل کا اصول، مسلمان ایک دوسرے کے مددگار ہوں، یعنی تعاون کا اصول، مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ رحمدلی کا سلوک کریں، یعنی تراحم کا اصول مسلمانوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار اور محبت کا ہو یعنی توادد کا اصول، یہ الفاظ قرآن وحدیث کے صفحہ صفحہ پر بکھرے پڑے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے آپس کے لین دین اور کاروبار کی جو اصل بنیاد اور جذبہ محرکہ ہے وہ ایک دوسرے کی کھال کھینچنا، ایک دوسرے کا خون چوسنا اور ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طرح اپنا مفاد حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی روح ایک دوسرے سے تعاون، ایک دوسرے کے ساتھ شفقت اور رحمت ہونی

چاہیے، قرآن پاک نے ان لوگوں کو ہلاکت کی وعید سنائی ہے جو دوسروں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کی تلقین نہ کریں اور خود مدد کرنے کے باوجود دوسروں کو اس کے لیے تیار نہ کریں، اب بتائیے کہ سود خوری کا جو بھیانک نقشہ ہم نے سطور بالا میں دیکھا ہے اس میں تکافل، تعاون، تراحم اور توادد کے اصول چہارگانہ کی کہاں اور کس طرح گنجائش ہے، ''سودمندوں'' کی تعزیرات کے تو یہ وہ سنگین ترین جرائم ہیں جن کا ان کی دنیا میں نام لینا بھی کوئی گوارا نہیں کرتا۔

۲) قرآن مجید کا واضح طور پر حکم ہے: وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۱) یعنی اگر تمہارا مقروض تنگ دست اور پریشان حال ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت دے دو جب تک اس کے پاس گنجائش نہ پیدا ہو جائے اور اگر معاف کر دو تو بہت ہی اچھی بات ہے، بشرطیکہ تمہیں اس کا علم ہو، یہ ہے قرآن پاک کی رو سے ایک قرض خواہ اور مقروض کے تعلق کی نوعیت اس صورت میں جب کہ مقروض بدحال، نادار اور تنگ دست ہو، یہاں دو ہی صورتیں ممکن ہیں، بہترین صورت تو یہ ہے کہ معاف کر دو، ورنہ کم از کم مہلت تو ضرور دے دو، اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کا حکم ہے اور مسلمانوں کا طرز عمل یہ ہونا چاہیے تو آج کیا کوئی بینک اور کوئی سود خور ایسا ہے جو یہ دیکھے کہ کل جس نے اس سے قرض لیا تھا آج اس کا کاروبار ڈوب رہا ہے وہ سنبھل جائے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے، یہاں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے، یہاں جونہی قرض خواہ کو شبہ ہوتا ہے کہ مقروض کا کاروبار کمزور پڑ رہا ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے امکانات اس میں نہیں ہیں یا بہت کم ہیں تو سب سے پہلے بینک پہنچ جاتا ہے اور فیانس کمپنی پہنچ جاتی ہے اور سب سے پہلے اپنے قرضہ کی واپسی کا مطالبہ کر ڈالتی ہے، ہمارے

---

(۱) البقرۃ:۲۸۰

ہاں جو کمپنیاں ڈوبی ہیں ان کا قصہ سب کے سامنے ہے، کئی صورتوں میں ایسا ہوا کہ کمپنی ٹھیک کام کررہی تھی کسی وجہ سے انوسٹر کو شبہ ہو گیا، یا کسی کاروباری حریف نے شبہ پیدا کر دیا، اب بجائے مدد کرنے، ہاتھ بٹانے اور مہلت دینے کے انوسٹر سب سے پہلے آ دھمکا کہ سب سے پہلے میری رقم واپس کرو میں کچھ نہیں جانتا، اب دیکھیے ایک طرف قرآن مجید یہ کہتا ہے تم جب کسی کو قرض دو تو تمہارا جذبہ آپس میں رحمدلی تعاون اور محبت کا ہونا چاہیے اور اگر مقروض کے پاس گنجائش نہ ہو تو اسے مہلت دے دو اور اگر تمہارے پاس گنجائش ہو تو معاف کر دو، دوسری طرف یہ سود خورنہ ذہنیت ہے کہ سرمایہ دار سب سے پہلے اپنا پنجہ لے کر پہنچ جائے اور ایک غریب کا گلا دبادے کہ اس کا دم اگر نہ بھی نکلتا ہو تو نکل جائے۔

(۳) دولت کے پھیلاؤ کے بارے میں قرآن پاک کا واضح اصول ہے کہ: كَيۡ لَا يَكُونَ دُولَةَۢ بَيۡنَ ٱلۡأَغۡنِيَآءِ مِنكُمۡ (۱) یہ مال و دولت کی گردش صرف مال داروں ہی میں سمٹ کر نہ رہ جائے بلکہ ہر طبقہ میں موجود رہے، معاشرہ کا ہر طبقہ دولت سے مستفید ہو اور وہ ہر طبقہ میں پھیلے، جس طرح انسانی جسم میں خون ہر لمحہ دل سے نکلتا ہے اور بدن کے گوشے گوشے اور رگ رگ تک پہنچتا ہے، اس طرح سے دولت کو اجتماعی جسم کی رگ رگ اور گوشہ گوشہ تک پہنچنا اور مسلسل پہنچتے رہنا چاہیے، اس معاشی ہدف کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے بہت سے احکام دیے ہیں جن کا مقصد ارتکاز دولت کے امکانات کا سدِ باب کرنا اور موجودہ دولت کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے، اس کے برعکس سود کا سارا چکر ہی ایک ہدف پر گھومتا ہے اور وہ دولت کے زور پر مزید دولت اور مزید دولت کے بل پر مزید تر دولت حاصل کرتے چلے جانا تا آنکہ معاشرہ کی ساری دولت سمٹ کر چند سود خوروں اور بڑے بڑے دو چار مہاجنوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے، سود خور کا

---

(۱) الحشر:۷

رجحان یہ ہوتا ہے کہ دولت کو جگہ جگہ سے چوس کر اور ہر گوشہ سے کھینچ کر جمع کیا جائے ، بجائے اس کے کہ یہاں سے آگے جا کر وہ پھیلے سودی نظام کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں دولت تھوڑی موجود ہے وہ بھی جمع ہو جائے ، اب دیکھیے ہمارے ہاں بینکوں میں جو سود رائج ہے وہ کسی طرح اس مقصد کو حاصل کرتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی آمدنی والے لوگ اپنا تھوڑا تھوڑا سرمایہ اپنا پیٹ کاٹ کر بینکوں میں رکھ دیتے ہیں، اس طرح ملک کے لاکھوں آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی آمدنیاں آ کر دولت کے ایک بڑے تالاب میں جمع ہو جاتی ہیں ، دولت کے اس بڑے تالاب کو چند بڑے سرمایہ دار کنٹرول کرتے ہیں، بظاہر کہا یہ جاتا ہے کہ اس سرمایہ سے کاروبار کے لیے قرض دیے جائیں گے اور یہ ساری دولت معاشرہ کے مشترک مقاصد کے لیے خرچ ہوگی ،لیکن عملاً ایسا نہیں ہوتا، کیوں کہ ہر بینک قرض دینے سے قبل لاکھوں روپے کی گارنٹی مانگتا ہے۔کبھی کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کا پہلے سے کاروبار اتنی مالیت کا ہو تو آپ کو اتنا قرض مل سکتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ بینک سے صرف وہ آدمی قرض لے سکتا ہے جو پہلے سے لاکھوں کروڑوں روپیہ کی جائیداد کا مالک ہو، مثلاً ۲۵ لاکھ روپیہ کی جائیداد کی گارنٹی پر مزید پچیس لاکھ روپے قرض مل گیا، گویا جس سرمایہ دار کے پاس پچیس لاکھ تھے اب وہ بچاس لاکھ کا مالک ہو گیا ، اسی طرح اگر وہ دوبارہ قرض لے تو اس کے پاس ایک کروڑ روپیہ جمع ہو گیا ، اس کے معنی یہ ہیں کہ دس پندرہ سال کے اندر اندر امیر امیر تر بن گیا اور غریب غریب تر ، جو تھوڑی بہت دولت معاشرہ میں موجود تھی وہ کھچ کر چند ہاتھوں میں سمٹ آئی ، پھر جیسے گدھ بیٹھے رہتے ہیں کہ کون ابھی مرنے والا ہے اور کون آخری دموں پر ہے اور جیسے ہی روح نکلنے کے قریب ہوتی ہے تو گدھ پہلے پہنچ جاتا ہے اس طرح سے سود خور یہ دیکھتا رہتا ہے کہ جو لوگ کاروبار کر رہے ہیں ان میں سے کون ہے جو تھوڑا سا کمزور ہو رہا ہے جیسے ہی

کوئی کمزور پڑتا ہے اس پر سب بیک وقت جا کے سوار ہو جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے غریب کی جائیداد بندر بانٹ ہو جاتی ہے، اب وہ کاروباری تو گیا جہنم میں !اور اس کا رہا سہا روپیہ اور بچے کچے وسائل پھر ان چند سرمایہ داروں کے پاس آ گیے۔

۴) قرآن مجید کا معمولی مطالعہ رکھنے والا ایک عام انسان بھی یہ جانتا ہے کہ اس کتاب نے جگہ جگہ خرچ کرنے کی تلقین کی ہے بچا بچا کر رکھنے کو ناپسند ٹھہرایا ہے، قرآن پاک کا آغاز ہی اس اعلان سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب ان تقویٰ شعار مومنین کے لیے راہ ہدایت ہے جن کی ایک نمایاں صفت خرچ کرنا ہے، قرآن مجید میں ساٹھ سے زائد مقامات پر خرچ کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور خرچ کرنے کو اہل ایمان کا اہم وصف قرار دیا گیا ہے، ان میں سے بہت سے مقامات پر فی سبیل اللہ کی قید بھی نہیں ہے بلکہ صرف خرچ کرنے کا ذکر ہے، جس سے اشارہ ملتا ہے کہ جائز مدات میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

اس کے برعکس قرآن پاک کی درجنوں آیات میں بچا کر رکھنے اور دولت جمع کرنے کو کفار ومشرکین اور خدا کے باغیوں کی عادت بتایا گیا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ کا عمومی مزاج بچت کرنے کا نہیں بلکہ خرچ کرنے کا ہے، یہاں کسی واقعی، حقیقی، اور شخصی ضرورت کی خاطر کچھ رقم پس انداز کر رکھنے کے بارے میں کوئی فتویٰ دینا مقصود نہیں ہے، بلکہ اسلامی معاشرہ کے حقیقی رجحان اور مزاج کی نشاندہی مقصود ہے۔

ایک اسلامی معاشرہ کے برعکس ایک سودی معاشرہ کا رجحان بچت اور زر اندوزی کا ہوتا ہے، سودی نظام کا بنیادی کلیہ اور اصل الاصول ہی یہ ہے کہ بچت کرنا زر اندوزی کرنا بہت بڑی معاشی نیکی ہے اور معاشرہ کا یہ فرض کفایہ ہے کہ وہ اس نیکی کے لیے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرے، ان سہولتوں میں سب سے

بڑی اور سب سے اہم سہولت بچتوں پر زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانا ہے، اگر چہ بہت سے ماہرین معاشیات نے نظری اور تجرباتی دونوں اعتبار سے اس بات کا غلط ہونا ثابت کر دیا ہے پھر بھی سود خوری پر مبنی مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام بچتوں پر منافع کو بچت کے لازمی محرک اور ترغیب کے طور پر پیش کرتا رہتا ہے اور لوگوں کو یہ باور کراتا رہتا ہے کہ اگر بچتوں پر منافع نہ دیا جائے تو بچتیں نہیں ہوں گی اور بچتیں نہیں ہوں گی تو سارا معاش درہم برہم ہو جائے گا۔

اس کے برعکس اسلامی تعلیمات میں بچتوں کے بجائے انفاق کو معاشی سرگرمیوں کی اساس قرار دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انفاق معاشی سرگرمی کو وسعت اور سرعت عطا کرتا ہے، جب ایک شخص روپیہ خرچ کرتا ہے تو وہ تجارت کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے اس سے کئی آدمیوں کی ضرورت پوری ہوتی ہے، کاروبار کو، مہمیز ملتی ہے، دولت ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے، اس سے دولت کی سرکولیشن تیز ہوتی ہے جو معاشی صحت مندی کی علامت ہے۔

جہاں تک اس مفروضہ کا تعلق ہے کہ شرح سود بڑھنے سے بچتیں بڑھتی ہیں یہ بھی کئی ماہرین معاشیات نے غلط ثابت کر دیا ہے، لارڈ کینز نے ثابت کر دیا ہے کہ بچت کا انحصار سود کی بڑھوتری پر نہیں بلکہ آمدنی کی سطح پر ہے اور آمدنی کا انحصار تجارتی اور پیداواری عمل کی سرعت اور وسعت پر ہے، لہٰذا پتا چلا کہ انفاق ہی دراصل معاشی کامیابی کی کنجی ہے۔

۵) شریعت کا طے شدہ اصول جس سے مسلمانوں کے تمام فقہی مکاتب اتفاق کرتے ہیں وہ نفع اور نقصان کے باہمی ربط کا اصول ہے، جو اس مشہور حدیث نبوی پر مبنی ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اَلْخِرَاجُ بِالضَّمَانِ (۱) یعنی تم اس چیز کا

(۱) أبو داود، کتاب الإجارة، باب فیمن اشتری عبدا فاستعمله، ثم وجد به عیبا، حدیث نمبر: ۳۵۰۸

فائدہ اٹھا سکتے ہو جس کے ممکنہ نقصانات کی تلافی اور بوجھ تمہارے ذمہ ہے، مختلف فقہاء اور مختلف محدثین نے اس اصول کو اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، اس میں کسی شیعہ، سنی، دیوبندی یا بریلوی کا کوئی اختلاف نہیں ہے، سارے مسلمان شریعت کے اس اصول پر متفق ہیں کہ جس چیز کے نقصان کی ادئیگی کے آپ ذمہ دار نہیں بنتے اس چیز پر آپ کو نفع لینے کا کوئی حق نہیں، اگر آپ کاروبار میں حصہ لے رہے ہیں تو آپ کو یہ خطر (رسک) انگیز کام کرنا پڑے گا کہ اگر آپ کا کاروبار ڈوب جائے تو اس کا سارا نقصان بقدر حصہ آپ خود برداشت کریں گے۔ اس صورت میں آپ اس کاروبار کا نفع بھی لے سکتے ہیں، جتنا نفع بھی آپ کو کھلی مارکٹ میں ملتا ہے وہ آپ لے لیجیے، لیکن یہ بات کہ آپ کا روپیہ محفوظ رہے اور وہ ہر صورت میں آپ کو واپس ملے چاہے کاروبار چلے یا نہ چلے یہ چیز شریعت کے مذکورہ بالا اصول کی وجہ سے نا قابل قبول ہے، یہ اصول شریعت میں بار بار بیان ہوا ہے، آپ نے سنا ہوگا بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ مولوی لوگ بڑے بے وقوف ہیں، کرایہ مکان کو تو جائز کہتے ہیں اور سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک جائیداد کسی کو کرایہ پر استعمال کے لیے دی جائے اور اس کا کرایہ وصول کیا جائے تو جس اصول کے تحت یہ کرایہ جائز ہے اس اصول کے تحت اگر کسی کو سرمایہ استعمال کے لیے دیا جائے تو اس کا کرایہ بھی جائز ہونا چاہیے، وہ آخر جائز کیوں ہے؟ یاد رہے کہ یہ مغالطہ غلط فہمی پر مبنی ہے یا بددیانتی پر، واضح ہونا چاہیے کہ کرایہ مکانات اور سرمایہ پر سود دونوں چیزیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ایک کو دوسرے پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ قرض اس چیز کا دیا جاسکتا ہے جس کی ذات کو خرچ (Consume) کیا جاسکے، جیسے روپیہ، پیسہ، سونا،

چاندی، گندم، چینی وغیرہ، اس کے برعکس جو چیزیں بار بار استعمال کرنے کی ہیں اور ایک ہی شخص ان کو بار بار استعمال کرتا ہے ان کو عاریتاً تو دیا جاسکتا ہے بطور قرض نہیں دیا جاسکتا، جیسے مکان، زمین، کار، کتاب، قلم اور استعمال کی دوسری چیزیں، لہٰذا سونے چاندی وغیرہ میں تو سود ہوسکتا ہے اس لیے کہ وہ بطور قرض دیے جاسکتے ہیں لیکن زمین جائیداد وغیرہ میں سود نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ وہ استعمال کے لیے تو دیے جاسکتے ہیں بطور قرض نہیں دیے جاسکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر جائیداد کسی زلزلہ یا کسی حادثہ میں ضائع ہوجائے یا اس کو نقصان پہنچ جائے تو وہ نقصان جائیداد کے مالک کا نقصان متصور ہوگا، کرایہ دار کا نقصان متصور نہیں ہوگا، اس کے برعکس جو شخص قرض پر روپیہ لے کر کاروبار کرتا ہے تو اگر کاروبار ڈوب جائے تو مقروض کو ہر حالت میں قرض خواہ کو سرمایہ واپس کرنا پڑے گا، اس لیے کہ یہاں اس روپیہ کا رسک روپیہ کے اصل مالک کا نہیں بلکہ کاروبار کرنے والے مقروض کے ذمہ ہے۔

تیسرا یہ کہ نقدی کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ اور استعمال نہیں ہے، اسے انسانی ضروریات پورا کرنے کے لیے بلاواسطہ استعمال نہیں کیا جاسکتا، اسے صرف کچھ سامان یا خدمات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس کے برعکس سامان کی اپنی افادیت ہوتی ہے، اسے ذریعۂ مبادلہ بنائے بغیر استعمال کرکے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

چوتھا یہ کہ اشیاء یا سامان مختلف اوصاف کے ہوسکتے ہیں، جبکہ نقدی میں اوصاف کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، نقدی کے تمام اجزاء برابر مالیت کے سمجھے جاتے ہیں، مثلاً ایک ہزار روپے کا میلا کچیلا اور پرانا نوٹ وہی مالیت رکھتا ہے جو کہ بالکل نیا نویلا ایک ہزار روپے کا نوٹ رکھتا ہے۔

پانچواں یہ کہ سامان کی خرید و فروخت کسی متعین اور شناخت شدہ چیز سے

متعلق ہوتی ہے، مثلاً زید بکر سے ایک کار اشارے کے ذریعہ متعین کر کے خریدتا ہے تو اب زید اسی کار کے لینے کا حقدار ہے جو اشارہ کر کے متعین کی گئی تھی، بیچنے والا اسے کوئی دوسری کار لینے پر مجبور نہیں کرسکتا، خواہ وہ ان ہی خصوصیات کی حامل ہے۔

اس کے برخلاف رقم کسی خرید وفروخت کے معاملے میں اشارے کے ذریعے متعین نہیں کی جاسکتی، مثلاً زید نے بکر سے ایک چیز ایک ہزار کا مخصوص نوٹ دکھلا کر خریدی، جب ایک ہزار کی ادائیگی کا وقت آیا تو اسے اختیار ہے کہ وہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ایک ہزار کا نوٹ بکر کو دیدے، لہٰذا دونوں صورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، شریعت کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔

٦) ایک اور اہم چیز جو ممکن ہے ماہرین معاشیات کو عجیب لگے اور نا قابل عمل قرار دی جائے لیکن بہرحال شریعت میں ایسا ہی ہے، دین سے معمولی واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی قرض سے پناہ مانگی ہے اور امت کو بھی یہی دعا مانگنے کی تعلیم دی ہے کہ اے اللہ قرض سے مجھے بچا، قرض کی ناپسندیدگی کا ہر جگہ اظہار کیا گیا ہے، اس لیے اسلام میں کاروبار کی بنیاد شراکت پر ہے قرض پر نہیں، اسلام میں تجارت پارٹیسیپیشن کی بنیاد پر ہے جس میں فریقین ایک معاہدہ کے مطابق کاروبار میں شریک ہوتے ہیں اور نفع نقصان دونوں میں شرکت کرتے ہیں قرض پر مبنی کاروبار اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، آج جتنا بھی سودی کاروبار ہے یہ سارا کا سارا مبنی بر قرض ہے، ایک شخص ۲۵ کروڑ روپے روزانہ نفع کما رہا ہے، لیکن اس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہے، بینکوں سے قرض لے رکھا ہے، اگر قرض ڈوب گیا تو بینکوں کے کھاتہ داروں کا سرمایہ ڈوب گیا اور بینک فیل ہوگیا، اب کھاتے دار روتے پھرتے ہیں اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، بی سی سی آئی (BCCI) اور ہمارے ملک کی

فائنانس کمپنیوں اورکوآپریٹو کمپنیوں کی دردناک مثالیں ہمارے سامنے ہیں، ان میں مالکان نے کروڑوں روپیہ کمایا ہے، یعنی نفع لینے کے لیے تیار تھے لیکن اگر کاروبار ڈوب جائے تو اس میں ان کا ذاتی نقصان کوئی نہیں بلکہ سارا نقصان فائنس کمپنی کے کھاتے میں ڈال کر خود پنجہ جھاڑ کر ایک طرف کھڑے ہوگیے اور کسی دوسری کمپنی کی داغ بیل ڈالنی شروع کر دی تا کہ یہی ڈرامہ دوبارہ دہرایا جائے ، یہ چیز شریعت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، شریعت جس قسم کا کاروبار جائز قرار دیتی ہے وہ مبنی بر قرض نہیں بلکہ مبنی بر مشارکت ہے۔(۱)

متفرع چند اہم مسائل

(۱) ایک لَپ گیہوں کی بیع دولپ کے عوض

ایک لَپ گیہوں کی بیع دولپ کے عوض جائز ہے؛ کیوں کہ یہ کیل نہیں، اسی طرح ایک سیب کی بیع دوسیب کے عوض جائز ہے؛ کیوں کہ سیب نہ کیلی ہے اور نہ وزنی ہے اس کا اعتبار عرف کے لحاظ سے ہوگا:

”منها لو باع حفنة طعام بحفنتين، أو تفاحة بتفاحتين يجوز لعدم الكيل والوزن“(۲)

(۲) سونا کے برتن کی بیع سونا کے عوض

سونا خواہ برتن کی شکل میں ہو یا زیور کی شکل میں، اسے سونے کے بدلے میں بیچا یا خریدا جائے تو برابری کے ساتھ نقد معاملہ کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا حرام ہے، لہٰذا اگر ایک طرف سونا کم ہے اور دوسری طرف زیادہ یا مبیع تو ابھی سپرد کر دیا، قیمت مجلس بدل کر دے رہا ہے تو یہ معاملہ جائز نہیں۔

---

(۱) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام: ۳۳-۳۹

(۲) الاختیار لتعلیل المختار: ۲/۲۷۶

(۳) نیے سونے کے عوض پرانے سونے کی بیع

نیے سونے کے بدلے میں پرانے سونے کی بیع بھی تفاضل اور ادھار کے ساتھ جائز نہیں، کیوں کہ نیا اور پرانا ہونا وصف ہے، وصف سے چیز کی اصلیت نہیں بدلتی۔ لقوله عليه السلام: "جيدها ورديئها سواء"(۱)

(۴) پرانے اور نیے لوہے کے برتن کی کمی بیشی کے ساتھ بیع

کمی بیشی کے ساتھ لوہے کے ٹوٹے ہویے برتن دے کر لوہے کا اچھا برتن لینا بھی سود ہے اور حرام ہے۔

(۵) پرانا بیس گرام کا زیور دے کر نیا دس گرام کا زیور لینا

سونے کے پرانے، ٹوٹے ہوئے بیس گرام کا زیور دے کر دس گرام کا نیا زیور لینا بھی سود ہے اور اگر دس گرام کے بدلے دس گرام کا زیور ہی دے رہا ہے؛ لیکن ادھار تب بھی یہ سود ہے اور حرام قطعی ہے۔

جواز کے لیے حیلہ کی شکل یہ ہے کہ پرانے زیور کو نیے کے بدلے نہ بیچا جائے؛ بلکہ پرانے زیور کو روپے کے ذریعہ بیچ دیا جائے پھر ان پیسوں سے نیا زیور خرید لیا جائے، یہ شکل جائز ہے:

"عن أبي سعيد قال: جاء بلال إلى النبي ﷺ بتمر برني فقال له النبي ﷺ: من أين هذا؟ قال: كان عندنا تمر ردي فبعت منه صاعين بصاع، فقال: أوه أوه، عين الربا عين الربا، لا تفعل ولكن إذا أردت أن تشتري فبع التمر ببيع آخر ثم اشتربه"(۲)

(۶) سونے چاندی کا زیور بطور قرض لینا

سونے چاندی کے زیورات بطور قرض یعنی بطور عاریت کے لے سکتا ہے، اس

---

(۱) رد المحتار، كتاب البيوع، باب الربا

(۲) صحیح البخاری، کتاب الوکالۃ

میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بیع نہیں، انتفاع ہے:

”ہو عقد مخصوص یرد علی دفع مال مثلی لآخر لیرد مثله وصح القرض فی مثلی لا فی غیرہ فیصح استقراض الدراهم والدنانیر“(۱)

(۷) سونے چاندی کو پیتل یا لوہے کے عوض بیچنا

سونے چاندی کو پیتل یا لوہے کے بدلے کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے؛ کیوں کہ جنس مختلف ہوگئی، اسی طرح ادھار بھی بیع جائز ہے۔

”وإن اشتری خاتم فضة أو خاتم ذہب فیه فص بکذا فلسا ولیست الفلوس عندہ فهو جائز تقابضا قبل التفرق أو لم یتقابضا؛ لأن هذا بیع ولیس بصرف“(۲)

(۸) نوٹ سے سونا چاندی خریدنا

نوٹ سے سونا چاندی خریدنا بلا اختلاف جائز ہے، یہ سود نہیں، بعض بزرگوں کا جو اختلاف بعض کتابوں میں منقول ہے کہ ہندوستانی روپے سے سونے چاندی کی بیع جائز نہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی روپے سونے چاندی کے روپیوں کی طرف منسوب ہوتے تھے، اب ایسا نہیں ہے، اس لیے حکم بھی وہ نہیں رہے گا۔ (۳) دوسری بات آج کل کاغذی نوٹ ثمن عرفی ہے، اس کے بدلہ میں ثمن خلقی (سونا چاندی) کمی بیشی کے ساتھ خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے:

”أن الأوراق النقدیة ثمن عرفی لیست ثمنا حقیقیا والربا

---

(۱) الرد مع الدر، فصل فی القرض، کتاب البیوع

(۲) المبسوط للسرخسی، باب البیع بالفلوس: ۱۴/ ۲۵

(۳) مستفاد از: مسائل سود، مؤلفہ مفتی حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی

يجري في الثمن الخلقي الذاتي۔۔۔الخ"(۱)

(۹) ایک چیز کواس کی غیر جنس سے لینا

اگر گیہوں دے کر مکئ، باجرہ وغیرہ لے رہا ہے تو کمی بیشی جائز ہے؛ لیکن ادھار ناجائز ہے، کیوں کہ یہ ساری چیزیں ناپ کر کے بیچی جاتی ہیں، جنس میں تفاوت کی وجہ سے کمی بیشی جائز ہے اور قدریت میں اتحاد کی وجہ سے ادھار بیع ناجائز ہوگی۔

"فحرم بيع كيلي ووزني بجنسه متفاضلا ولو غير مطعوم كجص وحديد، وإن وجد أحدهما أي القدر وحده أو الجنس حل الفضل وحرم النساء"(۲)

(۱۰) چھنے ہوئے آٹے کی بیع اس کے علاوہ سے

چھنے ہوئے آٹے کی بیع بے چھنے ہوئے آٹے کے بدلے کمی بیشی اور ادھار کے ساتھ ناجائز ہے؛ کیوں کہ جنسیت ایک ہی ہے۔

(۱۱) گیہوں کے بدلے آٹا لینا

گیہوں کے بدلے آٹا لینا ناجائز ہے، خواہ برابری کے ساتھ کیوں نہ ہو؛ کیوں کہ اگر کیل یا پیمانہ کے ذریعہ ہو تو اس لیے ناجائز ہے کہ آٹا کے اندر خلا نہیں ہوتا اور گیہوں کے اندر خلا ہوتا ہے، اس طرح لامحالہ آٹا زیادہ آئے گا، گیہوں کم اور اگر عرف کا اعتبار کرتے ہوئے وزن کے ساتھ بیچا جائے تو وزن میں برابری ہوسکتی ہے؛ البتہ آٹا تیار کرانے میں کمی واقع ہوگی؛ اس لیے کسی طور سے آٹے کی بیع گیہوں سے جائز نہیں، ہاں! اگر ایک طرف گیہوں ہے دوسری طرف جوار یا مکئ کا آٹا تو ہر طرح سے بیع جائز ہے، برابر بھی، کمی بیشی کے ساتھ بھی؛ البتہ ادھار جائز نہیں؛ کیوں کہ قدریت موجود ہے:

---

(۱) التبیان فی زکاۃ الأثمان بحوالہ مجلۃ فقہ الأکیڈمی

(۲) شامی، باب الربا

"لا یجوز بیع البر بدقیق أو سویق أي دقیق البر و سویقه مطلقا ولو متساویا، بخلاف دقیق الشعیر و سویقه فإنه لا یجوز لاختلاف الجنس"(۱)

(۱۲) ایک گوشت کا دوسرے گوشت سے تبادلہ

بطور خاص بقرعید کے موقع سے ایک گوشت کا تبادلہ دوسرے سے کیا جاتا ہے تو اس سلسلے میں بھی جنس اور قدر کو دیکھا جائے گا، چنانچہ بکری کا گوشت بکری کے گوشت کے عوض برابر برابر جائز اور کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہوگا۔

(۱۳) بکری کے گوشت کا تبادلہ گائے کے گوشت کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ

بکری کے گوشت کا تبادلہ گائے کے گوشت کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہوگا؛ کیوں کہ جنس مختلف ہوگئی، البتہ ادھار حرام ہوگا؛ کیوں کہ قدر موجود ہے۔

(۱۴) گائے کے گوشت سے بھینس کے گوشت کا تبادلہ

گائے کے گوشت سے بھینس کے گوشت کا تبادلہ برابری کے ساتھ جائز ہے، کمی بیشی کے ساتھ ناجائز؛ کیوں کہ بھینس اور گائے کی جنس ایک ہی ہے۔

(۱۵) بھیڑ اور بکری کے گوشت کا تبادلہ

بھیڑ اور بکری کے گوشت کا تبادلہ بھی برابری کے ساتھ جائز اور کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہے؛ کیوں کہ دونوں کی جنس ایک ہے:

"ویجوز بیع اللحمان المختلفة بعضها ببعض متفاضلا، ومراده لحم الإبل والبقرة والغنم، فأما البقر والجوامیس واحد، وكذا المعز من الضأن الخ"(۲)

(۱۶) ایک برتن کا تبادلہ دوسرے برتن کے ساتھ

المونیم کی پرانی دیگچی کا تبادلہ المونیم کی نئی دیگچی سے ناجائز ہے، اسی طرح پیتل

---

(۱) شامی، باب الربا (۲) ھدایہ، باب الربا

کی نئی دیگچی کا تبادلہ پیتل کی پرانی دیگچی یا برتن سے ناجائز ہے، البتہ ایک طرف پیتل کا برتن اور ایک طرف لوہے کا تو کمی بیشی جائز ہے، ادھار ناجائز ہے۔

(۱۷) گیہوں کے بدلے دھان کی بیع

گیہوں کے بدلے دھان کی بیع کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے؛ لیکن ادھار ناجائز ہے؛ کیوں کہ جنسیت مختلف ہوگئی، قدریت موجود ہے۔

(۱۸) سرسوں کے عوض اس کے تیل کا تبادلہ

سرسوں کے عوض اس کا تیل لینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر سرسوں سے تیل کی بقدر تیل برآمد ہونے کا یقین حاصل ہو تو بالا جماع تبادلہ درست ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ اندازہ کر کر کے سرسوں کا تیل زائد دے گا، اس صورت میں کھلی کا زائد تیل کھلی سے ہو جائے گا اور تیل کا تیل سے، تیل نکالنے والوں کو اندازہ رہتا ہے کہ کتنے کیلو میں کتنا تیل نکلتا ہے اور اگر شک وشبہ ہو تو تبادلہ جائز نہیں۔

"ولا بيع الزيتون بالزيت والسمسم بالشيرج حتى يكون الزيت والشيرج أكثر مما في الزيتون والسمسم"(۱)

(۱۹) روٹی کے عوض آٹا

روٹی کے عوض آٹا کی بیع مفتی بہ قول کے مطابق کمی بیشی اور ادھار کے ساتھ جائز ہے؛ کیوں کہ روٹی عددی چیز ہے، نہ تو جنسیت ہے یہاں اور نہ قدریت ہے:

"وبيع الحنطة بالخبر والخبر بالحنطة وبيع الخبز بالدقيق والدقيق بالخبز قال بعضهم: يجوز متساويا ومتفاضلا وعليه الفتوى"(۲)

(۲۰) گیہوں یا آٹے کے عوض سبزی لینا

آٹے کے عوض سبزی لینا جائز ہے، کمی بیشی کے ساتھ، مثلاً دو کیلو آٹا دے کر تین کیلو سبزی لینا جائز ہے؛ لیکن ادھار ناجائز ہے؛ کیوں کہ جنس الگ الگ ہے؛

---

(۱) مجمع الأنہر، باب الربا (۲) الفتاوی الہندیۃ، باب الربا

اس لیے کمی بیشی جائز ہے، چوں کہ قدر موجود ہے؛ اس لیے ادھار نا جائز ہے:

”وعلته أي علة تحريم الزيادة القدر مع الجنس، فإن وجدا حرم الفضل والنسأ وإن علم أحدا۔۔۔ وإن وجد أحدہما أی القدر وحده أو الجنس حل الفضل وحرم النسأ“(۱)

(۲۱) گن کر یا گز سے ناپ کر بیچی جانے والی چیزیں

جو چیزیں گز سے ناپ کر بکتی ہیں، جیسے: کپڑا وغیرہ یا گن کر بکتی ہیں، جیسے: انڈے وغیرہ تو ایک گز کپڑے کی بیع دو گز کے عوض، پانچ انڈے کا تبادلہ دس انڈے سے جائز ہے، البتہ ادھار نا جائز ہے؛ کیوں کہ جنسیت پائی جارہی ہے اور اگر انڈے کی بیع کپڑے سے ہو تو ادھار جائز ہے؛ کیوں کہ قدر اور جنس دونوں مفقود ہوگئیں۔

”وإن وجد أحدهما أي القدر وحده كالحنطة بالشعير أو الجنس وحده كالهروى بهروى مثله حل الفضل وحرم النسأ“ (۲)

(۲۲) ایک زمین کا دوسری زمین سے تبادلہ کرنا

ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ ہم کو فلاں زمین بونے کے لیے دے دو اور اس کے بدلے ہماری زمین میں تم بویا کرو اور ان زمینوں کا کرایہ یہی (ایک زمین کا دوسری زمین سے تبادلہ) قرار پائے تو یہ معاملہ درست نہیں ہے، اگر ایسا معاملہ کرنا ہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ دونوں زمینوں کا کرایہ برابر امقدار میں ایک خاص رقم مقرر کرے اور چوں کہ دونوں زمینوں کا کرایہ برابر مقرر کیا گیا ہے؛ اس لیے رقم کے مساوی ہونے کی وجہ سے کرائے کی دونوں مقدار باہم مجرا ہو جائے گا، نہ لینا پڑے گا نہ دینا پڑے۔

---

(۱) شامی، باب الرب

(۲) شامی، باب الربا۔

(۲۳) ایک گھر کے عوض دوسرا گھر یا ایک سواری کے عوض دوسری سواری

اسی طرح (گزشتہ مسئلہ کی طرح) ایک گھر میں دوسرے گھر کے عوض رہنا یا ایک سواری کے عوض دوسری سواری کا استعمال کرنا یہ بھی جائز نہیں، ہاں! مناسب کرایہ مقرر کر کے دونوں کے کرائے کا تبادلہ سے ان چیزوں کا استعمال جائز ہوجائے گا۔(۱)

بیع میں سود کی بعض شکلیں

- اگر بیع مقایضہ میں دونوں بدل اموال رِبویہ ہوں، جیسے کہ دونوں قدر اور جنس میں متحد ہوں (یعنی دونوں کیلی ہوں یا دونوں وزنی ہوں اور ہم جنس کے عوض بیع ہو) تو دونوں چیزیں مقدار یعنی کیل اور وزن میں برابر (مساوی) ہونا ضروری ہیں۔ نیز بیع کا نقد ہونا بھی ضروری ہے۔
- اگر بدلین میں کمی زیادتی سے عقد کیا گیا، جیسے ایک کیلو گوشت، اسی جنس کے ڈیڑھ کیلو گوشت کے عوض فروخت کیا جائے، یا ایک لیٹر پٹرول، ڈیڑھ لیٹر پٹرول کے عوض فروخت کیا جائے تو یہ ''ربائے فضل'' ہونے کی وجہ سے درست نہ ہوگا۔
- اسی طرح اگر ایک کیلو گوشت، اسی جنس کے ایک کیلو گوشت کے عوض فروخت کیا جائے اور دونوں میں سے ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو یا ایک لیٹر پٹرول، دوسرے ایک لیٹر کے عوض فروخت کیا جائے اور ایک نقد اور دوسرا ادھار ہو تو ربائے نسیہ ہونے کی وجہ سے یہ بھی جائز نہ ہوگا۔
- یکساں پیمانہ تقدیر رکھنے والی اشیاء دوسری (مختلف) جنس کے عوض فروخت کی جائیں، مثلاً گندم جو کے عوض بیچے جائیں تو مقدار میں کمی بیشی جائز ہے، البتہ ادھار معاملہ کرنا درست نہ ہوگا، بلکہ نقد معاملہ کرنا ضروری ہوگا۔

---

(۱) مروجہ سودی معاملات نقل وعقل کی روشنی میں، ص:۶۱-۶۶، ۱۰۰

- عددی اشیاء یا پیمائش سے بیچی جانے والی چیزیں اپنی ہم جنس کے عوض فروخت کی جائیں تو کمی بیشی جائز ہے، مثلاً ایک کتاب دو کتابوں کے عوض بیچی جائے یا ایک کپڑا بمقابل دو کپڑوں کے فروخت کیا جائے تو یہ جائز ہے، البتہ ادھار معاملہ درست نہ ہوگا۔
- مذکورہ احکام میں ہم جنس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں چیزیں نام، اصلیت، حقیقت اور مقصد کے اعتبار سے یکساں ہوں، نیز ایک ساخت میں دوسرے سے بڑھ کر کام کیا گیا نہ ہو۔ لہٰذا اگر دونوں کی ماہیت الگ ہو مثلاً گندم اور جو یا دونوں چیزیں اصلاً جداگانہ ہو مثلاً انگور کا سرکہ، کھجور کا سرکہ، یا مقصد میں فرق ہو جیسے بکری کے بال اور بھیڑ کا اون، یا کسی ایک میں دوسرے کی بہ نسبت زیادہ محنت لگی ہو جیسے روٹی اور آٹا، یا بناوٹ اور ساخت میں تفاوت ہو جیسے: جاپانی کپڑا اور انگلش کپڑا، تو ایسی چیزیں باہم مختلف الجنس سمجھی جائیں گی۔
- کیل اور وزن میں ہر زمان ومکان میں رائج عرف کا اعتبار ہوگا، جیسے کہ گندم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں کیلی تھی اور موجودہ عرف میں وزنی ہے، اس لیے اب وزنی سمجھے جائیں گے۔
- ایسی وزنی اشیاء جن کے وزن کرنے کا پیمانہ اور آلہ الگ ہو، جیسے لوہا تولنے کا آلہ سونا تولنے کے آلہ سے الگ ہوتا ہے، تو ایسی اشیاء متحد فی القدر (یکساں پیمانۂ تقدیر والی چیزین) نہیں سمجھی جائیں گی۔
- اموال رِبویہ (قدر اور جنس میں متحد دو چیزوں کی بیع) میں اٹکل سے معاملہ کرنا درست نہیں کیونکہ کمی بیشی کا احتمال ہے۔
- مبیع ربوی اور غیر ربوی مال سے مخلوط ہو اور ثمن خالص ربوی ہو، مثلاً مبیع سونے کا ایسا زیور ہے جس پر دوسری دھات کی کڑھائی ہے (یا جیسے کہ موتیوں والا سونے کا ہار) جسے فقط سونے کے عوض فروخت کیا جائے تو بیع جائز ہونے کی شرط یہ ہے

کہ ثمن کے خالص سونے کے وزن کا مرکب مبیع کے سونے سے زیادہ ہو؛ تا کہ دونوں طرف کے سونے کا معاملہ برابر ہو جائے، اور خالص سونے کی زیادتی مبیع کے اس حصے کا عوض بن سکے جو سونے کے علاوہ ہے، خالص سونا، مرکب مبیع کے سونے کے بقدر یا اس سے کم ہو تو بیع جائز نہ ہوگی۔(۱)

(۱) اسلامی قانونِ خرید وفروخت:۶۱-۶۳

بینک اوراس کے متعلقات

بینک کی تعریف

لفظ بینک (Bank) اٹلی زبان کے لفظ (Banco) سے ماخوذ ہے، جس کا معنی اٹلی زبان میں ڈسک (Desk) یا ٹیبل (Table) کے ہے، چوں کہ اس زمانہ میں روپیہ کے اس طرح کے کاروبار کرنے والے ڈسک یا ٹیبل لگا کر بیٹھتے تھے، اس لیے اس کا نام بینک مشہور ہوگیا۔

کاروباری اصطلاح میں بینک ایک ایسے تجارتی ادارہ کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعتکاروں اور دیگر ضرورت مند افراد کو قرض فراہم کرتا ہے، آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں اور اپنے امانت داروں کو کم شرح پر سود دیتے ہیں اور سود کا درمیانی فرق بینک کا نفع ہوتا ہے۔(۱)

بینک کا تاریخی پس منظر

مغربی ملکوں میں اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ لوگ اپنا سونا سناروں کے پاس بطور امانت رکھتے تھے اور سنار اس کی رسید لکھ دیتے تھے، جس میں یہ صراحت ہوتی تھی کہ رسید بردار کا اتنا سونا فلاں سنار کے پاس محفوظ ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ رسیدیں خرید وفروخت اور قرضوں کی ادئیگی اور آپسی لین دین میں ایک آدمی سے دوسرے آدمی کی

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے، ص:۵۲

طرف منتقل ہونے لگیں، جب سناروں کو تجربہ ہوا کہ لوگ اپنے سونے میں بمشکل دسواں حصہ نکلواتے ہیں باقی نو حصے ان کی تجوریوں میں بیکار پڑے رہتے ہیں، نیز لوگ عموماً رسیدوں ہی سے معاملات کرتے ہیں، اور سونا واپس نہیں لیتے، اس لیے سناروں نے نو حصوں کی قوت پر نوے حصوں کی جعلی رسیدیں بنا کر زر کاغذی کی حیثیت سے چلانی اور قرض دینی شروع کردیں۔

پھر انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، جو لوگ اپنا سرمایہ کاروبار میں لگا رہے ہیں ان سے کہا کہ آپ لوگ اس زحمت میں نہ پڑیں، جس میں حساب وکتاب، نقصان کے خطرات سب کچھ الجھن اور زحمت ہے، اس کے بجائے آپ اپنی رقمیں ہمارے پاس جمع کرائیے، ہم اس کی حفاظت بھی کریں گے، ان کا حساب بھی مفت رکھیں گے، اور آپ سے کچھ لینے کے بجائے الٹا آپ کو سود دیں گے، اس نئی چال سے 90 فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ پس انداز رقمیں براہ راست معیشت وتمدن کی طرف جانے کے بجائے ساہوکاروں کے قبضۂ تصرف میں چلی گئی، اب ان ساہوکاروں نے اپنے سرمایہ کے ساتھ دوسروں کا سرمایہ بھی سستی شرح سود پر لے کر زیادہ شرح سود پر قرض دینا شروع کردیا۔

پھر اس کے بعد اس گروہ نے تیسرا قدم بڑھایا، اس نے سوچا کہ جس طرح کاروبار کے سارے شعبوں میں مشترک سرمائے کی کمپنیاں بن رہی ہیں، روپے کے کاروبار کی بھی کمپنیاں بنائی جائیں اور بڑے پیمانے پر ان کی تنظیم کی جائے، اس طرح یہ بینک وجود میں آئے جو آج تمام دنیا کے نظام مالیات پر قابض ومتصرف ہیں۔

دنیا کا پہلا بینک

دنیا کا پہلا بینک شہر وینس میں ۱۱۵۷ء کو (Banacodella Pizzadi Riaalro) کے نام سے وجود میں آیا، پھر اس کے بعد ۱۴۰۱ء کو شہر ''بارسلونا'' میں امانت جمع کرنے والا بینک قائم کیا گیا، اور اس کے بعد پھر بینک کا سلسلہ پوری دنیا میں

رائج ہوگیا۔(۱)

بینک کا قیام

بینک بنیادی طور پر جوائنٹ اسٹاک کمیٹی (Joint Stock Compony) ہے، بینک لوگوں کو اپنی امانتیں جمع کرانے کی دعوت دیتا ہے، جسے انگریزی میں ڈپازٹ (Deposit) کہتے ہیں اور ڈپازٹ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔

ڈپازٹ کی قسمیں

(۱) کرنٹ اکاؤنٹ:(Current Account)

اس میں رکھی رقم پر سود نہیں ملتا، اس اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم کسی بھی وقت، جتنی مقدار میں چاہیں بغیر کسی پابندی کے نکلوائی جاسکتی ہے۔

چنانچہ کھاتہ دار (اکاؤنٹ ہولڈر) کو مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اور جتنی چاہے اپنی رقم بینک سے نکلوالے، اور بینک اس کا پابند ہوتا ہے کہ وہ اس کے مطالبہ کرنے پر فی الفور رقم واپس کردے، اور اکاؤنٹ ہولڈر اس بات کا پابند نہیں ہوتا کہ بینک سے رقم نکلوانے سے پہلے بینک کو پیشگی اطلاع دے۔ اس قسم کے اکاؤنٹ ہولڈر کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا، بلکہ بعض ممالک میں تو یہ طریقہ رائج ہے کہ بینک الٹا اکاؤنٹ ہولڈر سے اپنی خدمات کے بدلے میں فیس کا مطالبہ کرتا ہے۔ البتہ اس اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقم کو علیحدہ نہیں رکھا جاتا، بلکہ دوسری رقموں کے ساتھ ملادیا جاتا ہے، اور بینک کو اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ اس اکاؤنٹ میں رکھی گئی رقم کو اپنی ضروریات میں خرچ کرے، اگرچہ بینکوں کا معمول یہ ہے کہ اس اکاؤنٹ میں رکھوائی گئی رقم کا ایک متناسب حصہ اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں تاکہ اکاؤنٹ ہولڈر جب بھی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے تو اس کو ادا کی جاسکے۔

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے، ص:۵۶،۵۲ بحوالہ موقف الشریعۃ من المصلف المعاصرۃ ص، ۲۲، ۲۳

(۲) بچت کھاتہ (Saving Account)

اس میں رقم نکلوانے پر عموماً مختلف پابندیاں ہوتی ہیں۔ اس پر بینک سود دیتا ہے۔

اس اکاؤنٹ میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے، اس کی کوئی مدت مقرر نہیں ہوتی، لیکن اکاؤنٹ ہولڈر قواعد اور ضوابط کے تحت ہی رقم نکلوا سکتا ہے، چنانچہ وہ ایک ہی مرتبہ میں تمام رقم نکلوانے کا اختیار نہیں رکھتا، بلکہ بینک اس کے لیے ایک مقدار مقرر کرتا ہے کہ ایک دن میں بس ایک مقدار تک رقم نکلوانے کا اختیار ہے، اور بعض اوقات بڑی رقم نکلوانے کے لئے بینک کو پیشگی اطلاع دینی ضروری ہوتی ہے۔ اس اکاؤنٹ میں رکھی جانی والی رقم ایک طرح سے کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم کی طرح ہوتی ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کسی معینہ مدت کے انتظار کے بغیر جب چاہے رقم نکلوالے۔ اور ایک طرح سے فکس ڈپازٹ کی طرح ہوتی ہے کہ تمام رقم ایک مرتبہ میں نہیں نکالی جاسکتی۔ اور بینک اس اکاؤنٹ میں رکھی جانی والی رقم پر کچھ منافع بھی دیتا ہے البتہ فکس ڈیپازٹ کے مقابلے میں اس کا نفع کم ہوتا ہے۔

(۳) فکسڈ ڈپازٹ (Fixed Deposit)

اس میں مقررہ مدت سے پہلے رقم واپس نہیں لی جاسکتی ہے، اس میں بھی بینک سود دیتا ہے، اور سود کی شرح مدت کے مطابق ہوتی ہے، طویل مدت میں شرح سود زیادہ ہوتی ہے اور کم مدت پر شرح کم ہوتی ہے۔ اور بینک یہ رقوم سرمایہ کاری کے اندر استعمال کرتا ہے۔

جب مذکورہ تینوں قسم کے ڈپازٹ سے بینک کے پاس سرمایہ جمع ہوتا ہے اور کچھ بینک کا ابتدائی سرمایہ بھی ہوتا ہے، تو ان تمام سرمائے کو استعمال کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس سرمائے کا ایک مقررہ حصہ سیال شکل میں ریزرو بینک کے پاس جمع کرانا ضروری ہوتا ہے، ریزرو بینک میں یہ سرمایہ عموماً ایسے سرکاری تمسکات (Governemnt Secorities) کی شکل میں رہتا ہے جو بآسانی نقد میں تبدیل کیے جاسکیں اور ان پر

کچھ سود بھی ملتا رہے پھر بینک کچھ سیال سرمایہ (Lizuit money) اپنے پاس بھی رکھتا ہے تاکہ ڈپازٹیر کے مطالبات پورے کر سکے۔

(۴) لاکرز (Lockers)

اس کو عربی زبان میں ''خزانة المقفولة'' (بند تجوری) کہا جاتا ہے۔ ایک شخص بینک کے اندر کسی مخصوص تجوری کو کرایہ پر لیتا ہے اور اس تجوری میں وہ خود اپنی رقم رکھتا ہے، اس رقم سے بینک کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ بینک کے ملازمین کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس نے تجوری کے اندر کیا رکھا ہے۔ عام طور پر لوگ اس تجوری میں سونا، چاندی، قیمتی پتھر اور قیمتی دستاویزات رکھتے ہیں۔ البتہ نقد رقم بھی اس تجوری میں رکھی جاسکتی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شخص ''لاکرز'' کو بینک سے کرایہ پر حاصل کرتا ہے اور دونوں کے درمیان کرایہ داری کا معاملہ طے ہوتا ہے، اور کرایہ داری کے معاہدے کے بعد وہ لاکرز بینک کے پاس ہی بطور امانت کے موجود رہتا ہے لہذا اس پر ''امانت'' کے احکام نافذ ہوں گے۔

مذکورہ چار قسموں میں رقم رکھوانے کا حکم

موجودہ بینک کی مذکورہ چاروں قسموں میں رقم رکھوانا جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب سے پہلے اس میں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ بینک میں جمع کی ہوئی رقم کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ کیونکہ ان کے بارے میں تمام شرعی احکام ان کی فقہی حیثیت متعین ہونے پر موقوف ہے، جہاں تک چوتھی قسم یعنی لاکرز کا تعلق ہے تو اسکے اندر کوئی شبہ نہیں کہ وہ شخص لاکرز کو بینک سے کرایہ پر حاصل کرتا ہے اور دونوں کے درمیان کرایہ داری کا معاملہ طے ہوتا ہے اور کرایہ داری کے معاہدے کے بعد وہ لاکرز بینک کے پاس بطورِ امانت کے موجود رہتا ہے، لہٰذا اس پر امانت کے احکام جاری ہوں گے، اور جہاں تک ''فکس ڈپازٹ'' اور ''سیونگ اکاؤنٹ'' کی بات ہے سود کی شکل ظاہرا یا حکما ہوتی ہے تو چونکہ بینک ان دونوں کھاتوں میں جمع کرانے والوں کی ان کی رقم کو استعمال میں لاتا ہے

بطور قرض دوسروں کو دیتا ہے اور اس پر منافع بھی دیتا ہے؛ لہٰذا بینک میں رکھائی ہوئی رقم قرض ہوگی اور بینک ان کھاتے داروں کو جو بھی رقم دے گا وہ سود ہوگی، بس جو شخص بھی ان دونوں اکاؤنٹ میں رقم جمع کرائے گا بینک کے ساتھ سودی معاملہ کرنے والا ہوگا، لہٰذا کسی مسلمان کے لیے مندرجہ بالا دونوں اکاؤنٹس میں رقم رکھوانا عام حالات میں جائز نہیں، اب رہ گیا ''کرنٹ اکاؤنٹ'' کا حکم تو پہلے یہ بات بیان کی جا چکی کہ اس کھاتہ دار کو بینک کوئی زائد رقم نہیں دیتا، لہٰذا اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے سے سودی معاملہ میں داخل ہونا لازم نہیں آئے گا، لیکن بعض حضرات نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ اگرچہ اس معاملہ میں سودی معاہدہ میں داخل ہونا لازم نہیں آتا؛ لیکن سودی معاملات میں بینک کے ساتھ اعانت تو پائی جا رہی ہے اس لیے کہ اس اکاؤنٹ میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس کو بینک منجمد کر کے نہیں رکھتا؛ بلکہ بینک اس کو بھی سودی قرض میں دیکر اس سے منافع حاصل کرتا ہے، لہٰذا رقم رکھنے والا بینک کے ساتھ سودی معاملات میں معاون شمار ہوگا، اور یہ صرف کرنٹ اکاؤنٹ کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ فکس ڈپازٹ، سیونگ اکاؤنٹ، اور لاکرز میں اپنے پیسے رکھوانے پر بھی بہر صورت تعاون لازم آئے گا۔(۱)

بینک کی قسمیں (باعتبار تمویل)

بینک کی کئی قسمیں ہیں، بعض بینک خاص شعبوں میں تمویل کرتے ہیں اور بعض عمومی تمویل کرتے ہیں، اس طرح بینک کی درج ذیل قسمیں ہیں۔

۱) زرعی بینک (Agricultural Bank) یہ بینک زراعت کے شعبہ میں قرض فراہم کرتا ہے۔

۲) صنعتی بینک (Industrail Bank) اس کا کام صنعتی ترقی کے لیے قرضے فراہم کرنا ہے۔

۳) ترقیاتی بینک (Development Bank) جو کسی بھی شعبہ میں ترقیاتی

---

(۱) مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۵/۲۰۷، بینک کا سود حلال ہے، ص: ۵۵ تا ۶۰

کاموں کے لیے قرضے دیتا ہے۔

۴) کوآپرٹیو بینک (Co-Operative Bank) یہ بینک امداد باہمی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، اس کا دائرہ کار ممبران تک محدود ہوتا ہے، جو لوگ اس کے ممبر ہوتے ہیں، ان ہی کے ڈپازٹ ہوتے ہیں اور ان ہی کو قرض دیا جاتا ہے۔

۵) استثماری بینک (Invesment Bank) اس میں ڈپازٹ متعینہ مدت کے لیے ہوتے ہیں، عام کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ اس میں نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈپازٹ (Fixed Diposit) ہوتے ہیں اور قرضے بھی محدود مدت کے لیے جاری کیے جاتے ہیں، اس سے کم مدت کے لیے قرضے نہیں دیے جاتے۔

مذکورہ پانچوں بینکوں کا دائرہ کار محدود ہوتا ہے۔

۶) کمرشیل بینک (Commercial Bank) جو بینک عمومی تمویل کا کام کرتے ہیں اور کسی شعبہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے۔

۷) ریزرو بینک (Reserve Bank) یہ ملک کا انتہائی اہم ادارہ ہوتا ہے جو تمام تجارتی بینکوں کا نگران ہوتا ہے، ملک کے مالیاتی نظام میں اس کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، اس بینک کے درج ذیل وظائف ہوتے ہیں:

۱) یہ حکومت کا بینک ہوتا ہے، حکومت کی رقمیں اس میں جمع رکھی جاتی ہیں، مگر حکومت کی رقموں پر یہ بینک حکومت کو سود نہیں دیتا، اور بوقت ضرورت حکومت کو قرضہ بھی دیتا ہے، اور اس سے معمولی شرح پر سود بھی لیتا ہے۔

۲) ریزرو بینک حکومت کا معاشی پالیسیوں میں مشیر بھی ہوتا ہے۔

۳) ریزرو بینک زر مبادلہ کو محفوظ رکھتا ہے، اس کو ذخیرہ کرتا ہے اور بوقت ضرورت اس کا اجراء بھی کرتا ہے۔

۴) ریزرو بینک کے سب سے اہم کردار دو ہیں، ایک یہ کہ تمام تجارتی بینکوں کی نگرانی کرتا ہے اور ان کا نظم وضبط برقرار رکھتا ہے تاکہ ان سے مالیاتی فوائد حاصل ہوں اور نقصانات کے پہلو کا سد باب ہو۔

دوسرا یہ کہ یہ بینک ملک میں زر کے بہاؤ کو کنٹرول کرتا ہے، اگر ملک میں افراط زر زیادہ ہو تو ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے زر سکڑنا شروع ہو جائے اور اگر تفریط زر کی صورت حال ہو، تو ایسے کام کرے جس سے زر کا پھیلاؤ بڑھے، زر کو پھیلانے اور سکڑنے کے لیے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔

۸) بینک کی آٹھویں قسم عالمی مالیاتی فنڈ (Internatinol monetory fund) جسے مختصراً (IMF) بھی کہتے ہیں یہ ۱۹۴۸ء میں وجود میں آیا، جس طرح ایک ملک کے کئی بینکوں کا ایک مرکزی بینک ''ریزرو بینک'' ہوتا ہے، ایسے ہی کئی ملکوں کے ریزرو بینکوں کا مرکزی بینک یہ ادارہ ہوتا ہے، گویا یہ پوری دنیا کا ایک مرکزی بینک ہے جو وقتی ادائیگی کے لیے ملکوں کو قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے، کبھی کسی ملک کی مالی حالت تو مستحکم ہوتی ہے، مگر وقتی طور پر کسی تجارت کی ادائیگی کے لیے نقد پیسے اس کے پاس نہیں ہوتے، ایسے موقع پر یہ ادارہ قرضہ فراہم کرتا ہے۔

اس ادارہ میں ہر ملک کا ایک کوٹہ (Quota) ہوتا ہے، یہ کوٹا اس ملک کی تجارت کا عالمی تجارت کے ساتھ تناسب دیکھ کر مقرر کیا جاتا ہے، مثلاً عالمی تجارت ایک ارب ڈالر کی ہوئی اور کسی ملک کی تجارت پانچ کروڑ ڈالر کی ہے، تو اس ملک کو پانچ فیصد کوٹا ملے گا، ہر ملک اپنے کوٹے کا 25٪ سونے میں 75٪ فیصد اپنے ملک کی کرنسی میں اس ادارے کے پاس جمع کراتا ہے، اس طرح (IMF) کے پاس کچھ سونا اور تمام ملکوں کی کرنسیاں جمع ہو جاتی ہیں، ہر ملک کو

(IMF) میں فنڈ جمع کرانے پر ادارہ سے قرض لینے کا حق ملتا ہے، جسے انگریزی میں (Drawing Rights) کہتے ہیں، پھر (Drawing Rights) پر جو قرضہ ملتا ہے، اس کو کئی حصوں میں تقسیم کرلیا جاتا ہے، ہر حصہ کو (Tranche) کہتے ہیں، پہلی ٹرانچ اس کا قرضہ 25٪ فیصد ہوتا ہے جو بلا کسی شرط کے ملتا ہے اور سود بھی کم ہوتا ہے، اس کے بعد والی ٹرانچوں میں شرائط اور پابندیاں بھی زیادہ اور اسی تناسب سے سود بھی بڑھتا جاتا ہے۔

۹) عالمی بینک (International Bank Of Reconstration and Development) پہلے اس کا پورا نام یہی تھا مگر اب اس کا مختصر نام (World Bank) ہے اور اب اسی نام سے مشہور ہے، اس ادارہ میں اور (IMF) میں فرق یہ ہے کہ (IMF) قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے، جس کی مدت تین سے پانچ سال تک ہوتی ہے، اور ورلڈ بینک طویل المیعاد قرضے دیتا ہے جس کی مدت پندرہ سے تیس سال ہوتی ہے، ابتداء میں اس ادارہ نے مشروعات (Projects) کے لیے قرضے دیے، لیکن اب یہ ادارہ پالیسی ساز قرضے دیتا ہے، یعنی یوں شرط رکھتا ہے کہ اگر تم اپنے ملک کی پالیسی اس طرز کی بناؤ تو اتنا قرضہ ملے گا اور اس طرز کی بناؤ تو اس سے زیادہ ملے گا۔(۱)

بینک میں اکاؤنٹ کھولنا

بینک میں روپیہ جمع کرنے سے ایک سودی ادارہ کا تعاون ہوتا ہے اور اسے تقویت حاصل ہوتی ہے، گناہ کے کاموں کا ارتکاب ہی گناہ اور مذموم نہیں بلکہ اس میں معاون اور تقویت کا باعث بننا بھی حرام ہے، البتہ بینک میں روپیہ رکھنے کا مقصد صرف سود حاصل کرنا ہی نہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کا مقصد روپیہ کی حفاظت ونگہداشت بھی ہوتی ہے، چنانچہ بعض فقہی نظائر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امر معصیت میں تعاون اس

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے، ص:۵۵ تا ۵۹

وقت گناہ بن جاتا ہے جب وہ ایسی نیت سے کیا جائے۔علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ:

لا بأس بأن یواجر المسلم دارا من الذمی یسکنها ؛ فان شرب فیها الخمر أو عبد فیها الصلیب أو أدخل فیها الخنزیر لم یلحق للمسلم اثم فی شیئی من ذلك (۱)

اگر کسی واقعی ضرورت کی بناء پر رکھا جائے مثلاً یہ کہ صحیح طور پر نگہداشت ہوسکے، املاک کو غبن سے بچایا جائے، کسی خاص ٹیکس سے بچایا جائے، کوئی قانونی ضرورت در پیش ہو تو بینک میں جمع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بلا ضرورت بینک میں رکھنا، چاہے سودی ادارہ کا تعاون مقصود نہ ہو، کراہت سے خالی نہ ہوگا۔۔۔۔پھر یہ رقوم کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھنا چاہیے اور انکم ٹیکس وغیرہ سے بچنے کی مخصوص صورت کے سوا عام حالات میں فکسڈ ڈپازٹ میں بھی رکھنا جائز نہیں۔(۲)

مفتی سلمان منصور پوری صاحب لکھتے ہیں چونکہ بینک کے اکثر معاملات سودی ہوتے ہیں لہٰذا بغیر کسی مجبوری کے بینک میں روپے جمع کرانا جائز نہیں۔(۳) اور یہی فتویٰ احسن الفتاویٰ اور فتاویٰ محمودیہ میں بھی ہے۔

الغرض شریعت نے اموال کی حفاظت کو منع نہیں کیا ؛ بلکہ اموال کی حفاظت یہ مقاصدِ شریعت میں سے ہے، چوں کہ اسلامک بینکنگ نظام کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے سودی بینک ہی میں اپنے اموال کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے، البتہ اگر کسی ملک میں اسلامی بینکنگ کا رواج ہے تو پھر وہاں سودی بینکوں میں اموال محفوظ نہیں کیے جاسکتے۔

اس حوالے سے مولانا یوسف صاحب لدھیانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ بینک میں رقم جمع کرانا سود میں اعانت تو بلاشبہ ہے، مگر اس زمانے میں بڑی رقم کی حفاظت بینک

---

(۱) المبسوط:۱۶/۳۰۹

(۲) جدید فقہی مسائل:۱/۲۸۴، منتخب نظام الفتاویٰ:۱/۲۰۲

(۳) کتاب النوازل:۱۱/۲۸۳

کے بغیر دشوار ہے اس لیے بامر مجبوری جمع کروانا جائز ہے، اور اگر لاکر میں رقم رکھوائی جائے تو بہت اچھا ہے۔(۱)

کونسا اکاؤنٹ کھولے؟

یہ بات گزر چکی کہ اول تو بینک میں پیسہ رکھنا ہی نہیں چاہیے جس میں سودی کاروبار ہوتا ہے جو اعانت علی المعصیۃ کے قبیل سے ہے، لیکن حفاظت کی غرض سے اگر رکھنا ہی مقصود ہے تو کرنٹ اکاؤنٹ میں پیسہ رکھوائے جس پر سود نہیں لگتا، اوراس حوالے سے مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ: اگر بینک میں رقم رکھوانی ہو تو یا تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھوانی چاہیے، جس پر سود نہیں دیا جاتا یا اپنے اکاؤنٹ کے ساتھ بینک کو لکھ دینا چاہیے کہ میری رقم پر سود نہ لگایا جائے، آئندہ آپ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کریں، البتہ جو رقم آپ کے اکاؤنٹ جمع ہوگئی ہے اسے کسی غریب کو صدقہ کر سکتے ہیں، نیت اس میں مال حرام سے جان چھڑانے کی ہو،(۲) لیکن اگر کرنٹ اکاؤنٹ میں پیسہ رکھوانا مشکل ہو یا دشواریاں پیش آسکتی ہو یا اس کے شرائط کا لحاظ کرنا مشکل ہو جائے تو سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) کھولنے کی علماء نے گنجائش دی ہے، البتہ جو سودی پیسہ جمع ہوگا اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہوگا۔

سود حاصل کرنے کے لیے بینک میں رقم جمع کرنا

سودی رقم حاصل کرنے کی نیت سے بینک میں رقم جمع کرنا ناجائز اور حرام ہے اور بنص حدیث مستحقِ لعنت ہے اگرچہ سودی رقم سے غریبوں کی مدد کرنا مقصود ہو؛ بلکہ سودی رقم غریبوں کو دیتے وقت اگر ثواب کا ارادہ کیا جائے تو ایمان کے چلے جانے کا خطرہ ہے؛ کیوں کہ حرام چیز سے ثواب کی امید حرام کو حلال سمجھنے کے مرادف ہے جو بہت خطرناک ہے، اس لیے غریبوں کی مدد کی نیت سے سودی رقم حاصل کرنے کے لیے بینک

---

(۱) آپ کے مسائل اوران کا حل: ۱/ ۳۳۱

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۲۷۶، بحوالہ احکام مال حرام: ۴۷

میں رقم جمع کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

رجل دفع الی فقیر من المال الحرام شیئا یرجو به الثواب یکفر (۱) ویرید أن یدفع مظلمة من نفسه فلیس له حیله الا أن یدفعه الی الفقراء (۲)

مسجد کا اکاؤنٹ کھولنا

مسجد کی رقم حفاظت کے لیے بینک میں سیونگ اکاؤنٹ کھولنا جائز اور درست ہے اور اس سے حاصل ہونے والے سود کو مسجد کی کسی بھی مد میں خرچ کرنا جائز نہیں ہوگا، ہاں البتہ سود کی رقم کو مسجد کے لیے خریدی جانے والی زمین جائیداد کی رجسٹری اسٹامپ فیس میں دینا جائز ہے، ورنہ غریب مسکینوں میں بلا نیت ثواب تقسیم کردیا ئے، لیکن سود حاصل کرنے کی غرض سے مسجد کی رقم بینک میں جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ (۳)

رفاہی اداروں کی رقم سرکاری بینک میں رکھنا

رفاہی اداروں کی رقم بغرضِ حفاظت سرکاری بینک میں رکھنا بہر حال جائز ہے، لیکن فکس ڈپازٹ کھاتے میں رکھنا، اور جمع شدہ رقم سے زائد رقم حاصل کرکے ادارے میں خرچ کرنا قطعاً حرام اور ناجائز ہے، کیونکہ اس کھاتے میں رقم رکھنے کا مقصد ہی سود حاصل کرنا ہوتا ہے۔ (۴)

مساکین کے نفع یا تنظیم کی ترقی کے لیے بینک میں رقم رکھنا

محض حفاظت کی خاطر بینک میں رقم جمع کرانا ضروری ہوتو ''لاکر'' میں جمع کرائے مساکین کی مصلحت کے خاطر (تنظیم قائم کرکے) پیسہ جمع کرکے بینک میں رکھانا اور پھر

---

(۱) شامی: ۲۱۹/۳

(۲) بذل المجہود: ۳۷/۱، فتاویٰ قاسمیہ: ۳۲۱/۲۰، ۳۲۲

(۳) فتاویٰ قاسمیہ: ۳۰۶/۲۰

(۴) محقق ومدلل جدید مسائل: ۳۸۱/۱

اس سے سود لینا جائز نہیں، سودی لین دین بہر صورت حرام ہے۔(۱)

مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ سود کو اس لیے حاصل کرنا کہ اس کو کسی رفاہِ عام کے کام میں خرچ کیا جائے گا جائز نہیں، جیسے اسی غرض کے لیے چوری اور ڈاکہ جائز نہیں ہوسکتا۔(۲)

اس حوالے سے مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ نہ تو اس مقصد سے تنظیم بنانا جائز ہے اور نہ اس ارادے سے روپے اکٹھے کرنے کی اجازت ہے اور ایسے روپیہ سے جو سود آئے اس سے غریبوں کا تعاون بھی جائز نہیں ہے، اس لیے سود خور تنظیموں کو بند کر دینا لازم ہے، چوں کہ غریبوں کا تعاون محض مستحب ہے اور سود لینا قطعاً حرام ہے؛ لہٰذا کسی مستحب کام کے لیے حرام کا ارتکاب ہرگز جائز نہیں۔

نیز اگر عام مسلمانوں کو یہ پتا چل جائے کہ یہ تنظیم سود لے کر اس کو عوام پر خرچ کرتی ہے تو کوئی بھی مسلمان کبھی بھی اس کا تعاون کرنا پسند نہیں کرے گا۔

درء المفاسد أولى من جلب المصالح فاذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبا؛ لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتناءه بالمأمورات۔(۳)

فقراء کے ساتھ خیر خواہی کا ارادہ اور خواہش ہو تو، اپنی حلال اور پاکیزہ کمائی کے ذریعہ فقراء کی مدد کریں، فقراء کو بہانا بنا کر سود حاصل کرنے کی غرض سے مذکورہ صورت کو اختیار کرنا درست نہیں ہے۔(۴)

خلاصہ: کسی بھی عمل کے درست ہونے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۷/۲۰

(۲) امداد المفتیین: ۲/۷۰۷

(۳) الاشباہ والنظائر زکریا: ۲۶۴، فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/۳۲۸، ۳۲۹

(۴) فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/۳۳۱

اس کی نیت درست ہو دوسرے اس کا طریقہ بھی درست ہو اور شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو، غریبوں پر خرچ کرنے کی نیت اچھی ہے لیکن رقم ڈپازٹ کرانا، تاکہ اس سے سود حاصل ہو، یہ طریقہ حرام و ناجائز ہے اور سود کی رقم صدقہ کی نیت سے کسی کو دینا بھی گناہ ہے کیونکہ اس میں صدقہ کی بے احترامی ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''لَا يَقْبَلُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ صَدَقَةً مِّنْ غُلُوْلٍ'' (۱) لہٰذا اس اچھی نیت سے رقم ڈپازٹ کرانا اور اس سے سود حاصل کرنا بھی گناہ ہے، محض حسن نیت کی وجہ سے یہ عمل درست و جائز نہ ہوگا۔ (۲)

جدید فقہی مسائل میں لکھا ہے کہ یہ بھی جائز نہیں کہ کسی نیک مقصد مثلاً غرباء کی مدد اور رفاہی خدمت کی غرض سے رقم فکسڈ ڈپازٹ کریں، یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے کوئی شخص مال چوری اور غصب کے ذریعہ اس مقصد سے حاصل کرے کہ وہ اس کو کارِ خیر میں صرف کرے، ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں اور وہ دوہرے گناہ کا مرتکب ہوگا، ایک مالِ حرام کا حاصل کرنا، دوسرے اس کو صدقہ کی نیت سے خرچ کرنا، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں ہی باتوں سے منع فرمایا ہے، البتہ اگر سرکاری ظلم سے تحفظ کے لیے فکسڈ ڈپازٹ کرایا جائے مثلاً اس طرح ڈپازٹ کرانے پر انکم ٹیکس سے بچت ہوگی تو کرانے کی گنجائش ہے، البتہ جو اضافہ رقم حاصل ہو اس کو غرباء اور رفاہی کاموں پر خرچ کرنا ہوگا اور اصل جمع کی ہوئی رقم ہی اس کے لیے حلال ہوگی۔ (۳)

مدرسہ کی رقم کو فکس ڈپازٹ میں رکھنا

مدرسہ کی زکوۃ کی رقم کو فکس ڈپازٹ میں رکھنا ہرگز جائز نہیں ہے اور ڈپازٹ میں

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب لا يقبل الله صدقة من غلول، مسند أحمد، حديث نمبر: ۲۰۷۱۴

(۲) کتاب الفتاویٰ: ۱۰/ ۴۶

(۳) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۸۷

رکھنا سودی کاروبار ہے، نیز اس میں زکوۃ دہندگان کے ساتھ خیانت ہے۔

بینک انٹرسٹ

بینک انٹرسٹ اس مال کو کہتے ہیں جو بینک کی جانب سے کھاتہ دار (اکاؤنٹ ہولڈر) کو اس کی اپنی رقم سے زائد دیا جاتا ہے اسی کو انگریزی میں انٹرسٹ اور اردو میں سود اور عربی میں ربا کہتے ہیں۔

بینک میں سود چھوڑنا جائز نہیں

بینک میں سود چھوڑنے کی صورت میں یہ امر متیقن ہے کہ اس کو صحیح مصرف پر خرچ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سود خوروں کی اعانت ہے لہٰذا اسے بغرض تصدق لینا واجب ہے اور بینک میں چھوڑنا گناہ ہے، جیسے کہ بصورت خوف ضیاع لقطہ کا اٹھانا واجب ہے۔ بعض کو اس پر یہ اشکال ہوا ہے کہ بینک میں سود کا چھوڑنا کسی اور محرم کا ارتکاب نہیں زیادہ سے زیادہ تسبیب ہے اور سود لینے میں اخذ ربوا کا ارتکاب ومباشرت ہے، لہٰذا جائز نہ ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اخذ ربوا کی مباشرت جب ہوگی کہ بنیت تملک سود لے، اگر بنیتِ تصدق وایصال الحق الی المستحق لیتا ہے تو اس میں اخذِ ربوا نہیں، جیسے التقاط لقطہ بنیتِ تملک حرام ہے اور بنیت ایصال الحق الی المستحق جائز بلکہ بوقتِ خوفِ ضیاع واجب ہے۔

علاوہ ازیں بینک سے تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ سود کی رقم بہرحال مالک کے کھاتے میں جمع کی جاتی ہے اور اسے اس کے سوا کوئی بھی وصول نہیں کرسکتا، اس لیے یہ رقم حکماً اس کے قبضہ میں آچکی ہے اور یہ بینک سے نکلوانے سے قبل ہی سود وصول کرچکا ہے جس کے وبال سے بچنے کی صرف یہ صورت ہے کہ مساکین پر بلا نیت ثواب صدقہ کرے۔(۱)

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۷/۱۷، ۱۸

اور یہ بھی تحقیق ہوئی ہے کہ وہ روپیہ پادریوں کو دے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کو مسلمانوں کو مرتد (عیسائی) بنانے میں اور مذہب عیسائیت کی تائید میں خرچ کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ امر بہت سخت ہے اور اعداء اسلام کی تقویت کا باعث ہے لہٰذا بموجب قاعدہ مسلمہ ''من ابتلی ببلیتین فلیختر اہونہما'' (۱) اس کو راجح سمجھا گیا کہ اس سود کی رقم کو وہاں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے لیکر فقراء وغرباء کو تقسیم کر دیا جائے۔ (۲)

اس سلسلہ میں ہمارے اکابر کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ اس کو ضرور لیا جائے نہ لینے کی صورت میں، نہ صرف امکان ہے؛ بلکہ واقع بھی ایسا ہوا ہے کہ ہماری مضرتوں اور ہمارے اور دین محمدی کی بیخ کنی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ہوگا، یہ فتویٰ ۱۹۲۸ء میں دیا گیا جیسا کہ نظام الفتاویٰ میں مذکور ہے اور حضرت تھانوی علیہ الرحمہ، مفتی عزیز الرحمن صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ، مفتی کفایت اللہ صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مدنی سب سے یہی منقول ہے اور بعد میں مفتی محمود حسن صاحب، مفتی نظام الدین صاحب، مفتی عبد الرحیم صاحب رحمہم اللہ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے اور اس کو غریبوں پر بلانیت ثواب صدقہ کر دے۔ (۳)

مسلم بینک کے سود کا حکم

ربو ''سود'' مطلقاً حرام ہے، بینک سے جو رقم سود کی ملے اس کا لینا اور حاصل کرنا بھی جائز نہیں ہے اگر کسی مجبوری سے بینک میں جمع کرنا پڑ جائے تو ایسے صیغہ اور شعبہ میں جمع کرے جس میں سود نہ لگایا جاتا ہو یہی تمام بینکوں کا حکم ہے۔

نیز سعودیہ عربیہ بلکہ مسلم حکومتوں کے بینکوں سے اگر سود کی رقم مل رہی ہے تو اس کو ان بینکوں سے نکالنا جائز نہیں ہے، بلکہ بینک میں ہی چھوڑ دینا لازم ہے اور غیر مسلم حکومتوں کے بینکوں کو قیاس کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ (۴)

---

(۱) البحر الرائق: ۹/ ۱۳۳، کتاب الاکراہ

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۱۴/ ۴۰۷

(۳) الربا، سود: مولانا عبید اللہ الاسعدی: ۲۸۲، بحوالہ سابق

(۴) منتخبات نظام الفتاویٰ: ۱/ ۲۱۶-۲۱۷

بینک ڈرافٹ کی شرعی حیثیت

بینک کے ذریعہ ڈرافٹ کی شکل میں رقم ارسال کرنا بینک کو قرض دینا ہے امانت نہیں؛ کیوں کہ رقم بدلتی بھی ہے اور ضائع ہونے کی صورت میں بینک ذمہ دار بھی ہوتا ہے ،اس لیے زیادتی کی شرط سود ہے البتہ اس میں یہ تاویل کرنی ناممکن ہے کہ زیادتی رقم کو کتابت اور فارم وغیرہ کی فیس قرار دیا جائے ،اس طرح سفتجہ کی شکل بن جائے گی جس کو فقہاء نے مکروہ کہا ہے، ابتلاء عام کی وجہ سے اس میں جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے کیوں کہ پوری دنیا میں یہ طریقہ رائج ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے امداد الفتاویٰ میں منی آرڈر کے بارے میں یہی تحقیق کی ہے۔(۱)

یونٹ ٹرسٹ کا حکم

حکومت ہند کی جانب سے منظور شدہ ایک عوامی ادارہ ہے، جس کا نام یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا ہے، یہ ادارہ عوام کے فائدہ کے لیے وجود میں آیا ہے یہ ادارہ عوام سے ان کا سرمایہ لے کر اس کو مختلف قسم کے کاروبار میں لگا تا ہے پھر اس سرمایہ سے جو آمدنی ہوتی ہے، اس میں ہر سال مالک سرمایہ کے سرمایہ میں کچھ فیصدی نفع طے کر کے اس کو سالانہ نفع تقسیم کرتا ہے۔

اس یونٹ ٹرسٹ کے بارے میں مختلف تجربہ کار حضرات سے معلومات فراہم کیں، جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ معاملہ عام بینکوں جیسا ہے، معاملہ مُضاربت کی شرطوں کے مخالف ہے اور عام سرکاری بینکوں کے سود کا حکم زمانۂ جاہلیت کے سود کے مرادف ہے جس کی ممانعت قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے؛ لہٰذا تحقیق یہی ہے کہ یونٹ ٹرسٹ کا حکم عام بینکوں جیسا ہے، اس لیے جائز نہیں۔(۲)

---

(۱) فتاویٰ حقانیہ: ۲۰۶/۶

(۲) مستفاد، فتاویٰ قاسمیہ: ۲۶۲/۲۰، ۲۶۵، محقق و مدلل جدید مسائل: ۴۱۳/۲، فتاویٰ رحیمیہ: ۳۱۹/۵

لیکن اس حوالہ سے مفتی نظام الدین صاحب اعظمی تحریر فرماتے ہیں کہ اس ادارہ میں مسلمانوں کے لیے سرمایہ لگانا بھی جائز ہے اور اس کی ایجنسی باقاعدہ اور قانونی طور پر لینا بھی جائز ہے۔(۱)

بینک کے لیے مکان کرایہ پر دینا

بینک ایک سودی کاروبار ہے، اس لیے اگر پہلے سے مقصد معلوم ہو تو خالص اس مقصد کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا کہ یہ معصیت میں ایک طرح کا تعاون ہے، ہاں اگر یوں ہی کسی نے کرایہ پر مکان لیا اور بعد کو اس میں بینک قائم کر دیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

امام سرخسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

لا بأس بأن يواجر دارا من الذمی ليسكنها ، فإن شرب فيها الخمر أو عبد فيها الصليب أو أدخل فيها الخنازير لم يلحق للمسلم إثم فی شیء من ذلك، لأنه لم يواجرها لذلك، والمعصية فی فعل المستاجر دون قصد رب الدار فلا إثم على رب الدار فی ذلك۔

مسلمان ذمی کو کوئی گھر رہائش کے لیے دے اس میں کوئی مضائقہ نہیں، پھر اگر وہ اس میں شراب پیئے، صلیب کی پرستش کرے یا سور کو داخل کرے تو مسلمان کو ان کا کوئی گناہ نہ ہوگا، اس لیے کہ اس نے اس مقصد کے لیے نہیں دیا ہے، گناہ کرایہ دار کا عمل ہے اور اس کے اس عمل میں صاحب مکان کے ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اس لیے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔(۲)

---

(۱) منتخب نظام الفتاویٰ: ۱/۲۱۴

(۲) جدید فقہی مسائل: ۱/۲۷۴

مفتی رشید احمد صاحب مذکورہ مسئلہ میں فرماتے ہیں:

''بیمہ یا بنکاری وغیرہ کے لیے مکان کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی ہے، البتہ کافر کو کرایہ پر دینے میں کراہت تنزیہی ہے، کرایہ حلال مال سے ادائیگی کی شرط کے ساتھ عقد اجارہ کی کراہت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ اس صورت میں حرام خوری سے بچا جائے گا، صرف عقد اجارہ کا گناہ ہوگا، کافر سے بھی سود اور بیمہ کی آمدنی سے کرایہ وصول کرنا حرام ہے''۔

نیز مفتی رشید احمد صاحب یہ بھی فرماتے ہیں:

''بیمہ کمپنی میں کام کرنے والے ملازم سے اس کے مکان کے کرایہ کے طور پر حاصل شدہ کرایہ کی رقم بھی حرام ہے، اس کو کسی صورت میں استعمال نہیں کیا جاسکتا، مالکین پر صدقہ کرنا واجب ہے''۔(۱)

البتہ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم سودی بینک کے لیے مکان یا پلاٹ فروخت کرنے کے حکم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ چوں کہ بینک کے سرمایہ کی اکثریت حرام نہیں، اس کے لیے بیچنے کی گنجائش تو معلوم ہوتی ہے، لیکن کراہت تنزیہی سے بھی خالی نہیں۔

و فی رد المختار ج:۴ص:۲۶۸ باب البخاة (طبع سعید) قلت وافاد کلامهم ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریما و الا تنزیها (قوله نهر) و عبارته و عرف بهذا لا یکره بیع ما لم تقم المعصیة به کبیع الجاریة المغنیة به والکبش النطوغ والحمامة الطیارة العصیر والخشب ممن یتخذ منه المعارف(۲)

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۷/ ۳۰۴، ۳۰۵

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۸۸

مفتی شبیر احمد صاحب اس حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

”جس بینک کا معاملہ سود پر مشتمل ہو اور سود ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہو، جیسا کہ آج کل اکثر بینکوں کا معاملہ ایسا ہی ہے، تو ایسے بینک کو بلڈنگ کرایہ پر دینا در پردہ معصیت پر تعاون ہے؛ اس لیے یہ غیر مناسب خلاف اولیٰ اور مکروہ تنزیہی کے درجہ میں ہے اور چوں کہ سودی کاروبار فاعلِ مختار کا عمل ہے جس میں مالک مکان کا کوئی دخل نہیں؛ اس لیے اس کا گناہ صرف کرایہ دار پر ہوگا مالکِ مکان پر نہیں ہوگا، اور بلڈنگ کا کرایہ مالکِ مکان کے حق میں حرام نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ وہ اپنے مال کی اجرت لے رہا ہے“۔(۱)

یہی رائے مفتی سلمان منصور پوری صاحب کی ہے چنانچہ وہ اس حوالے سے فرماتے ہیں: بینک چلانے کے لیے اپنی جگہ کرائے پر دینا بکراہت جائز ہے اور اس میں بینک جو سودی کاروبار کرتا ہے، تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے، مالک مکان اس کا ذمہ دار نہیں ہے:

و جاز اجارة بيت بسواد الكوفة ؛ يتخذ بيت نار أو كنيسة أو بيعة أو يباع فيه الخمر (الدر المختار) و تحته فى الشامية : هذا عنده أيضا : لأن الاجارة على منفعة البيت : ولهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا بعصية فيه ، وانما المعصية بفعل المستاجر، وهو مختار فينقطع نسبته عنه. (۲)

وإذا استاجر الذمى من المسلم دارا ليسكنها فلا بأس بذلك ، وان شرب الخمر فيها ، أو عبد فيها الصليب أو دخل فيها

(۱) فتاویٰ قاسمیہ:۲۱/۵۸۵

(۲) شامی:۹/۵۶۹

الخنازير لم يلحق المسلم في ذلك شيء، و كان بمنزلة مالو اجر دارا من فاسق، و في الخانية: كمن باع غلاما ممن يقصد به الفاحشة أو باع جارية ممن يأتيها في غير المأتى (۱)

مسئلہ کی تفصیل:

اس مسئلہ کی تفصیل حضرت مولانا مفتی شعیب اللہ خان صاحب نے اپنی کتاب ''حرام کاروبار کے لیے اسلامی اجارہ'' میں لکھا ہے جسمیں تمام فقہاء کے اقوال کو ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ امام اعظمؒ کی جانب حرام کاروبار کے لیے اسلامک اجارہ جواز کو غلط ثابت کر کے ان کے مسلک کی تحقیق پیش کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

حضرات فقہاء کرام میں سے امام اعظم علیہ الرحمۃ کے شاگردان رشید امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ اور امام محمد علیہ الرحمۃ اور نیز امام مالک علیہ الرحمۃ، امام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ اور امام شافعی علیہ الرحمۃ وغیرہ ائمہ نے کسی حرام کام کے لیے کرایہ پر مکان دینے کو ناجائز قرار دیا ہے، چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب درمختار میں یہ مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہ یہود ونصاریٰ ومجوس کی عبادت گاہوں کے لیے یا شراب بیچنے کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ لکھا ہے:

"وقال لاينبغي ذلك لأنه إعانة على المعصية وبه قالت الثلاثة" (۲)

ترجمہ: صاحبین (امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ اور امام محمد علیہ الرحمۃ) نے فرمایا کہ یہ درست نہیں، کیونکہ یہ گناہ پر اعانت ہے اور یہی قول ہے تینوں ائمہ (شافعی، مالک، احمد رحمہم اللہ) کا۔

امام شمس الائمہ سرخسی علیہ الرحمۃ ذمی (کافر) کو شراب بیچنے کے لئے مکان کرایہ پر دینے کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

(۱) تاتارخانیہ: ۱۵/ ۱۳۳، کتاب النوازل: ۱۲/ ۴۹۴

(۲) درمختار مع شامی: ۶/ ۳۹۲

"لم يجز لانه معصية ولا ينعقد العقد عليه ولا أجر له عندهما" (۱)

ترجمہ: امام محمد رحمہ اللہ وامام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ جائز نہیں، کیونکہ یہ گناہ کا کام ہے، لہٰذا یہ معاملہ منعقد نہ ہوگا، اور نہ کرایہ ملے گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کی تحقیق:

یہ بات صحیح ہے کہ بعض فقہی کتابوں میں امام اعظم رحمہ اللہ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ آپ نے حرام کاموں کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ درمختار اور ہدایہ میں ہے کہ آتش کدہ، مندر یا چرچ بنانے کے لیے گھر کرایہ پر دینا جائز ہے۔ "جاز اجارة بيت بسواد الكوفة" (۲)

لیکن پہلی بات تو یہ سمجھنا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے اس قول میں جواز کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ فقہاء کرام کے کلام میں لفظ جواز دو معنوں میں استعمال ہوا ہے: ایک حلال ومباح ہونے کے معنی میں، دوسرے کسی کام کے صحیح ومنعقد ہوجانے کے معنی میں اس سے قطع نظر کہ اس کام سے گناہ ہوگا یا نہیں؟

"ولفظة "يجوز" تارة تطلق على معنى يحل وتارة تستعمل بمعنى يصح وتارة تصلح لهما (۳)

اور فقہاء کے کلام میں لفظ جواز پہلے معنی کی طرح دوسرے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ (جس کی کئی ایک مثالیں ہیں)۔

الغرض یہ بات واضح ہوگئی کہ فقہاء کرام کے کلام میں جواز کے ایک معنی یہ ہیں کہ یہ کام منعقد ہوگیا، اور یہ ذمہ سے ساقط ہوگیا، اس سے قطع نظر کہ یہ کام حلال ومباح تھا یا ناجائز وحرام۔ لیکن اس میں غور کرنا یہ ہے کہ یہاں کونسے معنی مراد ہیں؟

---

(۱) المبسوط للسرخسی: ۱۶/ ۳۷

(۲) درمختار: ۶/ ۳۹۲، ہدایہ: ۴/ ۴۵۶

(۳) البنایہ: ۱/ ۲۰۵

زیر بحث مسئلہ میں فقہاء کا کلام اگرچہ دونوں معنی کو محتمل ہے، مگر بعض دیگر عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جواز کے معنی حلال ہونے کے نہیں بلکہ صحیح ومنعقد ہوجانے کے ہیں۔ چنانچہ امام سرخسی علیہ الرحمۃ کی مبسوط (جس کے بارے میں علامہ طرطوسی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ اسی کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا اور اس کے خلاف پر عمل نہ ہوگا۔(۱)

اس میں ہے:

إذاستاجر الذمی من المسلم بیتا لیبیع فیه الخمر لم یجز فلا ینعقد العقد علیه ولا اجرله عندہما وعند ابی حنیفة علیہ الرحمۃ یجوز (۲)

ترجمہ: اگر مسلمان سے ذمی (کافر) نے شراب بیچنے کے لیے گھر کرایہ پر لیا تو امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ وامام محمد علیہ الرحمۃ کے نزدیک جائز نہیں، کیونکہ یہ گناہ ہے، پس اس پر معاملہ منعقد نہ ہوگا، اور نہ کرایہ ملے گا، اور امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کے نزدیک یہ جائز ہے۔

اس میں امام سرخسی علیہ الرحمۃ نے امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ اور امام محمد علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاملہ منعقد نہ ہوگا، اس کے بالمقابل امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ آپ کے نزدیک جائز ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جواز کے معنی منعقد ہوجانے کے ہیں، نہ کہ حلال ومباح ہونے کے۔

پھر اس سے زیادہ واضح الفاظ میں امام اعظمؒ کا مسلک ''خلاصۃ الفتاویٰ'' میں نقل کیا گیا ہے کہ ایسے غیر شرعی کاموں کے لیے مکان کرایہ پر دینا امام اعظم علیہ الرحمۃ کے نزدیک ''یصح ویأثم'' کہ صحیح ہوجاتا ہے اور دینے والا گنہگار ہوتا ہے۔

---

(۱) رسم المفتی:۱/۲۰

(۲) مبسوط:۱/۳۸

نیز مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہاں جواز کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔(۱)

اسی طرح علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ جواز کو ''معاملہ کے صحیح ومنعقد ہونے'' کے معنی میں لینا درست قرار دیا ہے۔(۲)

الغرض امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو جائز اس معنی میں فرمایا ہے کہ یہ معاملہ طئے ومنعقد ہوجاتا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں، پھر خلاصۃ الفتاویٰ کے مطابق یہ بھی واضح ہوگیا کہ ایسا معاملہ کرنے والا گنہگار بھی ہوتا ہے، لہٰذا سودی کاروبار کا یا کسی اور حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینے سے یہ معاملہ طے ومنعقد تو ہوجاتا ہے مگر یہ دینے والا گنہگار بھی ہوتا ہے۔

جواز کے حدود وشرائط

دوسری بحث یہ ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر مسئلہ زیر بحث میں جواز کے معنی حلال ومباح ہونے کے لیے جائیں تو کیا یہ بلا کسی قید وشرط کے جائز ہے یا اسمیں کوئی قید وشرط بھی ہے، کیونکہ بسا اوقات ایک مسئلہ ایک جگہ پر بلا کسی قید وشرط کے مذکور ہوتا ہے جبکہ دوسرے مواقع پر اس پر اس کی قیدیں وشرطیں بیان کی جاتی ہیں، اور یہ مسلم ہے کہ جب ائمہ کرام کسی قول کی کوئی قید وشرط دوسرے موقع پر ذکر کریں تو اس کو واجبی طور پر معتبر ماننا چاہیے جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''تنبیہ الغافلین'' میں تصریح کی ہے۔

اب جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے اس کی تفصیلات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سیدنا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرام کاموں کے لیے مکان کرایہ پر دینے یا کسی بھی طور پر باطل کی اعانت وامداد کرنے کا جواز بہت سی شرطوں سے مشروط ہے، ان شرطوں سے قطع نظر کر کے صرف یہ مسئلہ لے لینا کہ ''امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

---

(۱) جواہر الفقہ: ۲/۴۴۵

(۲) اعلاء السنن: ۱۴/۶۱۷

حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے" درست نہ ہوگا اور یہ لاعلمی کا ثبوت ہوگا۔

پھر جب ان شرائط پر ہمارے زیر بحث مسئلہ کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اس میں شرطیں نہیں پائی جاتی ہیں جب وہ شرطیں ہمارے زیر بحث مسئلہ میں نہیں پائی جارہی ہیں تو پھر ان شرائط سے جو جواز مشروط تھا وہ بھی اس میں نہ ہوگا اور یہ صورت مکروہ و ناجائز قرار دی جائے گی۔

جواز کی شرطیں

۱) پہلی شرط یہ ہے کہ سودی کاروبار یا کسی اور حرام کام کے لیے مکان کر یہ پر دینے والا، اس نیت سے نہ دے کہ غیر شرعی وحرام کاروبار اس میں کیا جائے، اگر اس نیت سے دے گا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ جائز نہ ہوگا۔(۱)

۲) دوسری شرط یہ ہے کہ کرایہ پر دینے والے کو یہ معلوم نہ ہو کہ مکان کرایہ پر لینے والا اس میں حرام کاروبار کرے گا، لہٰذا اگر یہ معلوم ہو تو کرایہ پر مکان دینا جائز نہ ہوگا۔(۲)

اب ہمارے زیر بحث مسئلہ پر غور کیجیے کہ کیا ان کرایہ پر دینے والوں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ سودی کاروبار کے لیے استعمال میں لایا جائے گا؟ ضرور علم ہوتا ہے بلکہ معاملہ کرتے وقت تصریح کی جاتی ہے کہ یہ دکان سودی کاروبار کے لیے استعمال کی جائے گی اور علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر معاملہ کرتے وقت اس بات کی تصریح کردی گئی تو بھی یہ معاملہ ناجائز ہے۔

۳) اس معاملہ کے جائز ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ یہ معاملہ کافر سے ہو، مسلمان کو سودی کاروبار یا کسی حرام کام کے لیے مکان دکان کرایہ پر دینا جائز نہیں۔(۳)

---

(۱) دیکھئے: مبسوط للسرخسی: ۱۶/۳۹

(۲) دیکھئے: در مختار: ۴/۲۶۸

(۳) دیکھئے: الاشباہ والنظائر: ۵۳

۴) ایک شرط یہ ہے کہ سودی کاروبار یا کسی اور حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینا وہاں جائز ہے جہاں اسلامی شعائر واعلام غالب وظاہر نہ ہوں، بلکہ اعلام وشعائرِ کفر غالب ہوں، یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز ہے وہیں بعض کتابوں میں تصریح ہے کہ یہ مسئلہ صرف سوادِ کوفہ (کوفہ کے گاؤں) کے لئے ہے۔ اور جن حضرات نے ہر گاؤں میں اس کی اجازت دی ہے ان بڑے بڑے ائمہ نے رد کیا ہے۔

اب غور اس پر کرنا ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہر اور اسی طرح بے شمار گاؤں اور قریے، مسلمانوں سے بھرپور ہیں اور ان میں اسلامی شعائر بھی غالب وظاہر ہیں؛ کیونکہ شعائر سے مراد اذان، جماعت، جمعہ وعیدین وغیرہ ہیں، کون انکار کرسکتا ہے کہ خدا کے فضل وکرم سے یہاں اسلامی شعائر غالب وظاہر نہیں تو فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق ان علاقوں میں امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک بھی حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا۔

خلاصۂ تحقیق

امام اعظم علیہ الرحمہ کے مسلک کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاً تو آپ کے نزدیک جو حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینے کو جائز لکھا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ یہ معاملہ منعقد ہو جائے گا، لیکن اس سے وہ گنہگار بھی ہوگا، پھر یہ جواز بھی چند شرطوں سے مشروط ہے کہ ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو پھر یہ معاملہ جائز نہ ہوگا۔

اور زیر بحث مسئلہ میں شرائط نہ پائے جانے کی وجہ سے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق بھی حرام کام کے لیے مکان کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا۔(۱)

سود خور سے مکان کرایہ پر لینا

سودی کاروبار کرنے والے شخص سے کوئی مکان کرایہ پر لینا اور اس میں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس کی سودخوری کا آپ کے رہائشی مکان سے کوئی تعلق نہیں ہے،

(۱) مستفاد از رسالہ حرام کاروبار کے لیے املاک کا اجارہ۔ مفتی شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

البتہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ وہ سود جیسے گناہ سے اپنے آپ کو بچائے۔(۱)

بینک ملازم کا مکان خریدنا

بینک ملازم اگر اپنا مکان فروخت کر رہا ہو تو اس کی تعمیر میں اکثر رقم حرام کی ہو تو اس مکان کو خریدنا جائز نہیں ہے۔ ”الحرام ینتقل ای تنتقل حرمته وان تداولته الأیدی و تبدلت الاملاك الخ“ (۲)

فینانس کمپنی کے لیے جگہ کرایہ پر دینا

سود کا جس طرح خود لینا یا شدید ضرورت کے بغیر دینا حرام ہے، اسی طرح سودی معاملات میں تعاون کرنا بھی جائز نہیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام لوگوں پر لعنت فرمائی ہے، جو سودی کاروبار کو لکھنے اور اس پر گواہ بننے یا اس میں واسطہ بننے کے اعتبار سے معاون ہوں، ایسے سودی قرض فراہم کرنے والے اداروں کو اپنے مکان یا شوروم میں جگہ فراہم کرنا ایک سودی معاملہ میں تعاون کرنا ہے، اس لیے فینانس کمپنی کے لیے جگہ فراہم کرنا جائز نہیں۔(۳)

بینک ملازم کو کرایہ پر مکان دینا

بینک کو مکان کرایہ پر دینا درست نہیں، کیونکہ یہ گناہ میں تعاون ہے، لیکن بینک کا ملازم اگر رہائش کے لیے کرایہ پر مکان لینا چاہے تو اس کو مکان دینے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ گناہ قابل نفرت ہے نہ کہ گنہگار، حسن سلوک تو گنہگار کیا غیر مسلم کے ساتھ بھی مطلوب ہے اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں، کرایہ دار آپ کو جو کرایہ ادا کرے گا وہ آپ کے حق میں سود کی رقم نہیں؛ بلکہ مکان کا کرایہ ہے اور قاعدہ ہے کہ جب کسی شئی کی ملکیت

---

(۱) مستفاد از کتاب الفتاویٰ:۵،۳۹۲

(۲) شامی:۳۰۰/۷، کتاب البیوع باب البیع الفاسد، محقق ومدلل جدید مسائل:۳۸۴/۱

(۳) کتاب الفتاویٰ:۴۱۱/۵

بدل جاتی ہے تو اس کا حکم بدل جاتا ہے، اس لیے جب وہ رقم کرایہ دار کے واسطے سے آپ تک پہنچی تو اب یہ سودی رقم شمار نہ ہوگی۔(۱)

ATM مشین لگانے کے لیے اپنا کمرہ کرایہ پر دینا

ATM مشین سے روپیہ نکالنے کا ہر عمل سودی نہیں ہے؛ لہٰذا ATM مشین لگانے کے لیے اپنی جگہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، وإذا استاجر الذمي من المسلم بيتا ليبيع فيه الخمر جاز عند أبی حنيفه علیہ الرحمۃ۔(۲)

بینک کے لیے سافٹ ویئر بنانا

ایک کمپیوٹر سافٹ ویئر (computer software) کمپنی ہے، جو سافٹ ویئر ڈولپ کرتی ہے تو کیا وہ بینک کے لیے بھی سافٹ ویئر بنا سکتی ہے یا نہیں؟ اس حوالہ سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

> ''غالباً کمپنی حسابات کے ریکارڈ کو محفوظ کرنے کا پروگرام بناتی ہے جس سے کرنٹ اکاؤنٹ والوں کا حساب بھی محفوظ کیا جاتا ہے اور سود پر مبنی اکاؤنٹ والوں کا حساب بھی، یہ حساب فی نفسہٖ سود پر مستلزم نہیں ہے اس کے ذریعہ جائز نفع کا حساب بھی کیا جا سکتا ہے، اس لیے بینک کے لیے سافٹ ویئر تیار کرنے کی گنجائش ہوگی؛ لیکن چونکہ اس بات کا علم پہلے سے ہے کہ یہ سود پر مبنی حسابات کے لکھنے اور حساب کرنے میں بھی معاون ہوگا اس لیے کراہت سے خالی نہیں''۔(۳)

بینک کے جائز وظائف

بینک کے متعلق سابقہ صفحات میں جو بحث کی گئی ہے، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں

---

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۱۰/ ۱۳۹

(۲) الفتاوی هندية: ۴/ ۴۴۹، کتاب النوازل، ۱۲/ ۲۸۴

(۳) کتاب الفتاویٰ: ۱۰/ ۱۴۱

کہ بینک کے سارے کام غلط، ناجائز اور حرام ہیں، اور اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعامل جائز نہیں ہوسکتا، بلکہ بینک بہت سی ایسی مفید اور جائز خدمات بھی انجام دیتا ہے جو موجودہ زمانہ کی تمدنی زندگی اور کاروباری ضروریات کے لیے مفید بھی ہیں اور ضروری بھی، دراصل بینک بھی موجودہ تہذیب کی پرورش کی ہوئی بہت سی چیزوں کی طرح ایک ایسی اہم اور مفید چیز ہے جس کو صرف ایک شیطانی عنصر (سود) کی شمولیت نے گندہ کر رکھا ہے، اب ہم بینک جو جائز خدمات انجام دیتا ہے، ان کو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

۱) ایک جگہ سے دوسری جگہ روپیہ نقل منتقل کرنا، نیز ایک ملک سے دوسرے ملک کو روپیہ ٹرانسفر کرنا: اس کے لیے بینک تھوڑی سی فیس وصول کرتا ہے، یہ اجرت میں داخل ہے، جو جائز ہے۔

۲) سفری چیک (Travel Cheque) جاری کرنا: جو آدمی ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتا ہے، اسے اس ملک میں روپے کی ضرورت پڑتی ہے، اس کے لیے وہ بینک سے نقد روپے دے کر یہ سفری چیک لیتا ہے، جسے وہ کسی بھی جگہ بھجا کر اپنی قیمت کا روپے لے سکتا ہے اور یہ اپنے ساتھ نقد روپے لے جانے کے مقابلے میں زیادہ آسان اور زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔

۳) لوہے کا خزانہ کرایہ پر دینا: اگر کوئی شخص لوہے کے خزانے میں روپیہ رکھنا چاہتا ہے، تو بینک سے کرایہ پر یہ خزانہ لے سکتا ہے اور اپنے مصرف میں استعمال کرسکتا ہے۔

۴) کمپنیوں کے حصے فروخت کرنا: بینک کمپنی سے اجرت لے کر اس کا حصہ فروخت کروا دیتا ہے، اگر کمپنی بینک سے یہ خدمت لینا چاہتا ہے۔

۵) بیرونی ممالک سے لین دین کی سہولتیں بہم پہنچانا: بینک یہ نہایت ہی اہم خدمت انجام دیتا ہے، اس طرح بینک دوسرے ملکوں سے تجارتی و دیگر معاملات کرنے والوں کو بہت ساری پریشانیوں اور مشقتوں سے راحت دیتا ہے مثلاً بینک ان کی طرف سے قیمت ادا کرتا ہے اور سامان اکسپورٹ کے کاغذات خود لے لیتا

ہے اور بینک یہ سارے کام تھوڑی سی اجرت لے کر انجام دیتا ہے جو جائز ہے۔

۶) قرض وصول کرنا: وہ اس طرح سے کہ قرض دینے والے لوگ بینک کے پاس اپنے کاغذات جمع کرتے ہیں اور اس پر دستخط کر کے بینک کو سونپ دیتے ہیں کہ وہ اپنی اجرت لے کر ان کا قرض ان کو وصول کر کے دے۔

۷) اعتماد نامہ (Letter of crediy) کھولنا: بلا سود ایل سی کھولنے پر بینک جو اجرت لیتا ہے، وہ جائز ہے۔(۱)

بینک کی مختلف خدمات

مروجہ بینک مختلف ایسی خدمات انجام دیتے ہیں، جو انسانی سماج کے لیے ضروری ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

الف) بینک لوگوں کی رقمیں محفوظ کرتا ہے اور بہ وقت ضرورت انہیں واپس لوٹاتا ہے۔

پہلے زمانے میں نقد رقم سونے اور چاندی یا کسی اور دھات کی صورت میں ہوا کرتی تھی، لوگ ضرورت سے زیادہ رقم کی حفاظت کے لیے ان کو دفینہ کی شکل میں محفوظ کر دیتے تھے، ان سکوں کو دیمک لگنے کا خطرہ نہ ہوتا تھا اور چوں کہ ان سکوں کی بہ ذات خود ایک ''قدر'' ہوا کرتی تھی؛ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ان کی قوتِ خرید کم نہیں ہوتی تھی، موجودہ دور میں جو کاغذی نوٹ مروج ہیں، انہیں طویل عرصہ تک محفوظ رکھنے کے لیے دفینہ کی شکل میں نہیں رکھا جا سکتا؛ ورنہ ان کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے، دوسرے: چوں کہ خود ان نوٹوں کی کوئی قابل ذکر قیمت نہیں ہوتی؛ بلکہ حکومت کی توثیق و تصدیق کی وجہ سے ان کو قبول کیا جاتا ہے؛ اس لیے ان کی قیمت میں تیزی سے اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے اور زیادہ تر گراوٹ (Inflation) کی نوبت آجاتی ہے؛ اس لیے موجودہ دور میں ایسے ادارہ کی زیادہ ضرورت ہے، جو لوگوں کی رقم محفوظ رکھے۔

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۶۹، ۷۰

ب) بینک رقم جمع کرنے والوں کو نفع بھی دیتا ہے۔ اپنی امانت کو گراوٹ سے بچانے کے لیے موجودہ دور میں ایسے ادارہ کی زیادہ ضرورت ہے، جو آپ کے سرمایہ کو نفع آور بنائیں، نیز اس کا فائدہ ان لوگوں کو بھی ہوتا ہے، جو سرمایہ تو رکھتے ہیں؛ لیکن خود تجارت اور کاروبار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ج) بینک ضرورت مندوں کو مقررہ مدت کے لیے قرض فراہم کرتا ہے، اس طرح نہ صرف قرض لینے والوں کی ضرورت پوری ہوتی ہے؛ بلکہ ان کو اپنے کاروبار کو بڑھانے کا موقع بھی ملتا ہے، معاشی ترقی ہوتی ہے اور بالواسطہ سماج کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ سماج میں چوں کہ غریب و ضرورت مند لوگ بھی ہوتے ہیں ؛ بلکہ ایسے لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے، نیز بہت سی دفعہ تجارت اور کاروبار کو ترقی دینے کے لیے کثیر سرمایہ (Huge Capital) مطلوب ہوتا ہے، جس کا عام افراد سے حاصل ہونا مشکل ہوتا ہے؛ اس لیے یہ بھی ایک بڑی ضرورت ہے۔

د) سماج میں بعض لوگوں کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ سرمایہ موجود ہوتا ہے، جو بیکار پڑا رہتا ہے، اور کچھ لوگوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہوتا کہ ان کی ضرورت پوری ہو سکے، بینک پہلی قسم کے لوگوں سے زائد از ضرورت سرمایہ کو حاصل کرتا ہے اور دوسری قسم کے لوگوں تک اس کو پہنچاتا ہے، اس طرح معاشرہ میں معاشی ترقی ہوتی ہے اور تمام لوگوں کو اس کا نفع پہنچتا ہے۔

ھ) اگر بیچنے والا اور خریدنے والا دو ایسے علاقوں میں واقع ہو، جن کے درمیان کافی مسافت ہو تو اس وقت ایک ایسا ذریعہ مطلوب ہوتا ہے، جو ایک فریق کی طرف سے دوسری فریق کو مطلوبہ قیمت پہنچائے، یا وہ مطلوبہ سامان پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرے؛ تاکہ لوگ اعتماد کے ساتھ کاروبار کرسکیں اور تجارت کو فروغ ہو، یہ ضرورت بھی بینک کے ذریعہ پوری ہوتی ہے۔

لوگوں کی امانتوں کی حفاظت کرنا، ان کے سرمایہ کو نفع آور بنانا اور ضرورت

مندوں کو قرض فراہم کرنا وہ افعال ہیں، جو شریعت اسلامی میں نہ صرف جائز ہیں؛ بلکہ مطلوب وپسندیدہ ہیں۔

لیکن مروجہ بینکوں کے طریقۂ کار میں یہ خرابی ہے کہ وہ رقم جمع کرنے والوں کو سود دیتے ہیں اور قرض لینے والوں سے سود وصول کرتے ہیں؛ اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے مروجہ بینکنگ نظام بہ حالتِ موجودہ درست نہیں ہے۔(۱)

بینک کے ذریعہ تجارت

بینک کے ذریعہ کاروبار کی متعدد ومختلف صورتیں ہوتی ہیں اوراس کے احکام بھی مختلف ہیں:

۱) مالکِ مال ازخود بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا، مگر وہ بلٹی بینک کے واسطہ سے خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالکِ مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بینک سے قیمت فوراً یا کم ازکم مدت میں بہت آسانی سے وصول ہوجاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب اوردھوکہ کھانے یا اور معاملہ میں پڑکر ڈوب مرجانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہوتے ہیں۔

۲) کبھی مالکِ مال ازخود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہوکر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، اور پھر بقیہ عمل وہی کرتا ہے جو نمبر ایک میں گزرا، اور خریدار اگرچہ اس کو پسند نہیں کرتا مگر انکار بھی نہیں کرسکتا۔

۳) کبھی حکومت خود دخیل ہوکر بائع ومشتری کے درمیان بینک کو قانوناً واسطہ بنادیتی ہے، اور بینک کے ذریعہ خرید وفروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

۴) کبھی بینک خود پیش کش کرکے یہ طریقۂ کار جو بینک نمبر ایک میں گزرا مالکِ مال

(۱) جدید مالیاتی نظام: ۲۲، ۲۴

سے اختیار کرا لیتا ہے، کیونکہ اس طریقۂ کار میں بینک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے، بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

۵) کبھی یہ طریقۂ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے مگر صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کر سکے، یا کوئی اور قانونی مجبوری ہوتی ہے یا راستہ وغیرہ کے خطرہ سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

۶) انہی مواقع میں کبھی بنک خود پیش کش کر کے خریدار سے براہِ راست یہ طریقۂ کار اختیار کرا لیتا ہے یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے اور بھی بہت کم ہوتی ہیں اس لیے کہ اس میں خریدار کو اگرچہ کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں مگر اس پر کچھ خرچ کا بار زائد ہو جاتا ہے، نیز کچھ ذمہ داریاں اور پریشانیاں بھی سوار ہو جاتی ہیں، ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بنک سے خریدار کے قرض لینے یا بینک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ کرتا ہی نہیں، بلکہ مالک خود یا حکومت یا خود دونوں براہِ راست بینک سے اپنا معاملہ کر کے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بناتے ہیں یا بینک خود دخیل ہو کر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کر لیتا ہے اور اس کی ہدایت کے مطابق خود جو معاملہ چاہے کرتا ہے اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا کہ میری طرف سے اتنا قرضہ دے دو، بلکہ یہ صورت قریب قریب ویسی ہی ہوتی ہے جیسی صورت اصل پرائیویڈ ٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے، مثلاً یہ کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیوں کے مثل خود اضافہ کرتا ہے یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم بڑھاتا رہتا ہے لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا یہاں بھی نہ

ہوگا، کیونکہ سود کا تحقق عقود معاوضہ میں ہوتا ہے اور یہاں سرے سے خریدار کا بینک سے کوئی عقد ہی نہیں ہوتا اور یہ ظاہر ہے۔

اور پانچویں چھٹی صورت میں (جب خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہِ راست خریدار سے معاملہ کرے) بھی صورتیں مختلف ہوتی رہتی ہیں (یہاں الف، ب، ج، د) کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں:

الف) خریدار کا نقد سرمایہ بنک میں داخل وموجود ہے اور بنک خود مالکِ مال کو قیمت جمع کر دیتا ہے تو اس کو بھی خریدار کا قرض لینا نہیں کہیں گے بلکہ اسی جمع شدہ سرمایہ سے ادا کرنا یا جمع کرنا محسوس کریں گے، اور بنک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے اور جو پیسے بنک خریدار سے مزید وصول کرے گا اس کو اس کے عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

ب) خریدار کا کچھ سرمایہ تو بینک میں جمع نہیں ہے لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کر دے تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے، اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت سے زائد لے گا، اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا اور یہ ظاہر ہے۔

ج) ادائیگی ثمن کی مقرر تاریخ ختم ہونے کے بعد اگر بینک از خود قیمت جمع کر دے لیکن خریدار سے کوئی معاملہ نہ کرے جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا اور اس پر بینک جو رقم اصل ثمن سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا۔

د) اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو لیکن بینک مال کو اپنے قبضہ ونگرانی میں لیکر قیمت مال کی جمع کر دے، پھر جب خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ کرنے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا، اور جو پیسے بینک لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

ر) ان تمام صورتوں میں خواہ پہلی نمبر وار چھ صورتیں ہو یا یہ الف، با وغیرہ پانچ

صورتیں ہوں سب میں اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار جس جس طرح قیمت ادا کرتا ہے کرتا جائے باقساط یا قسط واحد بینک وصول کرے محض وہ قیمت مالکِ مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لے گا، وہ سود نہ ہوگا بلکہ وہ اسکی اجرت وحق المحنت ہوگی، اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

س) البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے کر خود مالک مال کو قیمت ادا کرے یا بینک سے قرض لینے کا معاملہ کرے مثلاً اس طرح معاملہ کرے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کر دیا کرو، میں بعد میں تم کو ادا کر دیا کروں گا، تو بیشک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے، پہلا خالص قرض کا اور دوسرا قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دیئے ہوئے روپیہ سے زائد رقم جو خریدار سے وصول کرے گا وہ بلاشبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بیشک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا، جس کی اجازت بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لیے کام نہ چلتا ہو اور بینک کے علاوہ کہیں اور سے قرض نہ ملتا ہو یا ملتا ہو مگر باعتبار بینک کے سود زیادہ دینا پڑتا ہو، یا مثلاً کوئی قانونی مجبوری ایسی ہو جائے کہ بغیر توسط بینک کے کاروبار نہ ہو سکے۔(۱)

بینک کے متفرق مسائل

❁ بینک میں کسی اوکاؤنٹ میں نقد جمع کرا دینا، خواہ براہِ راست ہو یا بینک ٹرانسفر کے ذریعہ ہو، اکاؤنٹ ہولڈر کا اس رقم پر قبضہ سمجھا جائے گا اور بینک قبضہ کا وکیل سمجھا جائے گا۔

❁ اسی طرح بینک ڈرافٹ (Bank draft) کی ادائیگی مندرج رقم کی سپردگی

---

(۱) منتخب نظام الفتاویٰ: ۲/ ۳۰۸، ۳۱۰

سمجھی جائے گی۔

- جب کہ پرسنل چیک (persnol chek) دینا اس پر درج رقم کی ادائیگی نہیں سمجھی جائے گی، جب تک کہ صاحبِ حق اس کو وصول نہ کرلے یا اپنے اکاؤنٹ میں جمع نہ کرادے۔
- ڈیبٹ کارڈ (debit card) یا چارج کارڈ یا کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ ادائیگی کرنا، حوالہ ہے، جس سے مشتری کا ذمہ بری ہوجائے گا اور اس پر حوالہ کے احکام جاری ہوں گے۔(۱)

بینک سے لیٹر آف کریڈٹ نکلوا کر تجارت کرنا بھی جائز ہے، اور اس سے متعلق جو خدمات بینک فراہم کرتا ہے اس کے پیشِ نظر (اجرت کے طور پر) ایسا لیٹر جاری کرنے پر بینک کو کمیشن دینا بھی جائز ہے بشرطیکہ اس کی ادائیگی میں سود لازم نہ آئے۔

پیشگی ادائیگی کے بغیر جاری کیے گیے لیٹر آف کریڈٹ (letter of credit with out margin) پر فائدہ (یعنی ضروری مصارف سے زیادہ) وصول کرنا ربا ہونے کے سبب شرعاً ممنوع اور محظور ہے۔

- اگر مبیع بائع کی مملوک ہے تو یہ ممکن ہوگا کہ متعاقدین کے درمیان خط وکتابت، ٹیلفونک گفتگو یا کسی اور طریقہ سے ہونے والے ایجاب وقبول کے نتیجہ میں بیع مکمل مانی جائے اور پھر مبیع اور ثمن کا تبادلہ لیٹر آف کریڈٹ یا آپس میں طے شدہ کسی بھی طریقہ سے کیا جائے۔
- اگر مبیع بائع کی ملکیت میں نہیں، یا بیع کا اتمام کسی چیز پر موقوف ہو تو بیع کا قرار شرعی اعتبار سے وعدہ کے حکم میں ہوگا اور بائع مبیع کا مالک بنے اس کے بعد موقوف علیہ امر متحقق ہونے کے بعد ایجاب وقبول سے یا تعاطی سے بیع منعقد ہوگی۔

---

(۱) اسلامی قانون خرید وفروخت ص:۳۶

- لیٹر آف کریڈٹ کی صورت میں بائع کی طرف سے سامان ٹرانسپورٹ کمپنی کے حوالے کرنے پر بیع تعاطی منعقد ہو جائے گی، کیونکہ تعاطی ایک جانب سے بھی جائز ہو جاتی ہے۔
- اگر بوقتِ عقد مشتری یا مشتری کا وکیل بائع کے پاس مبیع وصول کرنے کے لیے موجود ہو تو بائع کی جانب سے مبیع اور سامان میں تخلیہ کرتے ہی فوراً مبیع کا ضمان مشتری پر منتقل ہو جائے گا۔
- اگر مشتری یا اسکا وکیل بائع کے پاس موجود نہ ہو تو عالمی تجارت کے عرف اور قوانین کے مطابق جس وقت ٹرانسپورٹ کمپنی یا بندرگاہ اتھارٹی کو مبیع کے حوالے کرے اس وقت مشتری پر ضمان منتقل ہوگا، خواہ مشتری نے خود کمپنی (بائع) پسند کر کے آرڈر دیا ہو یا بائع نے آفر قبول کر کے مشتری کے اذن یا حکم سے اس کی تعیین کی ہو۔
- ٹرانسپورٹ کے مصارف کا ذمہ عقد میں متعاقدین کے طے کرنے کے مطابق ہوگا۔

جب بائع کی طرف سے سامان ارسال کر دیا جائے، ٹرانسپورٹ کمپنی مشتری کی جانب سے وکیل بالقبض ہو اور اس طرح ضمان مشتری پر منتقل ہو جائے تو مشتری کے لیے جائز نہ ہوگا کہ جب تک سامان بندرگاہ پر نہ پہنچے اور وہ خود یا اس کا وکیل قبضہ نہ کر لے وہاں تک کسی تیسرے کو فروخت کرے۔(۱)

بینک سے جاری ہونے والے کارڈ کے احکام

بینک سے مختلف کارڈ جاری ہوتے ہیں، ان کی حیثیت ایک معتبر دستاویز کی ہے جو بینک کسی شخص یا ادارہ کو اس لیے دیتا ہے کہ وہ اس کے ذریعے قیمت ادا کیے بغیر سامان

---

(۱) حوالہ سابق ص:۱۰۱، ۱۰۲، لیٹر آف کریڈٹ کی وضاحت۔ جدید معیشت وتجارت :۱۱۹، ۱۲۰، فقہی مقالات:۱/ ۹۶، ۹۸، ۱۰۱۳

خریدے یا خدمات حاصل کرے، اور بینک اس کا معاوضہ ادا کرنے کا ضامن ہوتا ہے، یہ کارڈ اپنی خدمات اور سہولتوں کے اعتبار سے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔

(ا) اے ٹی ایم کارڈ

(بطاقات اجهزة الصراف الآلى"بطاقات الحساب الجارى")

(Autamatid teller machine card)

بینک اپنے کھاتہ داروں کو یہ کارڈ اس غرض سے جاری کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے شہر یا ملک یا کسی اور دوسری جگہ کہیں بھی موجود اے ٹی ایم نظام سے اپنی ضرورت کے بقدر رقم بصورت نقد حاصل کر سکے، اس کارڈ کے ذریعہ آدمی اپنی جمع شدہ رقم سے ہی استفادہ کر سکتا ہے، اس لیے الگ سے کوئی معاوضہ کسی عنوان سے ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، جہاں تک رقم کی حفاظت اور بوقت ضرورت رقم کی واپسی کی بات ہے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں؛ کیوں کہ اس کی حیثیت قرض کی ہے، بینک لوگوں سے خواہش کرتا ہے کہ لوگ اسے پیسے دیں، وہ پیسے دینے والے کے حسبِ خواہش اسے ادا کرے گا، اس طرح بینک کی حیثیت قرض لینے والے کی ہوئی اور کھاتہ دار کی حیثیت قرض والے کی، نیز اے ٹی ایم کارڈ کی حیثیت قرض کے وثیقہ کی ہوئی کہ قرض دہندہ جب چاہے کارڈ دکھا کر اسے حاصل کرے، اے ٹی ایم سے استفادہ کے جواز کے سلسلے میں علماء کا اتفاق ہے۔(۱)

فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے پندرہویں فقہی سمینار میں اے، ٹی، ایم کارڈ کی شرعی حیثیت کے بارے میں درج ذیل فیصلہ کیا ہے:

> ''چونکہ معاملات میں اصل اباحت ہے، اس لیے اے ٹی ایم کارڈ کے ذریعہ مشین سے اپنی جمع کردہ رقم نکالی جاتی ہے، اس کے استعمال میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے''۔(۲)

---

(۱) احکام مال حرام:۵۵

(۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے:۱۸۳

پھر A.T.M کارڈ دو طرح کے ہوتے ہیں:

۱) (Domestic card)

یہ وہ کارڈ ہے جو صرف کسی ایک ملک کے حدود کے اندر استعمال کیے جاسکتے ہیں، بینکوں کے آپس میں کیے گیے معاہدات کے تحت ان کارڈوں کو کسی بھی بینک کی اے ٹی ایم مشین میں استعمال کیا جاسکتا ہے، کارڈ جاری کنندہ کی طرف سے نصب شدہ مشینوں کو استعمال کرنے کی صورت میں کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی، جب کہ دیگر بینکوں کی نصب کردہ مشینوں سے استفادہ کی صورت میں ایک مخصوص رقم فیس کی مد میں کاٹی جاتی ہے۔

۲) International card

یہ کارڈ انٹرنیشنل کمپنیوں کے زیر انتظام استعمال کیا جاتا ہے، اس کارڈ کا حامل اسے پوری دنیا میں جہاں بھی چاہے استعمال کرسکتا ہے، جیسے (Visa International) کی طرف سے جاری کردہ (Visa Electronic card) اور master کمپنی کی طرف سے جاری کردہ (Master card) وغیرہ، یہ کارڈ عام طور سے بینک ہی جاری کرتے ہیں، ان کا تعلق حامل کارڈ کے اکاؤنٹ کے ساتھ ہوتا ہے، اکاؤنٹ میں موجود رقم کے بقدر ہی وہ اس کارڈ کے ذریعے A.T.M مشینوں کے ذریعے نقدی حاصل کرسکتا ہے۔(۱)

اے ٹی ایم (A.T.M) سے قرض کی ادائیگی

آج کل بعض لوگ اپنے قرضوں کی ادائیگی اے ٹی ایم (A.T.M) کے ذریعہ کرتے ہیں، مثلاً ایک شخص کسی سے ایک ہزار روپے قرض لیتا ہے، اور مقررہ وقت پر قرض خواہ کے اے ٹی ایم میں ایک ہزار روپے ڈال دیتا ہے، بینک اپنا سروس چارج ۲۵ روپئے اس میں سے کاٹ لیتا ہے، تو قرض خواہ کو اس کی پوری رقم ایک ہزار کے بجائے ۹۷۵ روپے ہی ملتی ہے، جب کہ وہ پورے ایک ہزار کا حقدار ہے، اس لیے

---

(۱) کریڈٹ کارڈ کا تعارف اور فقہی جائزہ ص:۲۲۸

ادائیگی قرض کی یہ صورت درست نہیں ہے، البتہ اے ٹی ایم (A.T.M) کے ذریعہ ادائیگی قرض کی یہ صورت اس وقت درست ہوجائے گی جب کہ قرض کی رقم کے ساتھ بینک کا سروس چارج بھی قرض خواہ کے اکاؤنٹ میں ڈالدے۔(۱)

(۲) ڈیبٹ کارڈ (Debit card)

اس کے ذریعہ تین طرح کے منافع حاصل کیے جاسکتے ہیں، ضرورت کے وقت رقم نکالی جاسکتی ہے، خرید و فروخت کے بعد قیمت کی ادئیگی کی جاسکتی ہے، ضرورت پر رقم اپنے کھاتے سے دوسرے کھاتے میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

ڈیبٹ کارڈ کا حامل اپنی جمع کردہ رقم سے استفادہ کرتا ہے، اس سے زیادہ سے نہیں اور بینک اسے جو خدمات مہیا کرتا ہے اس کے لیے الگ سے کوئی اجرت نہیں لیتا، صرف کارڈ بنانے کے وقت اس کی فیس لی جاتی ہے، جہاں تک بوقت ضرورت رقم نکالنے کی سہولت تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اب رہ گیا بینک کا اس کی طرف سے قیمت ادا کرنا یا کسی وجہ سے کسی دوسرے کے کھاتے میں رقم منتقل کرنا تو یہ بھی درست ہے، اگر کارڈ، ہولڈر پر کسی کا قرض باقی ہو اور بینک کے ذریعہ قرض ادا کیا جائے، فقہ کی اصطلاح میں یہ حوالہ ہوا، حوالہ سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کے ذمہ دین ہو وہ کسی کو اپنی طرف سے دین کی ادائیگی کا ذمہ دار بنادے اور وہ دوسرا شخص اس کی طرف سے ادئیگی کی ذمہ داری قبول کرلے: تحويل الدين من ذمة الأصلي إلى ذمّة المحتال عليه۔(۲)

اور جس شخص کو ادا کیا جارہا ہے اگر کارڈ ہولڈر کے ذمہ پہلے سے اس کی رقم باقی نہ ہو تو بینک کی حیثیت اس کی طرف سے وکیل کی ہوگی اور یہ بھی جائز ہے:

قال المؤكل خذ هذا الألف يا فلاں وادفعه إلى فلان فأيها ما قضى جاز قياسا واستحسانا (۳)

---

(۱) اہم مسائل جن میں ابتلاءعام ہے: ۲۲۰/۵

(۲) عناية على الهداية مع الفتح: ۲۳۸/۷

(۳) فتاوی خانیہ مع الهندية: ۴۶۹/۵

- بینک یہ کارڈ اسی شخص کو دیتا ہے، جس کا کھاتہ بینک میں موجود ہو۔
- جتنا بقایا اس کا بینک کے پاس ہو، زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم نکالنے کی اس کو اجازت ہوتی ہے۔
- اس کارڈ کے ذریعہ نقد رقم نکالی جاسکتی ہے، سامان بھی خرید کیا جاسکتا ہے، خدمات جیسے ہوٹل میں رہائش، ہوائی جہاز میں سفر کی سہولت وغیرہ کی اجرت بھی ادا کی جاسکتی ہے۔
- کارڈ ہولڈر جتنی رقم استعمال کرتا ہے، بینک اس کے اکاؤنٹ سے اس کو حاصل کرلیتا ہے۔(۱)

رہ گئی فیس کارڈ کی بات تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی؛ کیوں کہ رقم کی منتقلی وغیرہ کے سلسلہ میں جو ضروری کاروائی کرنی پڑتی ہے، اس کی اجرت ہے اور فقہاء نے ایسے کاموں کے لیے اجرت کو جائز قرار دیا ہے، معروف حنفی فقیہ علامہ حصکفی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: لیستحق القاضی الأجر علی کتب الوثائق أو المحاضرات أو السجلات قدر ما یجوز لغیرہ کالمفتی۔(۲) قاضی وثیقہ، محضر وغیرہ کے لکھنے پر اس مقدار اجرت کا مستحق ہوگا جو دوسرے کو جیسے مفتی کو دی جاتی ہے۔(۳)

ڈیبٹ کارڈ سے حاصل ہونے والی خدمات

کارڈ ہولڈر مذکورہ کارڈ کے ذریعہ درج ذیل خدمات حاصل کرسکتا ہے:

۱) اشیاء کی خریداری اور کارڈ کے ذریعہ ادائیگی، کیونکہ دوکاندار کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کارڈ کے ذریعہ فروخت کی ہوئی اشیاء کی قیمت اپنے اکاؤنٹ تک پہنچائے۔

۲) ضرورت کے مطابق نقد رقم نکالنا۔

---

(۱) جدید مالیاتی ادارے: ۳۲

(۲) درمع الرد: ۹/۱۲۷

(۳) درمع الرد: ۹/۱۲۷

۴) انٹرنیٹ کے ذریعہ اپنے اکاؤنٹ سے کسی اور کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کرنا۔

اس کارڈ کے ذریعہ ائتمان (اعتماد) کی بنیاد پر نہ قرض ملتا ہے اور نہ ہی کوئی اور خدمت فراہم کی جاتی ہے، بعض کمپنیاں یہ کارڈ مفت دیتی ہیں، عام طور پر فیسوں کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا، البتہ اگر صارف نے کارڈ جاری کنندہ کے علاوہ کسی دوسری کمپنی کے واسطے سے رقم نکلوائی یا کوئی اور خریداری کی تو اس کی فیس لی جاتی ہے، غالب طور سے یہ کارڈ کسی بھی ملک کے حدود کے اندر، جہاں اس بینک کی شاخیں ہوں اور وہ کمپیوٹرائز نظام سے منسلک ہوں جس سے صارف کے اکاؤنٹ اور بیلنس کا پتا چلتا ہے، وہاں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بعض کمپنیاں کارڈ کو قبول کرنے والے تاجروں سے فروخت کی گئی اشیاء اور خدمات کے ثمن سے کمیشن لیتی ہیں۔

کارڈ ہولڈر کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اکاؤنٹ میں موجود بیلنس سے بڑھ کر کوئی خریداری یا خدمات حاصل کرے کہ وہ مدیون بن جائے، البتہ بعض مؤسسات اس کارڈ پر قرض کی سہولت بھی فراہم کرتی ہیں، اس وقت یہ کریڈٹ کارڈ کہلانے کا زیادہ مستحق ہوگا بنسبت اس کے کہ اس کو ڈیبٹ کارڈ کہا جائے۔

چونکہ اس کارڈ کے ذریعہ صارف کو قرض فراہم نہیں کیا جاتا، صارف کے اکاؤنٹ سے خریداریوں کی قیمت فوراً وصول کی جاتی ہے اسی وجہ سے اس کو فوری ادائیگی کا کارڈ بھی کہا جاتا ہے۔

A.T.M کارڈ کو بھی اس نوع کے کارڈوں میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں بھی صارف کا بینک میں اکاؤنٹ ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ڈاکٹر علی القری کہتے ہیں کہ ڈیبٹ کارڈ کریڈٹ کارڈز میں سے نہیں، اور کریڈٹ کارڈز کے بارے میں جب گفتگو کی جاتی ہے تو مذکورہ کارڈ اس سے مقصود نہیں ہوتا ہے۔ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہم نے پہلے یہ بتایا کہ ڈیبٹ کارڈ کریڈٹ کارڈ میں سے نہیں، اور نہ ہی اس کی کوئی زیادہ اہمیت ہے، روز بروز اس کا تعامل کم ہوتا جارہا ہے۔

اس کارڈ کا فائدہ یہ ہے کہ صارف نقد رقم ساتھ لے جائے بغیر سہولت وآسانی سے نقدی، اشیائے ضرورت اور دیگر خدمات حاصل کرسکتا ہے۔ بعض بڑے یورپی (انگریزی) بینکوں نے (Swich card) اور Barclay card کے نام سے اسی طرح کے کارڈ جاری کیے ہیں، تاکہ حامل کی طرف سے کی گئی خریداریوں کی ذمہ داری انہیں قبول کرنا نہ پڑے، ۵۰ جنیہ سے زائد ضمان کو وہ قبول نہیں کرتے۔

فقہ اکیڈمی انڈیا کا فیصلہ

اس مسئلہ میں فقہ اکیڈمی انڈیا کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ڈیبٹ کارڈ کے ذریعہ خرید وفروخت اور ایک کھاتہ سے دوسرے کھاتہ میں رقم کی منتقلی درست اور جائز ہے۔(۱)

ڈیبٹ کارڈ کے جواز کی شرائط

ڈیبٹ کارڈ کے جواز کے لیے عام طور سے دو شرطیں بیان کی جاتی ہے:

۱) کارڈ ہولڈر اپنے بیلنس سے نقدی اور خریداری کی سہولت حاصل کرے۔

۲) اس پر کوئی سودی فائدہ حاصل نہ کیا جائے۔

اس کارڈ کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ''المعاییر الشرعیۃ'' کی املائی تقریر میں تفصیلی بحث کی ہے اس میں حضرت فرماتے ہیں:

اس میں یہ سوال نہیں ہوتا کہ مہینے پر بل بھیجے، پھر ساٹھ دن انتظار کرے اور پھر ادائیگی کی تاخیر میں سود لگے، وغیرہ وغیرہ، یہ قصہ نہیں رہتا بلکہ براہِ راست ادائیگی ہوجاتی ہے۔

نوٹ: اس کارڈ اور اس پر وصول کی جانے والی فیسوں کے بارے میں مزید تدقیق اور غور وفکر کی ضرورت ہے، اس کارڈ کی حقیقت سے صرف نظر کرکے صرف دو شرطوں کی بنیاد پر اس کو سند جواز فراہم کرنا غیر محتاط طرز عمل شمار کیا جائے گا۔

---

(۱) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۸۳

ڈیبٹ کارڈ کے استعمال پر منافع کی اسکیم

اسٹیٹ بینک آف انڈیا (SBI) اپنے صارفین کو یہ اسکیم دیتی ہے کہ اگر صارف اس کا ''ڈیبٹ کارڈ'' استعمال کر کے کچھ خریداری کرے تو وہ پانچ فیصد نقد واپس کرتی ہے، مثلاً کوئی شخص ۵/ہزار کا سامان ''ڈیبٹ کارڈ'' سے خریدے تو بینک پانچ فیصد کے حساب سے ساڑھے سات سو روپے واپس کرتی ہے، توشرعاً اس واپس شدہ رقم لینے کا حکم سے متعلق حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ

> ''ایس بی آئی (SBI) جو اپنے صارفین کو اسکیم دیتی ہے کہ وہ اس کے ڈیبٹ کارڈ سے جو کچھ خرید کرے گا اس کا پانچ فیصد بینک اس کو واپس کرے گا، تو بظاہر اس کو جائز ہونا چاہئے؛ کیوں کہ بینک از خود اپنا ڈیبٹ کارڈ استعمال کرنے والے کو یہ رقم دیتی ہے، یہ اس کی طرف سے عطیہ یا انعام ہے، دوسرے فریق کی طرف سے مطالبہ نہیں ہے کہ بینک اسے رقم ادا کرے، ربا تو اس وقت ہوتا جب دونوں کے درمیان عقد ہو اور اس میں ایک فریق ایسے اضافہ کا مطالبہ کرے جو خالی عن العوض ہو، اگر ایک فریق اپنے طور پر دوسرے فریق کے مطالبہ کے بغیر کوئی رقم بڑھ کردے، تو یہ ربا میں شامل نہیں ہے اور اس کی تاویل یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ چوں کہ ڈیبٹ کارڈ بینک کا ہے تو گویا بینک نے مال خریدا اور کم قیمت میں کارڈ ہولڈر سے فروخت کیا، جس کو فقہ کی اصطلاح میں ''بیع وضیعہ'' کہتے ہیں اور یہ شکل جائز ہے''
>
> وجائز لمن أتی السوق من أهله، أو من غير أهله أن يبيع سلعته بأقل من سعرها في السوق وبأكثر ولا اعتراض لأهل السوق عليه في ذلك ولا السلطان''(۱)

---

(۱) المحلی بالآثار، کتاب البیوع: ۷/۳۵/۷

(۴) کریڈیٹ کارڈ (Credit card)

کریڈیٹ کارڈ دو طرح کے لوگوں کو جاری کیا جاتا ہے ایک اس شخص کو جس کا پیسہ بینک میں جمع ہے، البتہ وہ اپنی جمع شدہ رقم کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، دوسرے وہ شخص جس کی رقم بینک میں جمع نہیں ہے، بینک اس کے حالات معلوم کر کے اس کی مالی حیثیت متعین کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کی ماہانہ اور سالانہ آمدنی کیا ہے؟ اسی مناسبت سے اس کے کارڈ جاری کرتا ہے، اس کارڈ سے وہ فوائد تو حاصل ہوتے ہی ہیں جو ڈبیٹ کارڈ سے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اس سے مزید ایک سہولت قرض حاصل کرنے کی ہوتی ہے ایک متعین حد تک کارڈ ہولڈر اپنے کھاتہ میں پیسہ نہ ہونے کے باوجود رقم لے سکتا ہے، اب اگر اس نے پچاس دنوں کے اندر رقم ادا کر دی تو اسے کوئی زائد رقم دینی نہیں پڑتی، اگر پچاس دنوں سے مدت بڑھ گئی تو یومیہ شرح کے لحاظ سے مزید رقم ادا کرنی پڑتی ہے، نیز اس کارڈ کے حصول اور کارڈ کے مدت گزر جانے کے بعد اس کی تجدید کے لیے فیس بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔

اب جہاں تک ڈبیٹ کارڈ والی سہولتوں کے حاصل کرنے اور کارڈ کی فیس ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن قرض کی سہولت اور اس پر زائد رقم کی ادئیگی یہ سود ہے اور سود خور کی نفسیات یہی رہی ہے کہ پہلے قرض دو؛ تاکہ لوگ ہنسی خوشی نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اسے لے لیں اور جب وقت پر ادا نہ کر سکے تو زائد ادئیگی کی شرط پر مہلت دے دو، زمانۂ جاہلیت میں ربا کا یہی طریقہ زیادہ مروج تھا، جسے ربا نسیہ سے تعبیر کیا گیا ہے:

ثم إذا دخل الدين طالبوا المديون برأس المال؛ فإن تعذر عليه الأداء زادوا في الحق والأجل فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون به (۱)

پھر جب دین کی ادئیگی کا وقت آجاتا تو قرض دینے والے اصل رقم کی

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۹۱/۷

واپسی کا مطالبہ کرتے اب اگر اس کے لیے ادا کرنا مشکل ہوتا تو رقم میں بھی اضافہ کر دیتے یعنی زائد رقم کا مطالبہ کرتے اور مہلت بھی دیتے رہتے، ربا کی یہی صورت زمانۂ جاہلیت میں مروج تھی۔

اور سود کا لینا دینا دونوں حرام ہے، اس لیے کریڈیٹ کا حاصل کرنا اصولی طور پر جائز نہیں، جائز سہولتیں، ڈیبیٹ کارڈ سے حاصل ہوجاتی ہیں، یہی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ باتفاق علماء ہے کہ کریڈیٹ کا حصول جائز نہیں جو کہ جس کا حصول ہی سودی کاروبار کے معاہدہ پر ہوتا ہے۔

اس سے توبہ یہ ہے کہ آدمی کریڈیٹ کارڈ کو ڈیبٹ کارڈ سے بدل لے۔

حضرت مولانا یوسف لدھیانوی علیہ الرحمۃ کریڈیٹ کارڈ سے متعلق فرماتے ہیں کہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ چاہے وقت پر رقم ادا کر دی جائے تب بھی کریڈیٹ کارڈ جاری کرنے والا بینک کریڈٹ کارڈ لے کر اشیاء مہیا کرنے والے دکان دار سے اپنا کمیشن یا سود ہر حال میں وصول کرتا ہے، اس لیے گویا کریڈیٹ کارڈ کا استعمال کرنے والا شخص اگرچہ خود سود نہیں دیتا، مگر بینک کو سود دلانے کا ذریعہ ضرور بنتا ہے، لہٰذا اس کا استعمال ناجائز اور حرام ہے۔(۱)

- بینک یہ کارڈ بھی ایسے شخص کو دیتا ہے جس کا اکاؤنٹ بینک میں موجود ہو۔
- کارڈ ہولڈر کی رقم اکاؤنٹ میں نہ ہو یا کم ہو، تب بھی وہ کارڈ سے استفادہ کر سکتا ہے، یہ رقم اس کے ذمہ دین ہوگی۔
- کارڈ ہولڈر اس کارڈ کی بنیاد پر نقد رقم بھی حاصل کر سکتا ہے، خریداری بھی کر سکتا ہے اور اجرت ادا کر کے خدمات سے استفادہ کر سکتا ہے۔
- اس کارڈ کے ذریعے ادھار رقم یا اشیاء یا خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں اور واجبات کی ادائیگی بھی کی جا سکتی ہے۔

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/۳۴۱

- کارڈ ہولڈر مقررہ مدت کے اندر اصل رقم سے زائد حاصل کیے ہوئے قرض ادا کردینے کا پابند نہیں رہتا بلکہ تاخیر کے ساتھ بھی ادا کرسکتا ہے؛ مگر اس صورت میں اس کو سود ادا کرنا پڑتا ہے۔
- مقررہ مدت میں ادائیگی کے دوران کارڈ ہولڈر نئی ادھارداری (ادھار خریداری، خدمات کا حصول یا بطورِ قرض نقد رقم کا حصول) نئی مدت میں ان کی ادائیگی کے وعدہ کے ساتھ کرسکتا ہے، جیسے اس نے ''دس ہزار ڈالر'' کارڈ کی بناء پر بطورِ قرض خرچ کئے، جسے پچاس دنوں کے اندر ادا کرنا ہے، ابھی یہ قرض ادا بھی نہیں ہوا ہے مگر وہ آئندہ پچاس دنوں کے وعدہ پر مزید مثلاً پانچ ہزار ڈالر خرچ کرنا چاہے تو خرچ کرسکتا ہے۔
- بینک کارڈ ہولڈر کے واجبات ادا کرے گا، پھر مقررہ مدت میں اس سے وصول کرلے گا اور اگر مقررہ مدت میں اس نے ادا نہیں کیا تو ''سودی بینک'' اس سے سود وصول کریں گے۔(۱)
- فقہ اکیڈمی انڈیا نے یہ فیصلہ کیا ہے: کریڈٹ کارڈ کی مروجہ صورت چونکہ سودی معاملہ پر مشتمل ہے؛ لہٰذا کریڈٹ کارڈ یا اس قسم کے کسی کارڈ کا حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔(۲)
- دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ: کاروباری ضرورت یا مالی تحفظ کی غرض سے کریڈٹ کارڈ لینے اوراس کے استعمال کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ پہلے سے اکاؤنٹ کھلوایا جائے تاکہ کارڈ جاری کرنے والا ادارہ اپنا قرض وہاں سے وصول کرلے، اور اگر اکاؤنٹ سے فی الحال قرض منہا کرنے کا انتظام نہ ہو تو اس کی انتہائی احتیاط برتی جائے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا

---

(۱) جدید مالیاتی ادارے ص:۳۳

(۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص:۱۸۳

کردی جائے تاکہ ان پر سود لاگو نہ ہو سکے کیونکہ سود کا ادا کرنا حرام ہے، یہ کارڈ غیر اسلامی بینک سے بھی لے سکتے ہیں۔(۱)

کریڈٹ کارڈ کی خصوصیات

ماہرینِ اقتصادیات اور جدید مسائل خاص طور پر کریڈٹ کارڈ کے بارے میں بحث کرنے والے اہل علم نے اس کی درج ذیل خصوصیات بیان کی ہیں:

۱) یہ متعین شرح کے اندر وقت کے اعتبار سے بڑھتے رہنے والے قرض کا حقیقی ذریعہ ہے جس کا تعین کارڈ جاری کرنے والا ادارہ کرتا ہے، یہ ادائیگی کا بھی ذریعہ ہے۔

۲) اس کا حامل خریدے گیے سامان کی قیمت اور خدمات کا عوض ادا کرتا ہے اور جس حد تک قرض لینے کی اس کو اجازت ہوتی ہے اتنی رقم نکال سکتا ہے اور اگر کوئی حد متعین نہ ہو تو جتنی چاہے رقم نکال سکتا ہے۔

۳) اس کارڈ یعنی (Premium card) پر عام کارڈ کے مقابلے میں زیادہ فیس وصول کی جاتی ہے، اس کارڈ سے مقصود حامل کو ایک ممتاز مقام فراہم کرنا ہوتا ہے۔

۴) عام کارڈ کے مقابلے میں (premium card) ہولڈر سے تجارتی مراکز والے زیادہ سوال جواب نہیں کرتے ہیں۔

۵) اس کارڈ کے حصول کے لیے بینک میں بیلنس کا ہونا ضروری نہیں۔

۶) فوری طور سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ حامل کارڈ اور جاری کنندہ کے باہمی اتفاق سے ایک متعین وقت پر ادائیگی کی جاتی ہے۔

۷) ادائیگی قسط وار کی جاتی ہے۔

۸) بعض بینک صارفین کی مالی حیثیت کا اعتبار کیے بغیر کارڈ جاری کرتے ہیں۔

---

(۱) چند اہم عصری مسائل ص: ۲۸۷

۹) بعض بینک سالانہ تجدید کی فیس وصول نہیں کرتے، بلکہ اس کے مقابلے میں سودی فوائد کے حصول پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔(۱)

کریڈٹ کارڈ کا تاریخی پس منظر

آخری زمانے میں جبکہ بینکوں کا وجود کثرت کے ساتھ ہوا اور عالمی سطح پر رابطوں کا سلسلہ بڑھا، ابتدا میں تو برتن بطورِ کرنسی استعمال ہوئے، پھر کپڑے، پھر نمک، پھر کھانے پینے کی چیزیں اور پھر سونے اور چاندی اور آخر میں سب سے مشہور وہ کرنسی نوٹ ہے جو حکومت جاری کرتی ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کے پیچھے سونا چاندی ہے کہ نہیں، بلکہ درحقیقت اس کی اپنی اعتباری قوت پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور اس کے جاری کرنے والے ملک پر اعتماد کیا جاتا ہے بس یہی کریڈٹ کا محور بن گیا۔اس طرح جب بینکوں نے ترقی کی جس کا اہم کام امانتوں کا قبول کرنا اور قرضوں کا مہیا کرنا ہے تو اس میں ترقی پیدا ہوئی اور بجائے نقد رقوم کے منتقل کرنے کے چیک سسٹم متعارف ہوا اور پھر رفتہ رفتہ اس میں بھی ترقی ہوئی اور اس کی جگہ کریڈٹ کارڈ نے لے لی۔(۲)

کریڈٹ کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آئی

کریڈٹ کارڈ کے وجود میں آنے کی وجہ اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس بات کو علماء اور معاشیات کے ماہرین نے مختلف انداز اور تعبیرات میں بیان کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم صحیح بخاری کی درسی تقریر ''انعام الباری'' میں ''کریڈٹ کارڈ کی ضرورت کیوں پیش آئی'' کے عنوان سے فرماتے ہیں:

''وجہ اس کی یہ ہے کہ چوری، ڈاکے بہت ہونے لگے ہیں، اگر کوئی آدمی گھر سے نکلے اور اسے لمبی چوڑی خریداری کرنی ہو، اب اگر وہ جیب میں بہت سارے پیسے ڈال کر لے جائے تو خطرہ ہے کہ ڈاکہ پڑ جائے،

---

(۱) کریڈٹ کارڈ کا تعارف اور فقہی جائزہ ص: ۲۴۴

(۲) کریڈٹ کارڈ کا تعارف اور فقہی جائزہ ص ۱۳۵ مفتی ابوالخیر عارف محمود صاحب سابق استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

کوئی چھین لے جائے، خاص طور پر اگر کہیں سفر پر جارہا ہو تو ہر وقت اپنے پاس بڑی رقم لے کر پھرنے میں بہت خطرات ہیں، اس لیے اس کا ایک یہ طریقہ نکالا کہ بینک ایک کارڈ جاری کرتا ہے، جس کو کریڈٹ کارڈ کہتے ہیں''(۱)

کریڈٹ کارڈ کا مضر ومنفی پہلو

یہ کارڈ جس طرح فوائد کا حامل ہے ایسے ہی اس کے استعمال میں بہت سارے معاشی اور اسلامی نقطۂ نظر سے نقصانات کا ہونا بہت واضح ہے، سب سے بڑا نقصان اس طرح کے کارڈوں کے استعمال میں ایک مسلمان کا سود جیسی بری لعنت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔(۲)

---

(۱) حوالہ سابق ص:۱۳۶

(۲) حوالہ سابق ص:۲۱۱

ہندوستان کی حیثیت اور اس میں سود لینا

دارالحرب اوردارالاسلام سے متعلق علماء کرام کی تحقیقات

ماضی قریب کے علماء محققین میں سے دیو بند کے مایہ ناز محدث ومحقق حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک مختصر سے رسالے میں اس کی حقیقت پورے طور پر اس طرح واضح فرمائی ہے کہ:

کسی علاقہ اور ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار غلبہ پر ہے جس فریق کو غلبہ ہوگا اسی کے اعتبار سے حکم لگایا جائے گا۔ یعنی

۱) اگر کوئی علاقہ ابتداء آمد اسلام سے مسلمانوں کے زیر تسلط ہے تو وہ دارالاسلام ہے اور اگر کفار کے زیر اقتدار ہے تو دارالحرب ہے۔

۲) پھر اگر دارالحرب پر مسلمانوں کا قبضہ ہوجائے تو وہ دارالاسلام ہوجائے گا قبضہ سے مراد محض مسلمانوں کا وہاں رہنا اور اپنی عبادات کو انجام دینا نہیں بلکہ ملک کی باگ دوڑ پر قابض ہونا اور اقتدار میں شریک ہونا مراد ہے، محض مذہبی آزادی کافی نہیں ہے۔ ورنہ اگر محض اسی قدر کافی ہوتا تو دنیا کا کوئی ملک دارالاسلام بننے سے رہ نہ جاتا، اس لیے کہ شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں مسلمان نہ پہنچے ہوں اور پھر انہوں نے اپنے دین کے انفرادی واجتماعی اعمال کو وہاں انجام نہ دیا ہو لیکن کسی نے بھی ان ملکوں کے متعلق یہ حکم نہ لگایا کہ وہ دارالاسلام بن گیے بلکہ سب نے غلبہ کا اعتبار کیا ہے اور اسی پر مدار کیا ہے۔

اسی طرح اگر دارالاسلام پر پورے طور پر کافروں کا قبضہ ہوجائے تو وہ دارالحرب قرار دیا جائے گا اس قبضہ کی صورت یہ ہے کہ سارا ملک یا اربابِ اقتدار مرتد ہوجائیں یا وہاں کے اکثر باشندے کافر ہوں اور وہ دارالخلافت سے اپنی حکومت کے لیے صلح کرلیں، اس کی تیسری صورت یہ ہے کہ کافر جنگ کر کے اس پر قبضہ کرلیں خواہ وہ اسی ملک کے ہوں یا دوسرے ملک کے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لیے تین شرطوں کا اعتبار کیا ہے اول احکام شرک کا جاری ہونا۔ دوم: کسی جانب دوسرے دارالاسلام سے متصل نہ رہنا۔ سوم: دارالاسلام کے زمانے کے امان کا باقی نہ رہنا۔

خلاصہ یہ کہ دارالاسلام پر اہل شرک کا ایسا قہر وغلبہ اور ایسا استیلاء واستبداد ہوجائے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور ومغلوب ہوجائیں۔

(۳) اور اگر دونوں فریق (مسلمان، کفار) حکومت کرتے ہوں اس معنی کر کہ مسلمانوں کو بھی غلبہ حاصل ہو اگرچہ بعض وجوہ سے تو حدیث ''اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْا وَلَا يُعْلٰى''(۱) ''اسلام بلند ہی رہتا ہے اس پر کوئی چیز بلند نہیں ہوتی'' کے پیش نظر اسے دارالاسلام ہی قرار دیں گے۔(۲)

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ایک موقع پر دارالحرب کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: شرعی اصطلاح میں دارالحرب کی تعریف یہ ہے کہ جہاں پورا تسلط غیر مسلموں کا ہو'' تعریف تو یہی ہے آگے جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ امارات ہیں (یعنی علامات ہیں جن پر حکم کا مدار نہیں ہوتا اور جو زمانے کے بدلنے سے بدل سکتی ہیں اور بدلتی رہتی ہیں)۔

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب إذا أسلم الصبي فمات هل يصلي عليه؟

(۲) مستفاد از الربا (سود): ۱۶۷-۱۵۵

اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

کفار اپنا حکم علی الاشتہار جاری کر دیں کوئی خدشہ ان کو اور کوئی مانع نہ رہے تو مغلوب ہو جائیں گے اور قیاس بھی اسی کو چاہتا ہے کہ غلبہ اسی کا نام ہے کہ اپنا حکم جاری کر دیں تو کوئی مانع نہ رہے۔

اور مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمہ نے اپنے ایک فتویٰ میں دارالحرب کی تعریف ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے: **فبلاد التي زمام حكومتها بيد الكفرة فهي دار الحرب** (۱) ''جن ملکوں کے نظم ونسق کی باگ ڈور کفار کے ہاتھ میں ہو وہ دارالحرب ہیں''۔

نوٹ: مزید دارالحرب ودارالاسلام کی تفصیل اور ان کے احکام کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے ''جدید فقہی مسائل از مفتی خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم: ۴/۳۹-۵۲''۔

دارالحرب کی قسمیں

''دارالاسلام'' کا مدمقابل ''دارالحرب'' ہی ہے۔ یعنی ساری دنیا کے ممالک وحکومتیں اسلامی نقطۂ نظر سے دو ہی قسموں میں منحصر ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ جو علاقے دارالحرب ہوں ان سب کا مسلمانوں کے ساتھ معاملات میں ایک روش پر ہونا ضروری نہیں ہے، کہیں پر اسلام کی حکومت نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں سے تعرض نہ کیا جاتا ہوگا اور کہیں پر ان کا قیام وآرام بالکل نہ برداشت کیا جاسکے گا، جیسا کہ آج کے موجودہ حالات میں مشاہدہ بھی ہے۔ اس اختلاف حال کے پیش نظر ''دارالحرب'' کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ دارالحرب ہے جہاں مسلمانوں کے لیے اسلامی شعائر اور احکام شرع کی بجا آوری ناممکن ہو رہی ہو اور اس پر پابندی عائد کی جاتی ہو، دوسری قسم یہ ہے کہ وہاں حکومت تو اہل کفر کی ہی ہو؛ لیکن مسلمانوں کو اپنے مذہبی احکام وعبادات کی ادائیگی کی

---

(۱) حوالہ سابق: ۱۶۸-۱۷۰

پوری اجازت وآزادی ہو۔ جیسا کہ مکہ مکرمہ اور حبش کا حال تھا ''مکہ'' میں دارالحرب ہونے کے ساتھ پابندیاں تھیں اور حبش میں آزادی۔(۱)

جس دارالحرب میں مذہبی آزادی ہو اس کو ''دارالامن'' اور جہاں مذہبی آزادی نہ ہو اس کو ''دارالخوف'' بھی کہا جاتا ہے۔

اس حوالے سے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

> ''عموماً دارالحرب کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جہاں حرب (جنگ) واجب ہو، پھر دارالحرب کے معنی دارالکفر کے ہیں لیکن پھر اس دار الکفر کی دوقسمیں ہیں: ایک ''دارالامن'' دوسرے ''دارالخوف''۔

''دارالخوف'' وہ ہے جہاں مسلمان خوفناک ہوں اور ''دارالامن'' وہ ہے جہاں مسلمان خوفناک نہ ہوں، دارالامن میں بہت سے احکام مثل دارالاسلام کے ہوتے ہیں۔

اس لیے ''دارالکفر'' کا مصداق کوئی ملک اگر ایسا ہے کہ وہاں نظام کفر واحکامِ کفر کا غلبہ واقتدار ہے مگر مسلمان اس میں اپنی عبادات کی انجام دہی میں آزاد ہے جیسے کہ حبشہ کو ہجرت کرنے والے مسلمان تو ایسے ملک کو دارالکفر ہونے کے باوجود ''دارالحرب'' نہیں کہیں گے، بلکہ ''دارالامن'' کا نام دے سکتے ہیں، جیسے کہ مصالحت کا معاملہ ہونے پر ''دارالمسالمۃ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر وہ ملک ایسا ہے کہ اس میں مسلمانوں کی جان ومال اور ان کے دین سے تعرض ہوتا ہو تو وہ ''دارالحرب'' ہے۔(۲)

ہندوستان کی شرعی حیثیت

دارالحرب کی تعریف اور مذکورہ بالا تفصیل کے بعد یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ چونکہ اس ملک میں کافروں کی (غیروں کی) حکومت

---

(۱) الربا (سود): ۱۷۳-۱۷۴

(۲) حوالہ سابق: ۱۷۵-۱۷۶

ہے، اور ان ہی کا تسلّط ہے تو اس اعتبار سے اس کو دارالحرب کہا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ اس ملک میں مذہبی پابندیاں نہیں ہیں، بلکہ جس طرح مذہبی آزادی ہے اس اعتبار سے اس کو ''دارالامن'' بھی کہا جاسکتا ہے جو کہ دارالحرب ہی کی ایک قسم ہے (یعنی ایسا دارالحرب جس میں مذہبی آزادی اور امان ہے) اور یہی علماء کے درمیان اختلاف کی بنیاد ہے جیسا کہ حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی تحریر سے واضح ہو چکا ہے۔

جب شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی علیہ الرحمۃ سے مسٹر برن نے ہندوستان کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے سے متعلق سوال کیا تو حضرت نے فرمایا کہ میرے نزدیک دونوں صحیح ہیں۔

چونکہ اس ملک میں کافروں کی حکومت ہے اور وہ اس قدر بااقتدار ہیں کہ جو حکم چاہیں جاری کریں لہٰذا یہ ''دارالحرب'' ہے۔ اور چونکہ اس ملک میں اعلانیہ طور پر شعائر اسلام اور احکام اسلام کے ادا کرنے کی ممانعت نہیں ہے، نیز اس ملک سے ہجرت بھی واجب نہیں ہے لہٰذا اس اعتبار سے یہ دارالحرب نہیں ہے، اور فرمایا کہ جن لوگوں نے اس ملک کو ''دارالحرب'' کہنے سے احتراز کیا ہے غالباً انہوں نے اسی کا خیال کیا ہے۔(۱)

خلاصہ: دارالحرب کے معنی دارالکفر کے ہیں لیکن پھر اس دار کی دو قسمیں ہیں ایک دارالامن دوسرے درالخوف۔ چنانچہ ہندوستان درالحرب (بمعنی دارالکفر) ہے لیکن ہے دارالامن، کیونکہ غیر مسلموں کے پورے تسلط کے باوجود مسلمان خوفناک نہیں۔ دوسری طرف دستوری اعتبار سے مسلمانوں کو بھی وہی شہری حقوق حاصل ہیں جو غیر مسلموں کو ہیں، اسی دستور کی بنیاد پر مسلمان اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں اور ملک کی عدالتیں جائز شکایتوں کو سن کر ان کے ازالہ کی کوششیں کرتی ہیں اسی لیے اکابر مفتیان کرام نے ہندوستان کو دارالامن یا دارالجمہوریۃ کا نام دیا ہے۔ جبکہ یہاں زیادہ تر معاملات میں دارالاسلام ہی کے احکام پر عمل درآمد ہوتا ہے۔

---

(۱) مستفاد از الربا: ۱۷۴

نیز موجودہ ہندوستان کے درالامن ہونے کی صراحت فتاویٰ نظامیہ جدید فقہی تحقیقات اور ایضاح النوادر میں بھی مذکور ہے۔(۱)

دارالحرب میں سودی معاملہ

دارالحرب اور دارالاسلام دونوں کے بنیادی قوانین اور اساسی اصول حکمرانی چونکہ مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہر دو قسم کے ملکوں کے اعتبار سے مسلم وغیر مسلم کے حق میں بعض احکام مختلف ہوتے ہیں۔

انہیں احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ دارالاسلام میں رہنے والے کسی فرد کے لیے ربا (سود) کا لین دین جائز نہیں اگر چہ وہ غیر مسلم کیوں نہ ہو حتی کہ دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں کے لیے جو شرطیں رکھی جائیں گی ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہوگی کہ وہ ربا کا کاروبار نہ کر سکیں گے، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ کافر دارالحرب کا باشندہ ہے اور چند دنوں کے لیے امان لیکر دارالاسلام آیا ہے تو وہ بھی دارالاسلام میں رہنے والے کسی کافر (ذمی) سے یہ سودی معاملہ نہیں کر سکتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مسلمان جو دارالاسلام کا باشندہ ہے اور چند دنوں کے لیے امان لیکر دارالحرب آیا ہے تو کیا اس کے لیے بھی یہی پابندی ہے کہ وہ دارالحرب میں سودی لین دین نہیں کر سکتا؟ یا اس کے لیے کچھ رخصت بھی ہے؟ کیونکہ فقہ کی بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالحرب میں امان لے کر رہنے والا مسلمان وہاں کے باشندوں کے ساتھ سودی معاملہ کر سکتا ہے۔

تو اس مسئلہ میں چونکہ اختلاف ہے:

۱) امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ، امام محمد علیہ الرحمہ، سفیان ثوری علیہ الرحمہ اور مشہور تابعی فقیہ ابراہیم نخعی علیہ الرحمہ جواز کے قائل ہیں۔

۲) ان کے علاوہ باقی سب جمہور فقہاء وائمہ (امام مالک علیہ الرحمہ، امام شافعی علیہ الرحمہ،

---

(۱) ایضاح النوادر: ۸۹، فتاویٰ نظامیہ: ۱/ ۲۲۲، جدید فقہی تحقیقات: ۲/ ۳۱۱

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ وغیرہ) ہر حال میں عدم جواز کے قائل ہیں۔

پھر جواز کے قائل فقہاء کرام بھی دار الحرب میں سود کو ایک غریب مرسل حدیث کو بنیاد بنا کر چند قیود کے ساتھ جائز کہتے ہیں۔ کہ یہ معاملہ:

۱) دار الحرب میں ہو۔
۲) ربا کا معاملہ کافر حربی سے ہو۔
۳) معاملہ کرنے والا وہ مسلمان ہو جو دار الحرب میں ویزے پر رہائش پذیر ہے یا وہ مسلمان ہو جو دار الحرب ہی میں اسلام لایا ہو۔
۴) دار الحرب میں رہنے والا مسلمان اصلی یا ذمی نہ ہو۔(۱)
۵) بدلین یعنی معاملہ کرنے والے ہر دو اشخاص کا مال معصوم ہو حلال ہو۔
۶) بدلین شرعاً متقوم ہوں لہٰذا اگر کوئی ان کو ضائع کردے تو تاوان دینا پڑے گا۔
۷) بدلین دونوں میں سے کسی ایک ہی کی ملکیت نہ ہوں بلکہ ہر بدل کا مالک الگ الگ ہو۔(۲)

"لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" سے استدلال

جو لوگ دار الحرب میں مسلمان مستامن (وہ مسلمان جو دار الحرب میں امان لیکر چند دن رہنے کے لیے آیا ہو) کے لیے سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں ان کے اس قول کی بنیاد یہی روایت ہے جس کو مکحول نے مرسلاً روایت کیا ہے کہ مسلمان مستامن اور حربی کافر کے درمیان سود نہیں ہوتا یعنی ان دونوں کے درمیان سود کا تحقق نہیں ہوتا، لہٰذا سودی لین دین کرنا ان کے لیے جائز ہوگا۔

لیکن یہ بات نہایت قابلِ غور ہے کہ اکثر اہلِ علم اور اہلِ فن نے اس کو قابل

---

(۱) مستفاد از فتاویٰ بینات: ۹۶/۴

(۲) بدائع الصنائع: ۱۹۲-۱۹۳ بحوالہ الربا (سود): ۲۲۲

استدلال تسلیم نہیں کیا ہے، امام شافعی رحمہ اللہ کا بیان ہے: ”هذا حديث ليس له ثبات لا حجة فيه“ خود عینی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”هذا حديث غريب ليس له أصل سند“ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”لم يرد في صحيح ولا في مسند ولا كتاب موثوق به“

مرسل بے شک معتبر ہے لیکن قرآن مجید کی صریح آیات، کثرت سے صحیح وصریح روایات اور دین کے اصولِ مسلّمہ کے خلاف محض ایک مرسل روایت جس کا قابل استدلال ہونا بھی اہل فن کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے کیونکر راجح اور معتبر ہوسکتی ہے؟ اس لیے حق یہی ہے کہ اتنے واضح اور قوی دلائل پر اس حدیث کو ترجیح دینا مشکل ہے یہ تو اس روایت کے ذریعے ثبوت کا حال ہے۔

ربا کی حلت پر اس حدیث کی دلالت بھی قطعی اور صریح نہیں ہے۔ احناف کا استدلال اس امر پر موقوف ہے کہ روایت میں ''لا'' کو نفی کے معنی میں لیا جائے اور یہ مفہوم سمجھا جائے کہ مسلم اور حربی کے درمیان ربا ہوتا ہی نہیں۔ لیکن اگر اس کو نہی اور ممانعت کے معنی میں لیا جائے تو معنی یوں ہوں گے کہ ربا مسلم اور حربی کے درمیان بھی ممنوع ہے'' اسی کو امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے معنی ہیں: ”لا يباح الربا في دار الحرب“ (دارالحرب میں ربا جائز نہیں) ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اس پر خود قرآن مجید کے طریق تعبیر سے استدلال کیا ہے کہ قرآن نے ”فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج“ میں ''لا'' کو نہی اور ممانعت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، پس اگر اس مفہوم اور توضیح کو قبول کرلیا جائے تو یہ حدیث بھی جمہور کے حق میں ہے۔ (۱)

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ بھی استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ دارالحرب میں سود یا سودی معاملہ جائز ہے۔

---

(۱) جدید فقہی مسائل: ۷/۳۶-۳۷

راجح قول اور اکابر کے فتاوے

چونکہ معاملہ ربا کا ہے جس کی حرمت قرآنی آیتوں سے (بغیر کسی قید کے) منصوص ہے، نیز قرآن وحدیث میں ربا سے متعلق بیشتر وعیدیں وارد ہوئی ہیں پھر فقہاء کرام کا اصول "إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" کہ جب حلال وحرام کہیں جمع ہوجائیں تو حرام کو غلبہ دیا جائے گا، اس لیے بیشتر علماء، مفتیان کرام نے اس بارے میں جمہور فقہاء کے مسلک کو ترجیح دی ہے یعنی ہر حال میں ہر کسی سے سودی معاملہ کرنا حرام ہے دار الحرب میں بھی حرام ہے، یہی زیادہ احوط ہے، اور حضرات طرفین کے مسلک کو مرجوح قرار دیا گیا ہے۔

امام شعبی علیہ الرحمہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ ہم نے حلال روزی کے دس حصوں میں سے نو حصے ربا کے ڈر سے چھوڑ دیے۔(۱)

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"ایک جانب طرفین، دوسری جانب جمہور علماء، آخر طرفین کے مسلک کو کیسے ترجیح دی جائے گی"

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمہ نے فتویٰ میں لکھا ہے کہ بلادِ حربیہ میں بھی کفار سے سود لینا درست نہیں ہے۔(۲)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"اول تو اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف مخالف ہیں اور طرفین کے دلائل مخدوش۔ اور رسم المفتی میں قاعدہ مقرر ہو چکا ہے کہ اقوالِ علماء کے درمیان تعارض کے موقع پر قوتِ دلیل پر نظر کرنی چاہیے اور جب اس کی اہلیت نہ ہو تو اس کا حکم دوسرا ہے، پھر امام صاحب علیہ الرحمہ

---

(۱) کنز العمال باب الربا بحوالہ الربا (سود): ۲۳۱

(۲) فتاویٰ رشیدیہ ص: ۵۰۲

کا قول مؤول بھی ہے''۔(۱)

مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی (صدر مفتی اول دارالعلوم دیوبند) اپنے ایک فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

''حرمتِ ربا کے سلسلے میں آیات قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ میں جو وعید وارد ہوئی ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب عمومِ حرمت ربا کا ہے اور ہمارے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ ائمہ کے درمیان جب اختلاف ہو تو اعتبار قوت دلیل کا ہوتا ہے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل کی قوت ظاہر ہے لہٰذا اس تقریر پر ربا حرام ہی ہوگا''۔(۲)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس مسئلہ میں اختلاف ہے، امام صاحب کی روایت ہے کہ جائز ہے، لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ دیگر ائمہ ہر جگہ سود کو حرام فرماتے ہیں اور اسی میں احتیاط ہے ہم لوگوں کا فتویٰ عدم جواز کا ہے''۔(۳)

فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول احوط ہے، کہ ان کے نزدیک سود کی بالکل اجازت نہیں۔(۴)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''دارالحرب میں کفار سے سود لینا عند الجمہور حرام ہے، ائمہ ثلاثہ اور احناف میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ حرمت کے قائل ہیں، لہٰذا محققین

---

(۱) ملخص از تحذیر الاخوان:۸ بحوالہ الربا (سود):۲۲۸

(۲) عزیز الفتاویٰ:۷/۳۰۰ بحوالہ الربا (سود) ص:۲۳۱

(۳) فتاویٰ دارالعلوم:۵/۶۰

(۴) محمودیہ:۴/۱۹۸

کا فتویٰ ہے کہ ہندوستان میں بھی کفار سے سود لینا حرام ہے''(۱)

حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''دار الحرب میں سود دینے کی اجازت نہیں''۔(۲)

حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اعلاء السنن میں فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ سود سے بچنا اگرچہ حربی کے ساتھ دارالحرب میں ہو احسن واحوط ہے، نیز اختلاف سے بچنا ہے، یہی رائے ہمارے شیخ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور انہوں نے اسی کا فتویٰ دیا ہے۔(۳)

خلاصۂ بحث: دارالحرب میں جواز وعدم جواز دونوں طرح کی رائیں ہیں لیکن احوط قول عدم جواز کا ہے یہی ہمارے اکابر کا فتویٰ ہے۔

دارالحرب میں سود کو حلال قرار دینے میں فتنہ

حلت وحرمت کی رعایت کی بنا پر احتیاط کے علاوہ ایک اور امر جوان حضرات کے نزدیک اس احتیاط کا داعی تھا، حضرت تھانویؒ نے اسے اپنے الفاظ میں ذکر فرمایا ہے:

> ''سود کا جائز ہونا جی کو نہیں لگتا۔ دوسرے اگر ہو بھی سہی تو اجازت میں عوام کے لیے بہت بڑا فتنہ ہے کیونکہ ان میں قیاس فاسدہ کا مادہ بہت ہوتا ہے، کیا عجب ہے کہ تھوڑے دنوں میں یہ قیاس کرنے لگیں کہ زنا بھی کافر سے جائز ہے، اس طرح سے کہ اول مقدمہ تو یہ ہو کہ سود اور زنا میں فرق نہیں، دوسرا مقدمہ یہ کہ سود کافر سے حلال ہے بس ان دونوں مقدموں کا نتیجہ یہ ہے کہ زنا بھی کافر سے حلال ہے''۔(۴)

---

(۱) احسن الفتاویٰ: ۷/ ۲۰

(۲) فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۱۹۹

(۳) اعلاء السنن: ۱۴/ ۳۶۰

(۴) حسن العزیز: ۱/ ۶۳ بحوالہ الرباص: ۲۳۱-۲۳۴

ہندوستان میں بینک سے سود لینا

گزشتہ کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوچکی ہے کہ ہندوستان کو اگر دارالحرب مان بھی لیا جائے تب بھی ہندوستانی کے لیے کسی سے بھی سودی معاملہ کرنا یا سود لینا ہرگز جائز نہ ہوگا، اور فقہاء کی بعض عبارات سے جو مستامن کو گنجائش اور اجازت معلوم ہوتی ہے، وہ بھی مرجوح قول ہے جو قابلِ استدلال نہیں ہے۔

یہی ہمارے اکابر کا فتوی ہے؛ لہٰذا بینکوں میں جو سود (انٹرسٹ) ملتا ہے اس کو اپنے استعمال میں لانا ہرگز جائز نہ ہوگا، البتہ اس کو چھوڑنا بھی نہیں ہے، اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کردینا چاہئے۔

❀❀❀❀❀❀❀

مصارفِ سود

حرام اور سودی مال کا مصرف

گزشتہ کی تفصیل سے واضح ہو چکا ہے کہ صاحبِ مال خود اس کا مالک نہیں بنے گا؛ اس لیے کہ یہی تو سود کی ملکیت ہے۔

اور نہ ہی ان سودی منافع کو بینک میں چھوڑ دیا جا سکتا ہے؛ کیوں کہ اس میں سودی کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لیے بینک کی اعانت اور ہمت افزائی کرنا ہے، اور یہ گناہ اور معصیت پر اعانت کے قبیل سے ہے۔ **و فيه اعانة على الاثم و المعصية والاعانة على المعصية معصية (۱)**

اور اس میں گناہ اور معصیت پر اعانت ہے اور معصیت پر اعانت کرنا یہ خود معصیت اور گناہ ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ صاحب مال ان منافع کو لے کر ان کو تلف کر دے یا جلا دے یا اسے سمندر میں بہا دے، اس میں ضیاعِ مال کے پائے جانے کی وجہ سے یہ بھی درست نہیں ہے۔

کیوں کہ کبھی یہ منافع اور اموال لاکھوں اور کروڑوں کو پہنچ جاتے ہیں؛ لہٰذا ان اموال کو جلانے، تلف کرنے یا دریا میں برباد کرنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا ہے۔ (۲)

---

(۱) د. یوسف القرضاوی، فتاویٰ معاصرہ: ۱/ ۶۰۶، ۶۰۷

(۲) احکام مالِ حرام: ۴۶

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر اس امر کو حرام قرار دیا ہے کہ ماں کی نافرمانی کر کے اس کا دل دکھایا جائے لڑکیوں کو زندہ در گور کیا جائے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ فقر محتاجی اور عار کے خوف سے لڑکیوں کو زندہ دفن کردیتے تھے اور بخیلی وگدائی اختیار کی جائے نیز قیل وقال سوال کی زیادتی اور مال ضائع کرنے کو تمہارے لیے مکروہ قرار دیا گیا۔ و اضاعة المال(۱)

حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی صاحب نے سود کے مصرف کے متعلق تین آراء مختلف مفتیان کرام اور ائمہ عظام کے فقہ وفتاویٰ کی روشنی میں پیش کیا ہے:

۱) اس کا پہلا تو مصرف یہ بتلایا ہے کہ اس کو صدقہ کردیا جائے، اس لیے کہ یہ لقطہ اور غصب کے مال کی طرح ہے جس میں مالک کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس کو صدقہ کیا جاتا ہے، بقول مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی کے جدہ میں ۱۳۹۹ھ میں منعقدہ ایک فقہی وعلمی مجلس کے مختلف شرکاء نے اس کو بالاتفاق بتایا ہے اور ہمارے اکابر عرصہ سے یہ فتویٰ دیتے ہوئے آئے ہیں، چوں کہ سودی مال اصلاً بینک کی ملک نہیں، بلکہ دوسرے سود لینے والوں کی ہے جو ہم کو معلوم نہیں، اب سود لینے والا اصلی مالک کو تو لوٹا نہیں سکتا تو لقطہ کی طرح اس کی طرف سے صدقہ کردیا جائے مسلم وغیر مستحق کو اس کے صدقہ کردینے میں اختلاف کے ساتھ توسع ہے۔

۲) دوسرا مصرف اکابر اہل فتویٰ مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، مفتی نظام الدین اعظمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ اس رقم کو غیر شرعی سرکاری ٹیکس میں لگا دیا جائے، غیر شرعی معیار یہ ہے کہ ایسا ٹیکس جس کی منفعت ہم کو حاصل نہ ہوتی ہو، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس میں،

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۷۷

لیکن واٹرٹیکس وغیرہ میں نہیں البتہ مفتی عبدالرحیم صاحب بدرجۂ مجبوری جب کہ ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت نہ ہو یا بہت بوجھ ہو تب اس کی اجازت دیتے ہیں، ورنہ نہیں (۱) اور باقی دونوں حضرات کے نزدیک یہ مصرف صدقہ پر مقدم ہے اور اس سے اولیٰ ہے (۲) چوں کہ مملوک غیر کو حتی الامکان مالک تک پہنچانا ہے، اگرچہ یہ احتمال موجود ہے کہ بینک کے قرض داروں سے لیے ہوئے سود سے براہ راست بینکوں کو سود دیا جاتا ہے، مگر بینک تجارت بھی کرتا ہے پھر کھاتے دار کا معاملہ براہ راست بینکوں سے ہی ہے اس لیے اس کا اصل مالک بینک اور حکومت ہی ہیں تو کسی عنوان سے حکومت کو لوٹانا، اصل مالک کو لوٹانا ہے۔ (۳)

دوسری جگہ مفتی نظام الدین صاحب اعظمی علیہ الرحمہ نے مزید ایک دقیق بات تحریر فرمائی ہے کہ اسٹیٹ بینک یا مرکزی حکومت کے اور جتنے بینک ہیں ان سے سود کی جو رقم ملے اس کو اگر مرکزی حکومت ہی کے کسی غیر شرعی ٹیکس میں دیدے تو ذمہ سے بری ہوجائے گا جیسے انکم ٹیکس وغیرہ، اور اگر مرکزی حکومت کے ٹیکس کے علاوہ صوبائی یا مینونسپل بورڈ وغیرہ کے کسی مقامی یا نجی غیر شرعی ٹیکس وغیرہ میں دیدیا جائے تو ذمہ سے بری نہ ہوگا بلکہ ایسی صورت میں اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء ومساکین پر تصدق کردینا لازم ہوگا۔ (۴)

نیز یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ٹیکس جو حکومت عوام سے وصول کرتی ہے وہ دو طرح کے ہیں، بعض منصفانہ ہیں اور خود اسلام میں ان کی گنجائش ہے، مثلاً پانی، روشنی، سڑک، ہسپتال لائبریری اور پارک وغیرہ سہولتوں کے بدلے بلدیہ جو ٹیکس ایسے ہیں جن

---

(۱) فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۱۹۹

(۲) فتاویٰ محمودیہ: ۴/ ۲۰۲

(۳) منتخب نظام الفتاویٰ: ۲/ ۴۴۹

(۴) منتخب نظام الفتاویٰ: ۱/ ۱۹۶

کو غیر منصفانہ اور ناواجبی کہا جاسکتا ہے، مثلاً انکم ٹیکس جو بسا اوقات اسی فی صد تک پہنچ جاتا ہے، شرعی اعتبار سے غیر منصفانہ ہونے کے علاوہ واقعہ ہے کہ اس قسم کے ٹیکس غیر معقول بھی ہیں کہ ایک شخص اپنے گاڑھے پسینہ سے جو کچھ حاصل کرے، آپ اس کا اسی فیصد اجتماعی مفاد کے لیے وصول کرلیں۔

پہلی قسم کے ٹیکس میں بینک کی سودی رقم دینا درست نہ ہوگا؛ اس لیے کہ وہاں سود دینا گویا اپنی ذات میں سود کا استعمال ہوگیا؛ اس لیے کہ وہ بھی ان قومی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

دوسری قسم کے ٹیکس میں یہ رقم دی جاسکتی ہے کہ اس طرح یہ مال حرام گویا اس ادارہ کو پہنچاتا ہے جس نے یہ مال امانت داروں کو سود کے نام سے دیا ہے۔(۱) مکمل مدلل فتاویٰ دارالعلوم میں لکھا ہے: ''انکم ٹیکس کی ادئیگی میں سودی رقم دینے کی گنجائش ہے''۔(۲)

گویا دار العلوم دیوبند، مفتی محمود حسن گنگوہی، مفتی نظام الدین اعظمی، مفتی عبدالرحیم لاجپوری، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی وغیرہ حضرات کی یہ ہی رائے ہے، یہ رائے اس لیے بہتر معلوم ہوتی ہے کہ وصول ہونے والے ٹیکس عوام کی بہبود پر استعمال بھی کم ہو رہے ہیں، اکثر وزراء کی شاہ خرچی، دھاندلیوں کی نذر ہو رہے ہیں، اب یہ شبہ نہیں ہے کہ ٹیکس میں سود کی ادائیگی تو اپنے اوپر استعمال کرنا ہے۔

۳) تیسرا مصرف ان تینوں ارباب افتاء میں سے مفتی عبدالرحیم صاحب نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے، بلکہ ایک موقع سے اس کو مدلل ومبرہن کر کے پیش کیا ہے اور بظاہر ان کے یہاں ٹیکس سے مقدم ہے، وہ یہ ہے اسے عام مسلمانوں اور رفاہ عام کے کاموں میں استعمال کیا جائے، یعنی دین کی نشر واشاعت کوئی قومی وملی کام کی خدمت یتامی ومساکین کی امداد، طلباء کے وظائف، مسافر خانہ وکنواں کی

---

(۱) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۸۲

(۲) مکمل مدلل فتاویٰ دارالعلوم: ۱۴/ ۴۹۶

تعمیر، سڑکوں کی روشنی، عوامی بیت الخلاء (اگرچہ مسجد کا ہو) میں اسے صرف کیا جاسکتا ہے، اور اس مضمون کے متعدد فتاویٰ مفتی کفایت اللہ صاحب سے نیز مفتی سعید احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مدنی اور بعض علماء مراد آباد سے منقول ہیں، اور مفتی عبد الرحیم صاحبؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اگرچہ انہوں نے لقطہ کے درجہ میں ہونے سے انکار کیا ہے، مگر کہا ہے کہ اگر لقطہ بھی ہو تو بھی یہ مصرف ہوسکتا ہے کہ بیت المال کے اموال میں ایک جہت یہ بھی ہوتی ہے"۔ (۱)

اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سودی رقم واجب التملیک نہیں ہے بلکہ واجب التصدق ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ ۱۹، ۲۰، ۶ ۱۴۰ھ میں منعقدہ اجلاس میں اس حوالے سے یہ قرارداد منظر عام پر آئی ہے۔

یہ سودی منافع شرعاً مال حرام ہیں، کسی بھی حال میں مسلمان کا ان سے منتفع ہونا درست نہیں، اس کو مسلمانوں کے مصالح عامہ مدارس، ہسپتالوں کے قیام میں صرف کیا جائے گا، یہ بطور صدقہ صرف نہیں کیے جائیں گے؛ بلکہ اپنے مال کی تطہیر اور پاکیزگی کے لیے صرف کیے جائیں گے، کسی بھی صورت میں ان سودی منافع کو بینکوں میں چھوڑا نہ جائے گا؛ کیوں کہ ان کو عیسائی اور یہودی مشنریز اور اداروں میں عیسائیت کے تبلیغ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس سے مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کرنے اور ان کے ایمان وعقیدے کو بگاڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ (۲)

بینک کے سود کے سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ نہ اس کو اپنی ذات پر خرچ کیا جاسکتا ہے اور نہ صدقہ میں دیا جاسکتا ہے، اپنی ذات پر خرچ کرنے میں یہ بھی ہے کہ وہ کوئی چیز خرید کر اپنی ضرورت پوری کرے، اور یہ بھی کہ کوئی ذمہ داری جو اس پر بجا طور

---

(۱) الربا سود: مولانا عبید اللہ الاسعدی صاحب

(۲) احکام مال حرام: ۴۶

پر عائد ہوتی ہے، اس میں صرف کر دے، جیسے بجلی،فون، پانی وغیرہ کی اجرت، (صدقہ سے مراد صدقات واجبہ، زکوۃ، وفطرہ قربانی وغیرہ بھی ہے اور صدقات نافلہ بھی کہ کوئی شخص اپنی طرف سے بطور صدقہ کسی کار خیر میں استعمال کرے)۔

اس کے علاوہ جو صورتیں ہوں ان میں صرف کیا جاسکتا ہے، مثلاً کسی ضرورت مند کی انفرادی ضرورت کی تکمیل، کسی اجتماعی فائدہ کا کام کر دینا جیسے کنواں کھودنا وغیرہ حکومت کے ناروا ٹیکس میں بھی یہ رقم دی جاسکتی ہے اور اگر سودی قرضے لیے ہوں تو اس کو سود کی ادائیگی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، مساجد اور اس کی ضروریات میں اس رقم کا صرف کرنا جائز نہیں۔(۱)

البتہ اس حوالہ سے حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب خیرآبادی تحریر فرماتے ہیں:

''ربا سرکاری بینکوں میں دینے کا مسئلہ تو ہمارے بعض اکابر نے غیر شرعی (یعنی ایسی ٹیکس جو شرعاً ظلم ہیں) میں دینے کی اجازت دی ہے؛ تاکہ سرکاری رقم جو ہمارے پاس سود کی شکل میں آئی ہے وہ سرکار تک یعنی اس کے خزانے میں پہنچ جائے؛ مگر احقر کو اس میں کئی وجہ سے شرح صدر نہیں ہوا، اول یہ کہ بینک سے جو سود کی رقم ملتی ہے وہ حکومت کے خزانہ سے نہیں ملتی؛ اس لیے حکومت کے خزانہ میں واپس پہنچانے میں ''ردإلی صاحب المال'' کی صورت نہیں پائی جاتی جیسا کہ صاحب احسن الفتاویٰ نے اس کی صراحت کی ہے؛ دوسرے یہ کہ سرکار ان ٹیکسوں کو ہم سے وصول کر کے ہمارے لیے نفع بخش متعدد کاموں میں خرچ کرتی ہے، مثلاً سڑکوں کی تعمیر ومرمت، پلوں کی تعمیر ومرمت، ہسپتالوں کا قیام، ریلوں اور بسوں کی سہولتیں، اسکول، کالج، یونیورسٹی

---

(۱) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۸۲

اور ان میں تعلیم کی سہولتیں، ٹیلیفون، بجلی کی سہولتیں، بہت سے سرکاری پروجیکٹ ہیں جن سے پبلک فائدہ اٹھاتی ہے اور ہم بھی کسی نہ کسی درجہ میں فائدہ اٹھاتے ہیں؛ لہٰذا حکومت کو سرکاری ٹیکسوں میں دینا گویا یہ خود اس مال حرام سے فائدہ اٹھانے کے مرادف ہوگا۔

تیسرے یہ کہ اس کی اجازت دینے کے بعد تجربہ ہوا کہ ہزار ہا ہزار مسلمانوں نے سرکاری ٹیکسوں کی خاطر بینک سے سود لینے کے لیے اپنے اپنے کھاتے بینک میں کھول لیے ہیں، یعنی بینک میں روپے حفاظت کی غرض سے نہیں، بلکہ سود حاصل کرنے کی غرض سے جمع کرنے لگے، تاکہ بینک سے سود حاصل کر کے ہم سرکاری ٹیکسوں میں دے دیا کریں گے یہ کھلا اقدام علی الربوا ہے، ایک مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ وہ سود جیسی حرام وخبیث رقم حاصل کرنے کا اقدام کرے جب غریبوں محتاجوں کی مدد کے لیے بینک میں جمع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تو محض سرکاری ٹیکس کی ادئیگی یہ اقدام کیوں کر درست ہوگا، چوتھی بات یہ ہے کہ بینکوں سے سود کی رقم وصول کر لینے کے وجوب کا فتویٰ یہ خاص شرعی مصلحت کی وجہ سے ہے، اب اگر سود کی رقم کسی بھی عنوان سے بینک کو لوٹائی جائے گی تو شرعی مصلحت جو پہلے بیان ہو چکی ہے وہ فوت ہو جائے گی۔ (۱)

خلاصۂ تحقیق

مال حرام کسی شخص کے پاس کسی ذریعہ سے آجائے تو اس کا اصل حکم یہ ہے کہ اس کو اصل مالک یا اس کے وارثوں تک پہنچایا جائے، لیکن اگر اصل مالک تک پہنچانا دشوار ہو یا ناممکن ہو تو اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کو کہاں خرچ کیا جائے؟ اس کے مصارف کیا کیا ہیں؟ تو اس سلسلہ میں ایک اصولی اختلاف کو

---

(۱) مسائل سود: ۱۴۶

پیش کیا جاتا ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ سود کے مصارف کتنے اور کیا کیا ہیں؟

اکثر اکابر کے فتاوؤں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال حرام کا مصرف (اصل مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں) صدقۂ واجبہ زکوۃ کی طرح ہے، جس میں تملیک ضروری ہوتی ہے، جہاں تملیک نہ پائی جائے وہ اس کا مصرف نہیں ہے چنانچہ رفاہی کام (مثلاً قبرستان کی چہاردیواری بنانا، مدارس دینیہ کی کتابیں خریدنا، مدارس وغیرہ کی تعمیر کرنا، مسجد کا پائخانہ بنوانا وغیرہ) اس کا مصرف نہ ہوگا اگر سودی پیسہ یہاں خرچ بھی کر دیا جائے تو مصرف میں خرچ نہ ہونے کی وجہ سے ذمہ سے ساقط نہ ہوگا، اس لحاظ سے ان حضرات کے نزدیک مال حرام کا مصرف بہت تنگ ہوجاتا ہے۔

لیکن بعض علماء نے مال حرام کے مصرف کے سلسلہ میں توسع سے کام لیا ہے اور اس کو لقطہ کی طرح واجب التصدق کہا ہے یعنی واجب تو صدقہ کرنا ہے تملیک (مالک بنانا) ضروری نہیں ہے، چنانچہ فقراء مساکین ضروری نہیں، بلکہ فقراء مساکین یتامیٰ کے علاوہ تمام رفاہی کام اس مال سے انجام دیے جاسکتے ہیں، مثلاً قبرستان کی چہاردیواری بنانا، مسجد کے بیت الخلاء بنوانا، مدارس دینیہ کی کتابیں خریدنا، سڑک بنانا وغیرہ (البتہ یہ مال مسجد کی تعمیر میں نہ لگائے) اس لحاظ سے ان حضرات کے نزدیک مال حرام کے مصرف کا دائرہ بہت وسیع ہوجاتا ہے، اس قول کے قائلین حضرات یہ ہیں (۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ (۲) مفتی کفایت اللہ صاحب علیہ الرحمۃ (۳) مفتی سعید احمد صاحب علیہ الرحمۃ، مفتی اعظم مظاہر العلوم (۴) مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم (۵) مفتی رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نیز مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری کے فتاوؤں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمۃ اور خود مفتی عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمۃ بھی اسی (واجب التصدق) کے قائل ہیں۔

اسی کو مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے تقریباً ۱۰؍صفحوں میں اکابر کی

عبارات سے واضح کیا ہے، مختصراً بطور خلاصہ کے پیش کیا جاتا ہے:

چنانچہ حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

کسی شخص کے پاس جو مال کسی حرام یا ناجائز ذریعہ سے آ گیا ہو اور اس کو اصل مالک یا اس کے وارثوں تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے نیت ثواب کے بغیر ہی اپنی جان چھڑانے کے لیے صدقہ کر دیا جائے، عام طور پر یہ تأثر ہے کہ اس صدقہ میں بھی وہ تمام شرائط ملحوظ ہوں جو زکوۃ کے سلسلے میں ہیں چنانچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس صدقے میں تملیک فقراء ضروری ہے اور کسی رفاہی کام میں تملیک کے بغیر خرچ نہیں کیا جاسکتا، ہمارے بزرگوں نے اس بارے میں صراحۃ فتویٰ دیا ہے۔

لیکن بعض تحریریں خصوصا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا رجحان اس طرف ہے کہ اس قسم کا مال بحکم لقطہ ہے اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالک کے غیر معلوم ہونے کی صورت میں صدقۂ نافلہ ہے اور اس میں تملیک ضروری نہیں، چنانچہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، حضرت حکیم الامت کا رجحان اور اس سلسلے میں ان کا موقف ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت لقطہ کو واجب التصدق سمجھتے ہیں، صدقہ واجبہ نہیں یعنی فقیر کو مالک بنانا نہیں۔ (۱)

اور ایک مسئلہ کے جواب میں بھی حضرت حکیم الامت نے لقطہ کو واجب التصدق تو قرار دیا صدقہ واجبہ نہیں، مثلاً کسی نے قبرستان کے پتھر اکھڑوا کر دوسرے شخص سے مسجد کی تعمیر میں فروخت کیا، یہاں اس قبرستان میں اس پتھر کا لگانے والا معلوم نہیں یا اس کا کوئی وارث نہیں تو یہ لقطہ کے حکم میں ہے، اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ اسے کسی نیک کام میں صرف کیا جائے، اس صورت میں مسجد میں لگا رہنے دیا جائے کہ اپنے مصرف میں لگ گیا، البتہ جس نے بیع کیا ہے اس کے لیے قیمت درست نہیں (۲)

---

(۱) امداد الاحکام: ۳/ ۴۷

(۲) امداد الفتاویٰ: ۲/ ۵۸۷

حضرت نے یہاں لقطہ کا حکم یہ بتلایا کہ اسے نیک کام میں صرف کیا جائے، اس کے لیے تملیک ضروری نہیں۔

- ملک خبیث کا واجب التملیک ہونا فقہائے احناف کی کتابوں میں کہیں صراحت کے ساتھ موجود نہیں، بلکہ اس پر تصدق سے استدلال کیا گیا ہے کہ چوں کہ عموماً صدقہ تملیکاً ہوتا ہے اس لیے ملکِ خبیث کو بھی واجب التملیک سمجھا گیا، حالانکہ خاص طور پر صدقہ نافلہ میں لفظ صدقہ کا اطلاق ان وجوہِ خیر پر خرچ کرنے میں بھی ہوا ہے، جن میں تملیک ضرورت نہیں، مثلاً حدیث معروف ہے کہ إذا مات ابن آدم انقطع عمله إلا من ثلاث اس میں تیسرا عمل أو صدقة جارية ينتفع بها قرار دیا گیا ہے، صحیحین میں حضرت ابن عمر نے اپنی خیبر کی زمین کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا: ان شئت حبست أصلها و تصدقت بها اگر تم چاہو تو اس اصل زمین کو روک رکھو اور اس کو صدقہ کرو، لہٰذا لفظ صدقہ نافلہ میں صرف لفظ صدقہ سے اس بات پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں تملیک بھی ضروری ہے۔
- فقہاء حنفیہ کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جو ملکِ خبیث واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے من کل الوجوہ زکوۃ کی طرح نہیں ہے، بلکہ واجب التصدق مال اور زکوۃ کے مصرف میں فرق ہے:

(الف) مثلاً یہ کہ تمام فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ مال متصدق اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دے سکتا ہے۔(۱)

(ب) یہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ نافلہ ہے، اس لیے حنفیہ کے ظاہر الروایات کے مطابق یہ بنی ہاشم کو بھی دیا جاسکتا ہے، چنانچہ درمختار میں ہے: جازت التطوعات من الصدقات و غلة الأوقاف لهم

---

(۱) حاشیۃ الاشباہ للحموی: ۱۰۶/۲

أي لبني هاشم (۱) یہی رائے شمس الائمہ سرخسی (۲) اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے (۳) اور ظفر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔(۴)

- اس کے علاوہ بعض فقہاء نے لقطہ کے مال کو فقراء پر تصدق کے ساتھ خاص نہیں کیا؛ بلکہ ان تمام مصالح میں مسلمین میں خرچ کرنے کی بات کہی ہے، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ "أنه يصرف الى المرضى والزمنى واللقيط وعمارة القناطي والرباطات والتغور والمساجد وما أشبه ذلك" (۵)
- اس کے علاوہ لقطے اور کسب خبیث کے مصارف میں صرف فقراء کی تخصیص ائمہ اربعہ میں سے صرف حنفیہ کے یہاں ہے دوسرے ائمہ اس کی تخصیص نہیں فرماتے بلکہ وہ اس کو عام مصالح مسلمین میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مال حرام کا مالک جب معلوم نہ ہو تو اس کو صرف فقراء پر صرف کرنا ہی نہیں بلکہ اس کو مصالح مسلمین پر بھی لگایا جاسکتا ہے۔(۶)

نیز فتاویٰ دار العلوم زکریا میں لکھا ہے کہ:

- ملک خبیث جو واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے زکوۃ کی طرح نہیں، بلکہ متعدد جہات سے فرق ہے، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ مال اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دیا جاسکتا ہے۔(۷)

لیکن بیوی بچوں کو دینے میں یہ اشکال ہے کہ یہ صدقہ صاحبِ مال کی طرف سے ہے ملتقط صرف واسطہ ہے، ہاں میت کے کفن دفن میں خرکرنے کے جواز سے پتا چلتا

---

(۱) در مختار: ۳۵۱/۳
(۲) المبسوط: ۸/۱۱
(۳) العرف الشذی: ۲۵۷
(۴) إعلاء السنن: ۲۶/۱۳
(۵) در المختار: ۳۳۸/۲
(۶) فتاویٰ عثانی: ۱۳۰، ۱۴۰
(۷) حاشیة الحموی علی الاشباہ: ۱۰۶/۲۔ والدر المختار مع الرد المختار: ۲۷۸/۴

ہے کہ اس میں تملیک ضروری نہیں کیونکہ تکفین وتدفین میں تملیک نہیں پائی جاتی۔

- ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ مال بنی ہاشم کو بھی دیا جاسکتا ہے۔(۱)
- زکوۃ غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہے، لیکن یہ مال غیر مسلم کو بھی دیا جاسکتا ہے۔(۲)

کسبِ خبیث کے مصارف میں فقراء کی تخصیص صرف احناف کے ہاں ہے، دیگر ائمہ اس کو عام مصالح میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔(۳)

مذکورہ تفصیلی گفتگو سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مال حرام خصوصاً سودی رقم واجب التملیک زکوۃ کی طرح نہیں ہے، بلکہ لقطہ اور صدقۂ نافلہ کی طرح واجب التصدق ہے، چنانچہ اس کو موجودہ زمانہ میں رفاہی سارے کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، البتہ مسجد کی تعمیر نہیں کرائی جاسکتی، یہی اکثر اکابرین کا فتوی ہے۔

مال حرام کے مصرف کا اصول

یہاں ایک اصول یہ ملحوظ رہے کہ جو چیز اپنے ذمہ لازم ہے اس پر سے اپنے ذمہ کو ختم کرنے کے لیے اس موقع سے سود کی رقم کو استعمال کرنا درست نہیں، مثلاً مزدوروں اور نوکروں کی تنخواہوں کی ادئیگی، گاڑی یا ٹیکسی کے ٹیکس کی ادئیگی، لائٹ یا نل بل کی ادئیگی اور مقدمہ کو فیصل کرانے میں سود کی رقم اور وکیل کے محنتانہ یا مکان کے کرایہ کی ادئیگی یا شادی بیاہ یا سودی رقم سے ریل کا سفر یا سودی رقم سے اپنے گھر کا پیشاب، پاخانہ بنانا، اس میں اس کا استعمال یہ بالاتفاق ناجائز ہے، چوں کہ ان تمام صورتوں میں اپنے حقوق کی ادئیگی میں سود کی رقم کا استعمال کرنا ہے اور خود اپنے لیے جب کہ بالکل غریب محتاج نہ ہو سود کی رقم کا استعمال درست نہیں۔

---

(۱) الدر المحتار مع رد المحتار: ۳۵۱/۲

(۲) شامی: ۳۵۱/۴ سعید

(۳) المعیار المعرب: ۱۴۶/۶، بیروت۔ والذخیرۃ ۵: ۱۶۷، بیروت، فتاویٰ دارالعلوم زکریا ص: ۴۱۶-۱۵/۴۵

سود کی رقم استعمال کرنا حرام، تو غریب کو کیوں دی جائے؟

اگر خبیث (حرام) مال آدمی کی ملکیت میں آجائے تو اس کو اپنی ملک سے نکالنا ضروری ہے اب دو صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ مثلاً سمندر میں پھینک کر ضائع کردے، دوسرے یہ کہ اپنی ملک سے خارج کرنے کے لیے کسی محتاج کو صدقہ کی نیت کے بغیر دے ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت کی شریعت نے اجازت نہیں دی، لہٰذا دوسری کی اجازت ہے۔(۱)

مالِ حرام کے تصدق میں ثواب کی نیت

یہ بات بھی ضمناً آچکی ہے کہ مالِ حرام مثلاً سودی منافع کے صدقہ کرنے میں ثواب کی نیت نہ کرے اس کو دلیل کے ساتھ مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''جو شخص مالِ حرام فقیر کو دے وہ اپنی طرف سے صدقہ کی نیت نہ کرے؛ کیونکہ یہ شخص صدقہ کرنے والا نہیں ہے، بلکہ صدقہ حقیقتاً اس شخص کی طرف سے ہے جو اس مال کا اصل مالک و مستحق ہے، یہ شخص تو از جانب شرع ایسی صورت میں اصل مالک کا نائب، یا وکیل بالصدقۃ ہے اس لیے صدقہ کا ثواب اصل مالک کو ملے گا نہ کہ اس کے نائب کو۔ اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر یہ شخص اپنی طرف سے صدقہ کی نیت کرے گا تو خلافِ واقعہ ہونے کی وجہ سے خادع اور گنہگار ہوگا، البتہ اسے صدقہ پہنچانے یعنی مالک وفقیر کے درمیان واسطہ بننے کا ثواب انشاء اللہ ملے گا۔(۲)

اس حوالہ سے مفتی شبیر صاحب قاسمی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ سودی رقم غریبوں کو دیتے وقت اگر ثواب کی امید رکھی جائے تو ایمان کے چلے جانے کا خطرہ ہے؛ کیوں کہ حرام چیز سے ثواب کی امید حرام کو حلال سمجھنے کے مترادف ہے، جو بہت خطرناک ہے:

---

(۱) مستفاد: منتخب نظام الفتاوی: ۱/ ۲۰۰، ۲۰۲، فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۳۲

(۲) قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی سے متعلق کچھ اہم مباحث ص ۱۷۰

رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئا و يرجو الثواب يكفر (۱)

یہی بات مفتی حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی دامت برکاتہم نے بھی مسائل سود میں لکھی ہے کہ جو شخص ثواب کی نیت سے مال حرام صدقہ کرے وہ کفر کے قریب پہنچ جائے گا۔(۲)

لہٰذا مال حرام (سودی رقم) کے صدقہ کرنے میں ثواب کی نیت نہ کرے کہ یہ دھوکہ ہے، باعث گناہ اور ذریعۂ کفر ہے، البتہ اسے اصل مالک اور فقیر (مستحق) کے درمیان واسطہ بننے کا ثواب ملے گا۔إن شاء اللّٰہ۔

بینک کا سود ماں باپ کو دینا

گزشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ سودی منافع شرعاً مالِ حرام ہیں جس سے کسی بھی حال میں مسلمان کا منتفع ہونا درست نہیں ہے،لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے ماں باپ یا بھائی بہن کو جو مستحق صدقہ ہوں یہ مال دیا جاسکتا ہے؟ تو اس حوالہ سے مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب دامت برکاتہم نے صراحت کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے اور اس کو دلیل سے مبرہن بھی کیا ہے جن کی تفصیلی عبارت یہ ہے:

''چونکہ یہ اصل متصدق نہیں بلکہ نائب ہے، اس لیے اپنے ماں باپ کو (اگر وہ شرعاً مستحق صدقہ ہوں) بھی ایسا مال دے سکتا ہے؛ بلکہ اس بنیاد کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اپنے اوپر بھی خرچ کرسکنا جائز ہو (جیسا کہ بعض علماء نے جائز بتایا بھی ہے) مگر احتیاطاً اور مصلحتاً اس شخص کو اپنے اخراجات میں لانا جائز نہیں رکھا گیا؛ کیونکہ اس طرح اصل مالک کو تلاش کرنے اور اس تک اموال پہنچانے میں سستی پیدا ہوجانا قدرتی تھا، نیز حیلہ جوئی

(۱) شامی، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم، مطلب في التصدق من المال الحرام: ۲۱۹/۳، فتاوی قاسمیہ: ۳۲۱/۲۰

(۲) مسائل سود: ۱۴۶

اور بہانہ بازی کے لیے راہ کھل سکتی تھی، اس بات کی فی الجملہ تائید عالمگیری میں مذکور ایک حنفی فقیہ کے قول سے بھی ہوتی ہے"۔(۱)

اس حوالہ سے مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"مال حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مالِ حرام نہیں، بلکہ صرف وہ مالِ حرام ہے جس کے مالک نامعلوم یا لاپتا ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جاسکتا، نیز یہ کہ یہ مال ایسی صورت میں بحکمِ لقطہ ہوجاتا ہے اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے، اس لیے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لیے یہ حرام نہیں، اور اسی بنا پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر بھی کرسکتا ہے، کیونکہ وہ اس کا صدقہ نہیں بلکہ اصل مالک کا ہے۔ کما فی العبارۃ الھندیہ۔(۲)

لیکن ہوسکتا ہے کہ صورتِ مذکورہ کے اس اصل جواب سے لوگ اپنی سودی رقم اپنے ان اصول وفروع کو بھی دینا شروع کردیں جو خود ان کی اپنی کفالت میں ہیں، اور اس طرح خود اپنی سودی رقم سے فائدہ اٹھانے لگ جائیں گے اور سود کے استعمال کا دروازہ کھل جائے گا، اس لیے "سداً للذرائع" احتیاط اسی میں ہے کہ اپنی سودی رقم اپنے اصول وفروع (ماں باپ، دادادادی، نانانانی، بیٹابیٹی وغیرہ) اور عزیز واقارب کو بھی نہ دیں۔

خلاصہ: خلاصۂ کلام یہ کہ بینک سے حاصل شدہ اپنی سودی رقم اپنے اصول وفروع اور عزیز واقارب کو دینا جائز تو ہے مگر احتیاط اسی میں ہے کہ نہ دیں۔(۳)

---

(۱) قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی سے متعلق کچھ اہم مباحث ص:۱۷۰

(۲) جواہر الفقہ:۳/۳۳۰

(۳) فکری فقہی اصلاحی مقالات ومضامین ص:۷۵۳، از مفتی محمد جعفر ملی، جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا

سودی رقم اپنے پوتے کو دینا

جب سودی رقم کا مالک معلوم نہ ہو یا مالک تک پہنچانا متعذر ہوتو وہ مال واجب التصدق ہوجاتا ہے یعنی مالک کی طرف سے صدقہ مانا جاتا ہے نہ کہ دینے والے معطی کی طرف سے اور مالک پوتے کے حق میں اجنبی ہوتا ہے لہٰذا جائز ہونا چاہیے۔(۱) لیکن یہ بھی اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ وہ پوتا اس کی زیر کفالت نہ ہو، ورنہ سودی رقم سے خود کا منقطع ہونا لازم آئے گا، جس سے متعلق اصول پیچھے گزر چکا ہے۔

سودی رقم اور زکوۃ سادات کو دینا

سادات کا اکرام واحترام لازم ہے، اس لیے ان کو زکوۃ وصدقات واجبہ دینے سے احتراز کا حکم ہے، کیوں کہ ایسا مال أوساخ الناس کہلاتا ہے،إن الصدقة لا تنبغي لمحمد، ولا لآل محمد، إنما هي أوساخ الناس لیکن جو سادات اس قدر حاجت مند ہوں کہ گزارے کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہوجائیں، ان کے حق میں حنفیہ میں سے امام طحاوی علیہ الرحمۃ اور شافعیہ میں سے امام رازی علیہ الرحمۃ نے زکوۃ کو درست قرار دیا ہے کہ زکوۃ لینے میں جس قدر ان کے احترام پر زد پڑتی ہے اس سے زیادہ تر بھیک مانگنے میں ہے، یہ سب کی نگاہوں میں بڑی ذلت ہے، اس بڑی ذلت سے بچانے کے لیے اگر اس کو زکوۃ دیدی جائے تو یہ أهون ہے۔

اگر چہ یہ قول ظاہر الروایت ہے، اور عامۃً اس کو فتویٰ کے لیے اختیار نہیں کیا جاتا، لیکن سخت مجبوری اور محتاجگی کی حالت میں اس پر عمل کرنے کی دیگر اکابر کے کلام میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے کلام کا خلاصہ فیض الباری، اور العرف الشذی میں منقول ہے، تاہم جہاں تک ہوسکے سادات کرام کو اس سے بچانا اعلیٰ وافضل اور ان کے احترام کا تقاضا ہے۔(۲)

---

(۱) مستفاد از فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۲۰

(۲) فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۳۸۴، ۳۸۵

''فیض الباری''میں مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے طحاوی رحمہ اللہ کے قول کو نقل کیا ہے کہ ابو یوسف رحمہ اللہ کی کتابوں میں لکھا ہے: سادات کو زکوۃ دینا جائز ہے؛ کیوں کہ خمس یہ ان سادات کا حق ہے اب چوں کہ خمس نہ رہا تو اب ان کو زکوۃ دینا صحیح ہوگیا، امام محمد رحمہ اللہ کا قول بھی جواز کا ہے،علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا فتوی بھی یہی ہے:

"ونقل الطحاوی عن أمالی أبی یوسف: أنه جاز دفع الزکاة إلی آل النبی ﷺ عند فقدان الخمس فإن فی الخمس حقهن فإذا لم یوجد صح صرفها إلیهم، وفی البحر: عن محمد بن شجاع الثلجی عن أبی حنیفة أیضا جوازہ قلت: وأخذ الزکاة عندي أسهل من السوال فأفتی به أیضا۔(۱)

غیر مسلم فقیروں کو دینا

سود کی رقم جب مالک کو واپس کرنا ممکن نہ ہو، تو جس طرح مسلم فقیر کو دینا جائز ہے، اسی طرح غیر مسلم فقیر کو بھی دینا جائز ہے؛ البتہ مسلم فقیر کو دینا زیادہ بہتر ہے۔(۲)

غریب طالب علم کو دینا

اگر طالب علم غریب ہے اور سود کے روپیہ کا واقعی مصرف ہے، تو اس کے لیے سودی رقم اپنے استعمال میں لانا درست ہے ۔ لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذّر الرد علی صاحبه۔(۳)

یتیم اور بیمار کو دینا

سود کی رقم ثواب کی نیت سے دینا گناہ ہے، کیونکہ مالِ حرام سے صدقہ صدقہ کی

---

(۱) فیض الباری: کتاب الزکاة، باب ما یذکر فی الصدقة النبی ﷺ: ۱۵۷/۳، دار الکتب العلمیة، بیروت، حدیث نمبر: ۱۴۹۱

(۲) مستفاد: کفایت المفتی: ۷۰/۸، فتاویٰ قاسمیہ: ۷۰۷/۲۰، فتاوی دارالعلوم زکریا: ۴۲۳/۵، فتاوی رحیمیہ: ۲۷۹/۸

(۳) شامی: ۵۵۳/۶ زکریا، کتاب النوازل: ۳۶۵/۱۱

توہین ہے البتہ بلانیت صدقہ یتیم لڑکی کی شادی یا بیمار شخص کے علاج کے لیے سود کی رقم دی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ اس کے محتاج ہوں اور شادی اور علاج کے لیے ان کے پاس جائز رقم موجود نہ ہو۔(۱)

بینک انٹرسٹ سے قبرستان کی حصار بندی

بینک انٹرسٹ کی رقم کا اصل حکم تو یہ ہے کہ اسے غرباء پر بلانیت ثواب خرچ کردیا جائے، لیکن اس کے علاوہ ہمارے عہد کے اربابِ افتاء نے رفاہی کاموں میں بھی اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، لہٰذا اگر قبرستان کی صفائی اور حصار بندی کے لیے کسی اور رقم کا نظم نہ ہوسکے تو اس رقم سے بھی حصار بندی اور ستھرائی کا کام کرایا جاسکتا ہے۔(۲)

شادی کے تحفہ میں دینا

انٹرسٹ (سود) کی رقم کسی ہندو یا مسلمان دوست کے تقریبات میں تحفہ کے طور پر دینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے؛ بلکہ یہ رقم دفع وبال کی نیت سے نادار غریبوں کو بانٹ دینی لازم ہے۔(۳)

ہدیہ میں لینا

اگر کوئی شخص کسی کو سود کی رقم ہدیہ میں دے اور اس کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ سود ہی کی رقم میں سے ہدیہ دیتا ہے تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔(۴)

بے قصور مسلم نوجوانوں کی جیلوں سے رہائی کے لیے سودی پیسہ سے مقدمہ لڑنا

بینکوں سے حاصل شدہ سودی روپیہ کے بارے میں مفتی بہ قول یہ ہے کہ اس کو

---

(۱) کتاب الفتاویٰ:۵/۳۳۱

(۲) کتاب الفتاویٰ:۱۰/۵۹

(۳) کتاب النوازل:۱۱/۳۷۷

(۴) محقق ومدلل جدید مسائل:۲/۳۹۹

لے کر غریبوں اور محتاجوں پر خرچ کر دینا چاہیے، اب اگر جیلوں میں گرفتار کوئی بے قصور شخص غریب اور محتاج ہو، تو اس کی اجازت سے اس کی رہائی کے لیے مقدمات کی مد میں بھی یہ پیسہ صرف کیا جاسکتا ہے۔ یہی مفتی کفات اللہ صاحبؒ کا فتویٰ ہے نیز مفتی سلمان منصور پوری صاحب دامت برکاتہم کی یہی رائے ہے۔(۱)

تنخواہ میں دینا

سودی رقم کے واقعی حقدار انتہائی مفلوک الحال غربت زدہ نادار لوگ ہیں، سودی رقم انھیں حصول ثواب کے بغیر (اس کا وبال دور کرنے کی غرض سے) دیدی جاوے، مسلم یا غیر مسلم معلمین یا کارکن حضرات کی تنخواہ میں سودی رقم کا استعمال جائز نہیں، البتہ اسکول و مدرسہ کے متعلمین، معلمین، کارکن حضرات میں سے جو کوئی مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق محتاج و نادار ہوں انھیں سودی رقم بطورِ امداد دی جاسکتی ہے۔(۲)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ سودی رقم جماعت (سوسائٹی) چلانے میں یا مسجد و مدرسہ کے ملازمین کی تنخواہ اور کرایہ وغیرہ ادا کرنے میں کام نہیں لاسکتے۔(۳)

مدارس اور دینی خدّام کو دینا

مدارس اور دینی خدمت گذاروں کو پاک اور اپنے مال کا سب سے بہتر حصہ دیا جائے، خاص طور سے سود کی رقم کا ان کے لیے انتخاب نہایت ہی ناشائستہ بات ہے البتہ اگر ان میں سے کوئی ضرورت و مجبوری سے دوچار ہو اور اس رقم کے سوا کوئی اور رقم موجود نہ ہو تو ضرورتاً جیسے دوسرے ضرورت مندوں کی سود سے مدد کی جاسکتی ہے ایسے لوگوں کی بھی مدد کی جاسکتی ہے، کیوں کہ سود اور ہر قسم کا مال حرام لقطہ کے حکم میں ہے اور ضیاع کے اندیشہ کے وقت اس کا اٹھانا واجب ہے اگر مالک کا علم ہو جائے تو اس کو لوٹا دے

---

(۱) کتاب النوازل:۱۱/۴۰۷، کفایت المفتی:۸/۸۰

(۲) فتاویٰ رحیمیہ ص:۵/۳۱۹-۳۲۰

(۳) حوالہ سابق ص۲۶۱-۲۷۴ جلد ۵

ورنہ اس کی طرف سے بلا نیت ثواب صدقہ کردے۔

سودی قرض میں دینا

اگر کوئی شخص سودی قرض لینے پر مجبور ہو جائے اور قرض لے لے پھر اس کے پاس بینک سے حاصل ہونے والی سود کی کوئی رقم آجائے تو اسمیں کوئی حرج نہیں کہ وہی رقم بطور سود ادا کردے، جبکہ سودی قرض بھی بینک سے لیا ہو اور سود بھی بینک سے ملا ہو، اس لیے کہ سود دینا بھی گناہ ہے؛ کیوں کہ اس طرح وہ اللہ کے عطا کئے ہوئے مال حلال کو حرام راہ میں خرچ کرتا ہے، اب اگر کوئی شخص سود ہی کی رقم اس راہ میں دے دیتا ہے تو ایک مال حلال کو بے حرمتی سے بچاتا ہے، امید کہ اس پر مواخذہ نہ ہوگا، مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا رجحان بھی اسی طرف ہے (۱) اور حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمی علیہ الرحمۃ کے فتویٰ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص بحالت مجبوری حکومت سے سودی قرض لے لیا (جبکہ بینک میں پیسہ جمع ہونے کے باعث بینک سے سود بھی ملتا ہے) تو اب جمع شدہ رقم کا سود نکال کر قرض والے بینک کو سود ادا کردے تو اس کی گنجائش ہے کیونکہ ہر حرام مال کا شرعی حکم یہ ہے کہ جہاں سے ملا ہو وہاں واپس کر سکے تو واپس کردے، لہٰذا شرعاً اس کی گنجائش ہوگی، (۲) یہی رائے مفتی کفایت اللہ صاحب کی بھی ہے۔ (۳) البتہ اس کو مفتی حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی نے ناجائز کہا ہے۔ (۴)

جدید فقہی مسائل میں ہے:

”اگر کوئی شخص سودی قرض لینے پر مجبور ہو جائے اور قرض لے لے پھر

---

(۱) امداد الفتاویٰ: ۱۷۳/۳

(۲) مستفاد از منتخب نظام الفتاویٰ: ۱۹۱/۱

(۳) کفایت المفتی: ۱۷/۸

(۴) مسائل سود: ۱۴۱

اس کے پاس بینک سے حاصل ہونے والی سود کی ایک رقم موجود ہوتو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہی رقم بطور سود ادا کر دے، اس لیے کہ سود دینا بھی گناہ ہے؛ کیوں کہ اس طرح وہ اللہ کے عطا کیے ہوئے مال حلال کو حرام راہ میں خرچ کرتا ہے، اب اگر کوئی شخص سود ہی کی رقم اس راہ میں دے دیتا ہے تو ایک مال حلال کو بے حرمتی سے بچاتا ہے، امید کہ اس پر اس کا مؤاخذہ نہ ہوگا، مولانا تھانویؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے"(۱)

فتاوی عثمانی میں ہے:

"اگر ماضی میں غلطی سے سودی اکاؤنٹ میں پیسے رکھوادئے گیے ہیں اور سودی قرض لے لیا گیا تو اس طرح تصفیہ کر سکتے ہیں کہ ایک اکاؤنٹ سے لے کر دوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دئے ہوئے سود سے زائد نہ ہو، برابر ہو جائے؛ لیکن آئندہ کے لیے یہ سلسلہ بند کر دیں"(۲)

حکومت کے ٹیکس میں دینا

ٹیکس دو قسم کا ہوتا ہے:

(۱) منصفانہ جس کا فائدہ کسی نہ کسی صورت میں ہمیں پہنچتا ہے، ایسے ٹیکس میں کسی قسم کی سودی رقم دینے کی گنجائش نہیں، چاہے وہ سرکاری بینک کی ہو یا خانگی بینک کی ہو۔

(۲) غیر منصفانہ یعنی وہ ٹیکس جو ظلماً عائد کیے جاتے ہیں، مثلاً: انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ اس کا حکم یہ ہے کہ مرکزی اور سرکاری بینک کا سود اس میں ادا کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ مالک کو پہنچانے کے مترادف ہے؛ لیکن خانگی اور پرائیوٹ بینک کا

---

(۱) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۵۴

(۲) فتاوی عثمانی: ۳/ ۲۸۰، فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۱۱

سود ادا کرنا جائز اور درست نہیں ہے۔(۱)

دینی کاموں میں دینا

اگر حلال کمائی میں کچھ حرام کمائی ملائی گئی ہے تو اس سے بنایا ہوا مکان استعمال کرنا درست ہے اور ایسی کمائی کو دین کے کاموں میں خرچ کرنا بھی درست ہے؛ لیکن حرام کمائی کا گناہ مستقل ہے اور جس قدر مالِ حرام کمائی سے کمایا ہے اس کا اصل مالک کو واپس کرنا لازم ہے، وہ نہ ہو تو اس کے وارثوں کو دے دیا جائے، اور وہ باقی نہ ہوں تو غرباء پر اس نیت سے صدقہ کر دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے وبال سے بچائے۔(۲)

سودی رقم پر قبضہ کرنے سے پہلے صدقہ کرنا؟

جب تک بینک میں جمع شدہ سودی رقم الگ کرنے کے بعد کھاتے کے قبضہ اور تصرف میں نہ آجائے اس وقت تک اس سودی رقم کا تصدق واجب نہیں؛ لہذا واجب سے پہلے اس کی طرف سے دوسری رقم بدل کر خرچ کر دینے سے بعد میں واجب ہونے والے تصدق کی تلافی ہرگز نہیں ہوسکتی؛ اس لیے جب بھی سودی رقم ملے گی اس کو بلا نیت ثواب فقراء پر صرف کرنا لازم ہوگا۔(۳)

رشوت میں دینا

سرکاری افسران کو رشوت دیے بغیر جب تنخواہ کا یا اہم دینی یا دنیوی کام کا نکالنا مسلمان کے لیے ناممکن ہے، تو بدرجہ مجبوری اپنی جیب خاص سے حلال پیسہ دینا جائز ہوگا لیکن رشوت میں سود کا پیسہ دینا جائز نہیں اور سود کا پیسہ رشوت میں دینا؛ اس لیے جائز نہیں کہ سود کا پیسہ صرف دو جگہ دیا جاسکتا ہے۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۱۳، کتاب الفتاوی: ۵/ ۳۰۶-۳۱۶، جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۵۳، چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۲۵-۳۲۸

(۲) دیکھئے: فتاوی محمودی: ۱۸/ ۴۴۸

(۳) کتاب النوازل: ۱۱/ ۴۱۸

۱) کسی بھی عنوان سے اصل مالک کو واپس کر دیا جائے اور جن آفیسروں کو رشوت دی جاتی ہے، وہ اصل مالک نہیں ہیں۔

۲) اگر اصل مالک تک رسائی نہ ہو سکے، تو بغیر نیت ثواب فقیروں اور مسکینوں کو دیدینا لازم ہے اور رشوت لینے والے افسران فقیر اور مسکین بھی نہیں ہیں۔ (۱) نیز اس لیے بھی جائز نہیں کہ اس میں خود کا سودی رقم سے انتفاع لازم آتا ہے۔ (۲)

بینک کے جرمانہ میں دینا

بینک میں کھاتہ دار کا اگر بیلنس زیرو یا ایک ہزار سے کم رہ جائے تو بینک زیرو بیلنس کے جرمانہ میں اس کے اکاؤنٹ سے کچھ رقم کاٹ لیتی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس جرمانہ کے بدلے میں بینک سے ملنے والی سودی رقم دے سکتا ہے یا نہیں؟ تو چوں کہ بینک نے کھاتہ دار کے کھاتے سے جبراً اور ظلماً روپیہ لیا ہے تو بینک سے ملنے والی سودی رقم سے اتنا ہی پیسہ اس کے لیے وصول کر لینا جائز ہوگا اور یہ سمجھ کر کے وصول کرے کہ جو پیسہ ہمارا جبراً وصول کر لیا ہے، ہم وہی پیسہ بینک سے اسی راستہ سے وصول کر رہے ہیں، لہٰذا حاصل یہ نکلے گا کہ نہ آپ نے بینک سے لیا اور نہ ہی بینک نے آپ سے لیا؛ بلکہ برابر برابر ہو گیا۔ (۳)

بینک انٹرسٹ کے ذریعہ انکم ٹیکس بچانا

اگر آپ کے پاس بینک انٹرسٹ کی کچھ رقم موجود ہو، آپ اس کو کسی سرکاری اسکیم لگا دیں تو انکم ٹیکس کے قانون کی زد سے بچ جائیں گے، اور پھر اس اسکیم سے واپس ملنے والی اصل اور زائد رقم آپ غرباء کے تعاون اور رفاہِ عام کے کاموں میں خرچ کر دیں تو یہ جائز ہے کہ یہ ایک قانونی حاجت ہے۔ (۴)

---

(۱) مستفاد: فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/ ۵۲۱، ۵۴۵ (۲) محقق ومدلل جدید مسائل: ۲/ ۴۰۸

(۳) بینک کے مسائل، مفتی عامر صاحب

(۴) کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۰۸، نیز دیکھئے: کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۱۴

ٹیکس سے بچنے کے لیے تدبیر اختیار کرنا

حکومت تاجروں سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کرنے کے لیے تاجروں کے حساب کتاب کو باقاعدہ دیکھتی ہے، تاجر لوگ ان ٹیکسوں سے بچنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتے ہیں، توشرعاً اس طرح سرکاری ٹیکسوں سے بچنے کے لیے تدابیر کرنے سے متعلق مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں: حکومت کے ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کے لیے کوئی جائز تدبیر اختیار کرنا درست ہے۔(۱)

اس سلسلہ میں وکلاء اور ماہرینِ قانون (چارٹیٹ اکاؤنٹنٹ) سے مشورہ کرلینا چاہیے جوخطرہ مول لیے بغیر مالیاتی نظام کی ایسی ترتیب بتاتے ہیں جس سے ٹیکس ختم یا بچت ہوسکتی ہے۔

---

(۱) محمود الفتاویٰ: ۳/۳۵

مالِ حرام کی پاکی کے طریقے

مالِ حرام کو پاک کرنے کے طریقے

غیر شرعی طریقے سے حاصل شدہ اموال کا کیا انجام ہوگا؟

- اگر مالِ حرام کا مالک معلوم ہو تو وہ اموال اس کے مالک کو واپس کیے جائیں گے اگر وہ موجود ہو اور اگر موجود نہ ہو تو اس کے واپس لوٹنے کا انتظار کیا جائے گا، اگر اس کے رہائش کا علم نہ ہو تو پتا کیا جائے گا، اگر تلاش کے باوجود وہ شخص نہ مل سکے یا پتا چلے کہ وہ مر گیا ہے تو اس کا مال اس کے ورثہ کے حوالہ کیا جائے گا چوں کہ موروث کی موت کے بعد وارث اس اموال کے مالک ہوتے ہیں، اگر اس مال سے منافع حاصل ہوں تو اس کو اصل مال کے ساتھ مالک کے حوالہ کیے جائیں گے۔(۱)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”إذا كان معه مال حرام و أراد التوبة منه، فان كان مالك معين فإنه يصرف إليه أو وكيله؛ فإن كان ميتا وجب دفعه إلى ورثته“(۲)

”اگر اس کے پاس مالِ حرام ہو اور وہ توبہ کرنا چاہے؛ اگر اس کا مالک معین شخص ہے تو اس کو یا اس کے وکیل کو وہ اموال دیے جائیں گے اگر

---

(۱) الغزالی: إحياء علوم الدين: ۲/ ۲۰۲

(۲) النووی: المجمع شرح المهذب: ۹/ ۳۴۳

وہ شخص مر گیا ہو تو یہ اموال اس کے ورثہ کے حوالے کیے جائیں گے‘‘۔

یہ مال حرام مالک کی رضا سے لیے گیے ہوں گے یا اس کی بغیر مرضی کے۔

❁ مالک کی رضامندی کے بغیر حرام مال لیا گیا ہو تو اس کی پاکی کا طریقہ کیا ہے؟

اگر مالِ حرام اس سے جبرا لیا گیا ہو تو وہ مال اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی چوری کردہ یا غصب شدہ اموال یعنی اس کے مالک کو واپس کیا جائے گا، غاصب یا چور کے لیے اس کی ملکیت کا دعویٰ کرنا یا اس کو اپنے قبضہ میں رکھنا درست نہیں۔

ابن قیم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

”من قبض ما ليس له قبضة شرعا ثم أراد التخلص منه؛ فان تعذر رده عليه قضى به دينا يعلمه عليه، فان تعذر ذلك رده إلى ورثته، فان تعذر تصدق به عنده“(۱)

’’جو شخص ان اموال پر قابض ہو جس پر قبضہ کرنا شرعا اس کے لیے درست نہیں پھر اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے؛ اگر اس کو لوٹانا مشکل ہو تو اس سے اس کا قرض ادا کرے، اگر وہ بھی مشکل ہو تو یہ مال اس کے ورثہ کے حوالے کر دے؛ اگر وہ بھی مشکل ہو تو اس کی جانب سے اس کو صدقہ کر دے‘‘۔

❁ اگر مال حرام کا مالک متعین نہ ہو یا اس مال حرام کو ایک بڑی جماعت سے لیا گیا ہو، اگر ان کی معرفت اور پہچان ممکن نہ ہو مثلاً ذخیرہ اندوزی، دھوکہ دہی یا حرام تجارت سے حاصل کیے ہوئے اموال ہو تو اسے بیت المال میں رکھا جائے گا، اگر بیت المال نہ ہو تو مسلمانوں کے مصالح پر صرف کیے جائیں گے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

إذا كان المهدى مكرها فى الاهداء ينبغى أن يرد الهدية على

---

(۱) ابن قیم: زاد المعاد: ۱/ ۲۵۱

المهدی ، إن قدر علیه ؛ فان لم یقدر علیه یضعها فی بیت المال ویکتب علیها قصته، و کان حکمه حکم اللقطة“ (۱)

”اگر مُہدی (ہدیہ کرنے والا) کو ہدیہ کرنے پر مجبور کیا گیا ہوتو ہدیہ کا اس کو واپس کر دینا چاہیے، اگر اس کی قدرت ہو، اگر اس کی قدرت نہ ہو اس کو بیت المال میں رکھا جائے گا اور اس پر اس کا قصہ لکھ دیا جائے گا، اس کا حکم لقطہ کا حکم ہوگا“

چوں کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲)

”اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (طور پر) مت کھاؤ اوران (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی) ظلم کے ساتھ کھا جاؤ اور تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم (بھی) ہو“۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ”لا یحل مال امرئ إلّا بطیب نفس منه“ (۳) ”کسی مسلمان کا مال اس کی رضا اور خوشنودی کے بغیر کھانا درست نہیں“۔

اگر مال حرام اس کے مالک کی رضامندی سے لیا گیا ہوتو اس کی پاکی کا طریقہ:

اگر مال حرام مالک کی رضا سے، بغیر جبر واکراہ کے لیا گیا ہو جیسے حرام کام کی اجرت میں حاصل کی ہوئی کمائیاں، زنا وغیرہ کی اجرت، نوحہ ماتم اور گانے اور کہانت

(۱) الفتاوی الهندیة:۲/۲۳۶

(۲) البقرة:۱۸۸

(۳) مسند احمد

اورغیب کی باتوں اور آسمانی خبروں کی اطلاع دینے والوں کی اجرت، جوے بازی سے حاصل شدہ اموال، اگر وہ شخص ان اموال سے پاکی حاصل کرنا چاہتا ہو اور اس کے گناہ سے بچنا چاہتا ہو تو اس مال کا انجام کیا ہوگا، کیا یہ لینے والے کے قبضہ میں برقرار رہے گا یا اس کو اس کے مال کو واپس کردینا ہوگا، اس سلسلہ میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) پہلا قول: احناف، مالکیہ اور حنابلہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ مالِ حرام جسے گناہ اور معصیت میں مالک کی رضا سے خرچ کیا گیا ہو تو یہ اموال مالک کو واپس نہیں کیے جائیں گے اور نہ فریقِ ثانی اس کا مالک ہوگا۔

إن المال المبذول فی المعصیة و اختیار مالکه لا یرد إلی مالکه، و لا یکون ملکا للفریق الأخر المشترك فی العمل الحرام (۱)

ترجمہ: ''وہ مال جسے گناہ اور معصیت میں اس کے مالک کے رضا اور اختیار سے صرف کیا گیا اس کے مال کو واپس نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی وہ دوسرے کی ملک قرار پائے گا جو عمل حرام میں شریک تھا؛ کیوں کہ ان اموال کو ان کے مالک کے حوالے کردینے میں اس کو معصیت پر آمادہ کرنے میں ممد و معاون بننا ہے''۔

ابوحمید ساعدی روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازد کے ایک شخص کو جس کو ابن اللتیبہ کے نام سے پکارا جاتا تھا صدقہ وصول کرنے پر مقرر فرمایا جب وہ وصول کرکے واپس آئے تو کہا یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مال ہے اور یہ میرا ہے جو مجھے دیا گیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو آپ نے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا پھر دیکھتا کہ تحفہ بھیجا جاتا ہے یا نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جو شخص اس (صدقہ) کے مال سے کوئی چیز لے گا تو وہ قیامت کے دن اپنی گردن پر لاد کر لائے گا اگر اونٹ ہوگا تو وہ بول رہا ہوگا، گائے ہوگی تو وہ بول رہی ہوگی، بکری ہوگی تو

---

(۱) الفتاوی الهندیة: ۲/ ۲۳۶

وہ ممیا رہی ہوگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ اٹھایا یہاں تک کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغل کی سفیدی دیکھی اے میرے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا، اے میرے اللہ کیا میں نے پہنچا دیا تین بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ هل بلّغت ثلاثا" (۱)

یہاں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن اللتبیہ کو یہ نہیں فرمایا کہ یہ ہدایا ان کے اصحاب کو واپس کر دیے جائیں؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر سخت غصہ ہوئے اور ان کے اس فعل کی مذمت کیا اور اس مال کو بیت المال میں لوٹانے کا حکم فرمایا۔

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے دور خلافت میں عمال اور حکام کی مجموعی آمدنی کا نصف بیت المال میں جمع کروایا کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ والی مصر سے فرمایا تھا:

"یامعشر العمال قعدتم علی عیون الاموال فجمعتم الحرام، وأكلتم الحرام، و أورثم الحرام، و قد بعثت اليك محمد بن مسلة الانصار بقاسمک مالك فاحضره مالك ۔۔ فلما وفد عليه أحضره ماله فقاسميه فيه ثم رجع" (۲)

اے گورنرو! تم اموال کے دہانے بیٹھے رہتے ہو اور حرام کو جمع کرتے ہو، حرام کھاتے ہو، حرام مال کو وارث بناتے ہو، میں نے محمد بن مسلمہ انصاری کو تمہارے پاس بھیجا ہے، یہ تمہارے مال کو تقسیم کر دیں گے، تم ان کے پاس اپنے اموال لے جانا۔ جب وہ ان کے پاس آئے تو اس کو تقسیم کرنے کے بعد واپس آئے۔

علامہ ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ کہتے ہیں:

وما أخذه العمال وغيرهم من مال المسلمين بغير حق فلولی

---

(۱) بخاری: باب من لم یقبل الھندیة لعلة، حدیث: ۲۴۵۷

(۲) ابن عبد الرحمن عبد الله، فتوح مصر و المغرب

الأمر العادل استخراجه منهم كالعطايا التي يأخذونها بسبب العمل ... وكذلك محاباة الولاة في المعاملة من المبايعة والمؤاجرة والمضاربة والمساقاة والمزارعة ونحو ذلك من نوع الهبة، ولهذا شاطر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ من عماله من كان له فضل دين لا يتهم بخيانة، وانما شاطرهم لم خصوا به لأجل الولاية من محابلة وغيرهم، وكان الأير يقتضى ذلك؛ لأنه كان كان امام عدل يقسم بالسوية. (۱)

''اورعمال اور گورنر وغیرہ جو مسلمانوں کے اموال ناحق لیتے ہیں عادل حکمران کے لیے اس میں کچھ اموال کا نکالنا جیسے وہ عطایا جو کام کی وجہ سے لیتے ہیں۔۔۔اسی طرح والی خرید وفروخت، تجارت، مساقات، مزارعت وغیرہ میں جو وصولی کرتے ہیں اس طرح کے دیگر ہدایا اسی لیے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کے اموال سے نصف حصہ لیتے تھے جو دینداری سے متصف تھے؛ تاکہ ان پر خیانت کی تہمت نہ آئے، ان سے نصف مال اس لیے لیتے تھے کہ ان کے والی ہونے کی وجہ سے جو وصولی وغیرہ ان کو ہوتی تھی ان کو مخصوص طور پر حاصل ہوتی تھی اور واقعی صورت حال بھی اس کی متقاضی تھی، چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عادل امام تھے برابر تقسیم کرتے تھے''۔

تو اس سے پتا یہ چلا کہ حرام طریقے سے مالک کی رضا سے حاصل شدہ اموال اس کے مالک کو واپس نہیں کیے جائیں گے؛ بلکہ اسے بیت المال میں داخل کیا جائے گا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمال کو ملنے والے ہدایا ان کے عمال اور گورنر ہونے کی وجہ سے ان کے پاس جو اموال آتے تھے اس کا آدھا حصہ بیت المال میں داخل کرایا، ان

(۱) ابن تیمیہ مجموع الفتاویٰ:۲۸/۲۸۱

کے مالکوں کو واپس کرنے کا حکم نہیں دیا۔

چوں کہ جس نے حرام کام کے ارتکاب کے عوض یہ رقم دی ہے اگر اسے مال واپس کیا جاتا ہے تو اس نے حرام کام بھی کرلیا اور اس کے عوض دی ہوئی رقم بھی اسے واپس ہوگئی، عوض اور معوض دونوں اسی کو حاصل ہوئے اور اس طرح اموال کی واپسی میں گنہگاروں کوشہہ دینے اور ان کے گناہوں پر ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے مرادف ہے۔

علامہ ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"قال قابضه أي المال الحرام انما قبضه ببدل مالكه له ورضاه ببذله، وقد استوفى عوضه المحرم"

فرماتے ہیں: اس کو قبضہ کرنے والا (یعنی مال حرام) اس نے مال حرام کو اس کے مالک سے عوض کے طور پر اور اس کے مالک کی رضا اور اس کے خرچ کرنے کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور اس نے اس کا حرام معاوضہ بھی حاصل کرلیا ہے۔

(۲) دوسرا قول: شوافع اور حنابلہ کا صحیح قول یہ ہے کہ جو مال حرام مالک کی مرضی سے صرف کیا گیا وہ اسے واپس کر دیا جائے، اسے بیت المال میں واپس نہیں کیا جائے گا، شوافع کا قول اس لیے مقبول نہیں ہے کہ مالک نے حرام اور معصیت میں اپنے مال کو برضا ورغبت خرچ کیا ہے۔

❁ جس مال کا مالک معلوم نہ ہو:

مالک کا مجہول اور نا معلوم ہونا یا تو حقیقۃً ہوگا کہ اس کی زندگی یا موت یا اس کی جائے اقامت کا علم نہ ہوسکے، یا مالک کا علم اس طور پر نہ ہوسکے کہ بے شمار لوگ اس کا استحقاق رکھتے ہو، مثلاً مالِ غنیمت میں سے قبل تقسیم چوری شدہ اموال چوں کہ جنگ میں شریک تمام افراد اس کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی فقہاء کے اقوال مختلف ہیں:

۱) پہلا قول: احناف، مالکیہ، حنابلہ، ابن حزم ظاہری وغیرہ جمہور علماء کا اس تعلق سے کہنا یہ ہے کہ اگر مال حرام کے مالک کا علم نہ ہو تو اس کو فقراء ومساکین اور اہل حاجت پر تقسیم کر دیا جائے گا یا مسلمانوں کے مصالح عامہ میں اس کو صرف کر دیا جائے گا۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وإن علم الوارث دين مورو ثه، والدين غصب أو غيره فعليه أن يقضه من التركة وان لم يقض فهو مؤاخذه في الآخرة، وإن لم يجد المديون ولا وارثه صاحب الدين ولا وارث، فتصدق المديون أو وارثه عن صاحب الدين برء في الآخرة (۱)

اگر وارث کو موروث کے قرض کا پتا ہو دین غصب وغیرہ خواہ کسی بھی طرح کا ہو اس کو ترکہ میں سے ادا کرے گا، اگر ترکہ میں ادا نہیں کرتا ہے تو اس کا آخرت میں مؤاخذہ ہوگا، اگر مدیون کو اور نہ ہی اس کے وارث کو قرض خواہ کا اور نہ اس کے کسی وارث کا پتا چل سکے تو یہ آخرت کے مؤاخذہ سے بچ جائے گا۔

ابن رشد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"أن الواجب على من كان في يده مال حرام أن يستغفر الله في خاصة نفسه، فما كان من مال الغصب أو السرقة أن الخيانة تصدق بوزنه إن كان غنيا وبالأكثر من قيمته وثمنه إن كان باعه، وإن كان من اموال الربا أن يتصدق بما أخذ ذلك أعني ما أعطى"

"جس کے قبضہ میں مال حرام ہے وہ خاص طور سے اپنے سلسلے میں اللہ

---

(۱) ابن عابدین: ردالمحتار: ۶/ ۴۴۳

عزوجل سے مغفرت طلب کرے، جو کچھ غصب شدہ، سرقہ کردہ یا خیانت سے حاصل شدہ اموال ہیں اگر غنی ہے تو اس کے وزن کے بقدر صدقہ کردے، اگر اس کو بیچ دیا ہے تو اس کی قیمت سے زیادہ صدقہ کرے، اگر وہ اموال ربا میں سے ہے تو زائد کو صدقہ کردے"۔

۲) دوسرا قول یہ ہے کہ مال حرام کا مالک معلوم نہ ہو تو اس کو تلف کیا جائے یا جلایا جائے، یا اس کو پانی میں ڈال دیا جائے، اس طرح کے اموال کو فقراء و مساکین پر صرف نہ کیا جائے، نہ ہی اسے بیت المال میں دیا جائے، اس کے قائل فضیل بن عیاض ہیں۔

جمہور نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جس میں آپ کا ایک جنازہ میں شرکت کے بعد اس شخص کی بیوی کی دعوت پر اس کے گھر گیے اور وہاں تناول طعام کے دوراں یہ فرمایا تھا کہ: یہ مال اس کے مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا ہے، اس لیے اسے فقراء میں تقسیم کردیا جائے "فقال رسول الله ﷺ اطعمه الفقر" یہ مال فقراء کو کھلا دیا جائے۔(۱)

مال کو اجازت کے بغیر لینے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اسے مالک کی طرف سے بطور نیابت کے صدقہ کرنے کو فرمایا، اس کو تلف کرنے کو نہیں کہا؛ اس لیے کہ اگرچہ اس کا مالک معلوم ہے؛ لیکن اس کو اس حالت میں واپس کرنا بے سود ہے، اگر واپس کرتے بھی ہیں تو اس کی آمد تک اس کے سڑ جانے کا اندیشہ ہے۔

ایسے ہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ:

"أنه أشترى جارية فلم يظفر بمالكه لينقده الثمن و بحث عنه فلم يجده، فتصدق بالثمن، و قال: اللهم هذا عنه إن رضى وإلا فالأجر لى.(۲)

---

(۱) أبو داؤد: باب فى اجتناب الشبهات: حدیث: ۳۳۳۴

(۲) مدارج السالكين: فصل و أما حقوق العباد فيتصور فى مسئال: ۱/۳۸۸، دار الكتاب العربى بيروت

''انہوں نے ایک باندی خریدا، اس کی قیمت کی ادائیگی کے لیے اس کے مالک کا پتا نہ چل سکا، اس کو تلاش کیا تو نہ پایا تو اس کی قیمت کو صدقہ کردیا اور فرمایا: اے اللہ یہ اسی کی طرف سے صدقہ ہے اگر وہ اس سے راضی ہو ورنہ اس کا ثواب اور اجر میرے لیے ہے''۔

صاحب تمہید نے یہ واقعہ نقل کیا ہے:

''مالک بن عبداللہ اصمعی نے سرزمین میں جہاد میں شرکت کی، ایک شخص نے مال غنیمت میں سے سو دینار چوری کر لیے، پھر ان کو لے کر معاویہ بن سفیان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا: لشکر روانہ ہو چکا ہے اور منتشر ہو چکا ہے، تو وہ وہاں سے نکلا اور عبادہ بن صامت کے پاس آیا اور ان کو تمام صورت حال کہہ سنائی تو انہوں نے فرمایا: معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو اس مال کا خمس آپ لے لیں، پھر آپ باقی کو صدقہ فرمادیں، اللہ عز وجل اس میں جن کا حق تھا ان تمام لوگوں کا علم رکھتا ہے، یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور اس کو ساری بات بتائی تو فرمایا کہ کاش کہ میں یہ فتویٰ تم کو دیا ہوتا یہ میرے لیے اس طرح سے مال سے زیادہ بہتر ہوتا''۔

اس لیے بھی کہ اس مال کے مالک کا پتا کرنا مشکل ہو چکا ہے، اب یا تو اس مال کو تلف کردیا جائے یا جلا دیا جائے یا دریا میں برباد کردیا جائے، یا فقراء ومساکین کے حوالہ کیا جائے جن کے یہاں کچھ نہیں ہے اور اس میں اجر وثواب کی امید کرنا یا اس مال کو تلف کرنا اس حدیث کے منافی ہے جس میں اضاعت مال سے منع کیا گیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ نقل وعقل کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ مالِ حرام جس کا مالک معلوم نہ ہو کو فقراء میں تقسیم کردیا جائے۔

جس کی نوے فیصد رقم سود کی ہو، وہ اب توبہ کیسے کرے؟

توبہ سے حرام روپیہ حلال نہیں ہوتا، حرام روپے کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک موجود ہو تو اس کو واپس کردے اور اگر ناجائز طریقے سے کمایا ہو تو بغیر نیتِ ثواب کے کسی محتاج کو دے دے، اور اگر اس کے پاس ناپاک روپے کے سوا کوئی اور چیز اس کے اور اس کے اہل وعیال کے خرچ کے لے نہ ہو تو اس کی یہ تدبیر کرے کہ کسی غیر مسلم سے قرضہ لے کر اس کو استعمال کرے اور یہ ناجائز روپیہ قرض میں ادا کردے، قرضے میں لی ہوئی رقم اس کے لیے حلال ہوگی اگرچہ ناجائز رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ ہوگا۔(۱)

مال مخلوطہ بالحرام پر زکوۃ

مال حرام پر زکوۃ کا واجب نہ ہونا مسلّم اور واضح ہے کہ زکوۃ تو حلال مال کی نکالی جاتی ہے اور حرام مال سارا کا سارا واجب التصدق ہوتا ہے؛ البتہ وہ مال جو حرام سے مخلوط ہو اور دونوں مالوں میں امتیاز مشکل ہو جائے؛ کیوں کہ اپنے حلال مال کے ساتھ حرام مال ملانے سے یہ مال حرام بھی اس کی ملک میں داخل ہو جائے گا؛ لہٰذا اس مخلوط مال پر زکوۃ واجب ہوگی۔

لیکن یہ زکوۃ کا وجوب اس وقت ہے جب کہ اس مال کے سوا دوسرا مال نصاب موجود ہو، الغرض خلاصہ یہ ہے کہ مال مخلوط بالحرام پر دو صورتوں میں زکوۃ آتی ہے:

۱) ایک تو اس صورت میں جب کہ اس حرام مال کے حقدار بری کردیں۔

۲) دوسرے اس وقت جب کہ اس کے اصحاب حقدار معلوم نہ ہوں۔

ان کے علاوہ باقی اور صورتوں میں اس پر زکوۃ تو واجب نہ ہوگی؛ البتہ اس پر حرام اموال کو ان لوگوں تک پہنچانا ضروری ہوگا، جن کے یہ اموال ہیں۔(۲)

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۵۹

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: نفائس الفقہ: ۱/ ۱۰۳

منافع سود کے احکام

مال حرام کی سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والے منافع کی پاکی

مال حرام کو حاصل کرنے والے نے اس مال کو لینے کے بعد اس میں سرمایہ کاری کے نتیجے میں جو منافع حاصل کیے ہیں، ان منافع کو اصل مال کے ساتھ اس کے مالک کو واپس کر دینا ہوگا، یا منافع کو رکھ کر اس کے مالک کے معلوم ہونے کی صورت میں اصل مال کے ساتھ اسے واپس کیا جائے گا یا معلوم نہ ہونے کی صورت میں صدقہ کیا جائے گا؟

جو مال مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا ہو، وہ اس مال کو اس کے مالک کو واپس کرنا چاہتا ہو تو کیا اس کے منافع کے ساتھ اسے واپس کیا جائے گا یا صرف اصل اور رأس المال کو واپس کرنا ہوگا؟

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ کا وقول قدیم اور امام احمد رحمہ اللہ کا ظاہر مذہب ابن حزم اور شوکانی کا کہنا یہ ہے کہ منافع اصل مال کے تابع ہوں گے؛ چوں کہ جب یہ مال حرام اس کے مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا تو اس سے حاصل شدہ منافع بھی حرام ہوں گے۔

چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

وإن عوائد المال الماخوذ عن صاحبه بلا سبب مشروع إذ تم توظيفه و استماره في مشروع ما ، تكون لرب المال إذا كان

---

(۱) ابن عبدالبر، التمہید: ۲/ ۲۵

معلوما و ليس لأخذها منها شيئى ، أما إن كان مجهولا ؛ فإنه يتصدق"(۱)

''جو اموال اس کے مال سے غیر مشروع طریقے سے حاصل شدہ ہیں اگر اس کو سرمایہ کاری کی جائے اور کسی مشروع اور جائز کاروبار میں اس کو لگایا جائے تو اس کے منافع بھی صاحب مال ہی کے ہوں گے اگر وہ مالک معلوم ہو، اس کو لینے والے کا کچھ بھی حصہ نہ ہوگا اگر وہ شخص مجہول ہو تو اس کو صدقہ کر دے''۔

ابن نجم کہتے ہیں:

إن الخبيث إن كان لعدم الملك فإن الربح يطيب، كما إذا ربح في المغصوب و الأمانة (الوديعة) و لا فرق بين المتعين و غيره، و إن كان لفساد الملك طاب فيما لا يتعين لا فيما يتعين (۲)

''اگر یہ خباثت ملکیت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے تو اس کے منافع صحیح ہیں ، جیسا کہ اس کو غصب شدہ ، امانت اور ودیعت کے طور پر رکھے ہوئے اموال سے منافع حاصل ہو، اس متعین اور غیر متعین کا کوئی فرق نہیں ، اگر یہ خباثت فساد ملک کی وجہ سے ہے تو وہ متعینہ اشیاء میں تو حلال اور غیر متعینہ میں حلال نہیں''۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب جدید اور احناف میں سے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ منافع کا مالک اس پر محنت صرف کرنے والا ہے، اس لیے ان منافع کا وہی مالک ہوگا۔

جمہور علماء نے ان روایات سے استدلال کیا ہے:

---

(۱) المرغيناني: الهداية: ۳/ ۱۳۳

(۲) ابن نجيم، الاشباه والنظائر: ۱۷۱

عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ دو انصاری ایک زمین کے سلسلہ میں جھگڑے، اس میں ایک نے کھجور کے درخت لگائے تھے اور زمین دوسرے شخص کی تھی، نبی کریم ﷺ نے زمین کا فیصلہ تو زمین والے کے لیے کیا اور کھجور کے درخت والے سے کہا کہ وہ اپنے کھجور کے درخت نکال لے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لاوارث زمین کو آباد کرے گا تو وہ اسی کا حق ہوگا اور ظلم کے درخت کا (جو اس نے جبراً لگایا ہو) کوئی حق نہ ہوگا۔(۱)

دوسرے کی زمین میں کھیتی کرنے والا ظالم؛ چوں کہ یہ شخص غیر کی زمین میں بغیر اس کی اجازت کے کھیتی کرکے زیادتی کرنے والا ہے۔

اس حدیث کی توضیح میں صاحب سبل السلام فرماتے ہیں:

والقول بأنه دليل على أن الزرع للغاصب حمل له على خلاف ظاهره ... وكيف يقول الشارع "وليس لعرق ظالم حق" و يسميه ظالما وينفي عنه الحق، نقول: بل له الحق"(۲)

''اور یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ کھیتی غاصب کی ہوگی یہ اس حدیث کو اس کے غیر محمل پر لادنا... شارع پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ''اور ظلم کے درخت کا (جو اس نے جبراً لگا دیا ہو) کوئی حق نہ ہوگا''

اور اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے:

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک دینار دے کر قربانی کا ایک جانور خریدنے کے لیے بھیجا، انہوں نے ایک دینار کے دو جانور خریدے، پھر ان میں سے ایک جانور کو ایک دینار کے بدلے بیچا اور وہ ایک دینار بچا کر ایک جانور بھی لے آئے نبی کریم نے انہیں بیع میں برکت کی دعا دی اس کے بعد اگر وہ

(۱) دار قطنی، حديث كتاب البيوع، حديث: ۱۴۴

(۲) الصنعانی، سبيل السلام: ۱۷/۳

مٹی بھی خریدتے تو اس میں بھی انہیں منافع ہوتا" فكان لو اشترى ترابا لربح "(۱)

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو تجارت کرنے کے لیے نہیں کہا: بلکہ صرف بکری کی خریداری کے لیے فرمایا، جب عروہ نے تجارت کے ذریعے نفع کمایا تو نفع بھی اصل مال کے ساتھ واپس کر دیا، ان کی محنت کا کچھ صلہ نہیں ملا، اگر محنت کا صلہ نفع ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو صرف دعا نہ دیتے؛ بلکہ وہ منافع ان کے سپرد کرتے۔

اس پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جس میں تین آدمیوں کا جنگل میں سفر کرنا، رات ایک غار میں گزارنا اور غار کے دہانے کو ایک چٹان کا ڈھنک لینا اور ان کا اپنے اعمال صالحہ کے توسط سے دعا کے نتیجے میں غار کا کھل جانا مذکور ہے، اس میں ایک شخص نے یوں کہا: اے میرے اللہ میں نے چند مزدور کام پر لگائے تھے میں نے ان کو ان کی مزدوری دی مگر ایک شخص اپنی مزدوری چھوڑ کر چلا گیا میں نے اس کی مزدوری کو بڑھانا شروع کیا یہاں تک کہ اس سے بہت زیادہ مال حاصل ہوا'' فثمرت أجره حتى كثرت منه الأموال '' ایک مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہا اے اللہ کے بندے مجھے میری مزدوری دے میں نے کہا یہ اونٹ گائے، بکری، اور غلام جو کچھ تو دیکھ رہا ہے یہ سب تیرے ہیں اس نے کہا اے اللہ کے بندے تو مجھ سے مذاق نہ کر میں نے کہا میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا چنانچہ اس نے ساری چیزیں لے لیں اور چلا گیا اس میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا اے میرے اللہ اگر میں نے یہ کام صرف تیری رضا کی خاطر کیا تھا تو ہم سے اس مصیبت کو دور کر جس میں ہم مبتلاء ہیں چنانچہ وہ چٹان ہٹ گئی اور وہ لوگ باہر نکل کر چلنے لگے۔(۲)

❁ اس حوالے سے حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب فرماتے ہیں کہ

''حرام مال مثلاً چوری اور غصب سے حاصل کیا ہوا مال تو بلا اظہار نام مالک کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا جائے، اس طرح اصل رقم سے بری

(۱) بخاری: حدیث نمبر: ۹۶۵۹۱

(۲) بخاری: باب من استأجر اجيرا افترك أجره، حدیث: ۲۱۵۲

الذمہ ہوجائے گا، البتہ جو اس آمدنی سے کمایا گیا ہے تو اگر امام ابو یوسف علیہ الرحمہ ضمان اور اصل مال کی ادئیگی کے بعد اس نفع کو جائز قرار دیتے ہیں؛ لیکن امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمہ اور امام محمد علیہ الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ یہ نفع ایک ذریعۂ حرام وخبیث سے پیدا ہوا ہے، اس لیے یہ پاک نہیں ہوسکتا اور اس کا صدقہ کرنا واجب ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے، اس لیے چاہیے یہ کہ اب تک جتنا نفع کما چکے ہیں اس کا تخمینہ کرلیں اور پکا ارادہ کرلیں کہ اتنی رقم آہستہ آہستہ صدقہ کردیں گے، اور یہ صدقہ کرنا بہ نیت ثواب نہیں ہوگا؛ بلکہ اپنے کو پاک کرنے کی نیت سے ہوگا''۔(۱)

سود کے منافع سے بنائی جائیدادوں کا حکم

کہانت ناجائز ہے، اس کی اجرت بھی حرام، گانا، بجانا، اور نوحہ ماتم وزنا کاری یہ سب حدیث کے بموجب حرام امور ہیں اور اس کی اجرت بھی حرام ہے، مزید یہ کہ جو چیزیں اصالۃً حرام ہیں ان سے انتفاع ان کے اصل کے استعمال کی طرح حرام ہے، بالفاظ دیگر ذاتی خباثت اس کے منافع کی طرف بھی منتقل ہوگی مثلاً جو کتے معلم اور حارس نہ ہوں ان کی ذات میں خباثت موجود ہے، اگر اس کو بیچ دیا جائے تو اس سے حاصل ہونے والی رقم بھی حرام اور حبیث ہوگی، شراب حرام ہے، اس کے بیچ دینے کے بعد رقم کا استعمال حلال ہوجائے، ایسا نہیں، نیز دم مفسوح کی خرید وفروخت حرام ہے؛ کیوں کہ یہ مسلمان کے حق میں مال متقوم نہیں ہے، اشیاء محرّمہ سب مسلمان کی ملکیت کے تحت داخل نہیں ہوتے اسی طرح ان اشیاء محرمہ کا حاصل و منافع بھی مسلمان کی ملکیت کے تحت داخل نہیں ہوتے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ شراب بیچ کر اس کی قیمت سے انتفاع حاصل نہ کیا جائے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برہمی کا اظہار فرمایا اور اسے یہود کی حیلہ بازیوں کی مانند قرار دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر چربی کو حرام

---

(۱) فتاویٰ قاضی: باب القضایا المعاصرۃ: ۱۱۳، ایفا پبلیکیشنز دہلی

کیا تو انہوں نے اسے پگھلا کر فروخت کر کے اس کے ثمن اور منافع کا استعمال شروع کر دیا۔(۱)

بعینہ اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی نے سودی رقم سے جائیداد بنائی ہو، عمارتیں تعمیر کی ہوں، یا کسی بھی طرح کا کاروبار کیا ہو، وہ سب کا سب حرام ہے، اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی یہ ممکن ہے، کیوں کہ سود کی حرمت اشیاء مذکورہ کی حرمت سے بدرجہا بڑھ کر ہے، ان کے حاصل کردہ منافع میں حرمت وخباثت بدستور رہتی ہے تو بینک ملازمین یا دوسرے سودی لین دین والوں کی سودی رقم سے بنائی ہوئی اشیاء (جائیداد، عمارات، کاروبار) میں بطریق اولی باقی رہنی چاہیے اور اسمیں کسی قسم کی تخفیف ہو سکتی ہے نہ اس بابت کسی قسم کی لچک کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ شریعت نے جس اہتمام کے ساتھ سود کی حرمت کو بیان فرمایا ہے اس طرح سودی منافع سے بنائی جائیداد کو پاک اور قابل استعمال بنانے والے حیلے حوالے کہ مثلا جائیداد کے خریدی کے وقت کی رقم کا اندازہ کر کے صدقہ کر دیا تو جائیداد کی حرمت ختم ہو جائے گی یا کسی غیر مسلم سے قرض لیا جائے اور سودی رقم اس کے قرض کی ادئیگی کے طور پر دے دیا جائے یہ سب حیلے حوالے سود کی حرمت کو کم کرنے والے نہیں ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ سودی رقم سے بنائی گئی جائیداد ہو یا کاروبار، لین دین ہو یا مکانات وتعمیرات ان پر سود کا حکم بہر حال جاری ہوگا، ان کی حیثیت سود کی سی ہے، شریعت میں سود اور حرام کے جو احکام ہیں وہ ان پر لاگو ہوں گے، ادلہ شرعیہ کی روشنی میں حرام مال (کسب خبیث سے ہو یا سود وغیرہ کی مدد سے) کے بعض احکام حسب ذیل ہیں:

اس کی اولین صورت تو یہ ہے کہ انسان صدق دل سے حرام کمائی کے گناہ سے توبہ کرے اور آئندہ نہ کرنے کا وعدہ کر لے اور جو کچھ بھی سودی معاملہ ہوا اسے ترک کر دے، اگر اس مال حرام کا تعلق شخصی معاملات سے مثلا چوری، رشوت، ڈاکہ اور سود

---

(۱) مجمع الزوائد:۸۹/۲

وغیرہ سے ہوتو ان صورتوں میں حکم یہ ہے کہ یہ اموال جن جن لوگوں سے ناجائز طریقے سے وصول کیے ہیں ان تک، اگر وہ زندہ ہو ورنہ ان کے ورثہ تک پہنچادے، اگر ارباب اموال معلوم نہ ہوں تو اس مال حرام سے اپنے ذمہ کو بری کرنے کے لیے اس کو فقراء پر بلا نیت ثواب صدقہ کردے۔(۱)

سودی قرضہ لے کر خریدے گیے مکان کے کرائے کا حکم

بینک سے سود پر قرض لینا بہت سخت گناہ ہے، اور اگر غلطی سے سودی قرض لے لیا گیا تو اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کی جو بھی صورت ہو اختیار کرنا واجب ہے، لیکن اس قرض کی رقم سے جو مکان خریدا گیا اس سے فائدہ اٹھانا حرام نہیں اور اگر اسے کرایہ پر دیا گیا تو وہ کرایہ بھی حرام نہیں، لہٰذا مکان کو فروخت کرنا ضروری نہیں ہے، اس کے کرائے سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (امداد الفتاویٰ) لیکن یہ اسی صورت میں جائز ہے جب سودی قرض سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ممکن ہو اگر مکان کو فروخت کیے بغیر سودی قرض سے چھٹکارا ممکن نہ ہو یا اس سے بہت دیر لگنے کا اندیشہ ہو جس سے سود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہے اور مسلسل سود کی ادیگی کا گناہ جاری رہے تو پھر مکان کو فروخت کر کے سود قرض سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہوگا۔(۲)

شوہر اگر بیوی کو سود کی رقم خرچ کے لیے دے تو وبال کس پر ہوگا؟

کسی عورت کا شوہر زبردستی اس کو گھر کے اخراجات کے لیے سود کی رقم دے جبکہ عورت کا اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو تو اس کا وبال شوہر کی گردن پر ہوگا، البتہ عورت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اس رقم کے استعمال سے انکار کردے؛ اور کہہ دے کہ محنت کر کے کھالوں گی مگر حرام نہ کھاؤں گی۔

---

(۱) مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۰/ ۳۲۷

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۲۱۴، بحوالہ احکام مال حرام: ۶۰

وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور أن اکلت من طعامه ولم یکن عین ذلک الطعام عصبا فهی فی سعة من أکله وکذا لو اشتریٰ طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من تناوله والاثم علی الزوج۔(۱)

جن کی آمدنی حرام ہو اس سے اپنا سامان فروخت کرنا

آدمی کی آمدنی اگرچہ سب ناجائز؛ لیکن جب تک متعین طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ جو چیز فروخت کر رہا ہے یہ حرام وناجائز کی ہے یا جو قیمت یہ دے رہا ہے وہ حرام وناجائز پیسہ کی ہے، اس کے ساتھ خرید وفروخت کا ناجائز ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے حاصل شدہ رقم کا حرام وناجائز ہونا ضروری ہے۔(۲)

سودخور کے ورثہ کے لیے سود کا مال حلال ہے یا نہیں؟

سودخور کے ورثہ کے لیے سود کا مال حلال ہے یا نہیں اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں احوط یہ ہے کہ جن سے سود لیا گیا ہے ان کو یا ان کی اولاد کو واپس کرے یا ان سے معاف کراوے اور اگر یہ متعذر (مشکل) ہو تو اس کو صدقہ کر دے۔ درمختار میں:

”وفی حظر الأشباه: الحرمة تتعدی مع العلم بها إلا فی حق الوارث وقیده فی الظهیریة بأن لا یعلم أرباب الأموال الخ“(۳)

سود کے پیسہ سے تیار کردہ نل کے پانی کے استعمال کا جواز

جس شے میں خبث ہو اس کا استعمال حرام ہے، نہ کہ اس سے مس کی ہوئی چیزوں کا بھی کیونکہ مس بالخبیث اسباب خبث سے شرع میں نہیں ہے ورنہ مس بالکافر سے تلوث لازم ہونا چاہیے پس نل میں اگرچہ وہ خبث ہو مگر وہ رعایا کے استعمال میں نہیں ہے

---

(۱) ردالمحتار: ۵/۹۹، آپ کے مسائل اوران کا حل: ۷/۳۴۵

(۲) منتخبات نظام الفتاویٰ: کتاب البیوع: ۳/۸۶

(۳) الدروالشامی: ۷/۲۲۳، کتاب البیوع، فتاوی دارالعلوم: ۱۴/۴۹۴

کیونکہ وہ اہل حکم کے تصرف میں ہے، پس وہی اس کے مستعمل ہیں اور جو پانی استعمال میں ہے وہ مباح ہے گونل سے مس کیے ہوئے ہو اور مس بالخبیث کا اسبابِ خبث میں سے نہ ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے۔(۱)

متفرق مسائل

(۱) ہر ماہ کا بل ہر ماہ ادا کر لینے پر سود سے حفاظت رہے گی، اگر ادا نہیں کیا یا مکمل ادا نہ کرنے کی صورت میں کمیٹی بقایا روپے پر اضافی رقم لیتی ہے تو یہ صریح سود ہے، معاملے کی یہ شکل ربا النسیئہ میں داخل ہے، ایک مسلمان کے لیے سود لینا اور دینا دونوں ناجائز ہے، اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔

(۲) قسطوں پر گاڑیاں خریدنا جائز ہے بشرطیکہ قیمت شروع میں ہی طے ہو جائے تاخیر کرنے پر ایک کی طے شدہ قیمت پر اضافہ نہ کیا جائے۔

(۳) بینک کی طرف جو پرافٹ (منافع) کے نام سے جو بھی ملتا ہے سب کا سب سود ہے: "کل قرض جر نفعا فھو حرام" (۲)

(۴) ڈاک خانے میں جمع کرائی گئی رقم پر ملنے والے اضافے کا حکم بھی سود ہے، اسے بلا نیت ثواب مستحقین پر خرچ کر دیا جائے۔

(۵) ایک اکاؤنٹ سے سود لے کر دوسرے اکاؤنٹ میں سود ادا کرنا، اور اسی غرض سے سودی اکاؤنٹ کھولنا یا سودی قرض لینا جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر سودی اکاؤنٹ میں پیسے رکھوا دیے گیے اور سودی قرض لے لیا گیا ہے تو اس طرح تصفیہ کر سکتے ہیں، ایک اکاؤنٹ سے لے کر دوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دیے ہوئے سود سے زائد نہ ہو برابر ہو جائے؛ لیکن آئندہ کے لیے یہ سلسلہ بالکل بند کر دیں۔

---

(۱) امداد الفتاویٰ جدید مطول: ۷/ ۲۱۰

(۲) الأشباہ والنظائر لابن نجیم مصری

(۶) ڈاک خانہ سے جمع شدہ رقم کا سود لینا جائز ہے اوراس کو مدرسہ کی ضروریات میں خرچ کیا جاسکتا ہے، تنخواہ میں دینا بھی جائز ہے۔

(۷) مصیبت زدہ شخص کے لیے جائز ہے کہ وہ بینک سے سود کی رقم وصول کر کے اپنے استعمال میں اور مقدمات کی پیروی میں بھی اور مظلوم پسماندگان کی امداد میں بھی خرچ کرسکتا ہے۔

(۸) غیر مسلم کی سودی رقم سے مسجد وعیدگاہ بنانا درست ہے اوراس میں نماز بھی درست ہے؛ کیوں کہ کفار کے حق میں سود حرام نہیں ہے، وہ فروعات کے مکلف نہیں ہے اور یہ "إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ" کے منافی نہیں ہے؛ لہٰذا ان سے چندہ لے کر مسجد وعیدگاہ بنانا درست ہے اور تعمیرات کرانے والے (یعنی آباد کرانے والے) مسلمان ہی سمجھیں جائیں گے، کفار سے چندہ لے کر مسلمان تعمیرات کراتے ہیں۔

(۹) سود کی رقم سے خریدی ہوئی زمین کی پیداوار کا کھانا جائز ہے، مگر احتیاط اس میں ہے کہ نہ کھایا جائے۔(۱)

---

(۱) مفتی عامر صاحب، بینک کے مسائل

سودی قرض اور احکام

سودی قرض لینا کب جائز ہے؟

سودی معاملہ اور سودی لین دین یہ نص قطعی سے حرام ہے، قرآن و حدیث میں اس پر بہت سخت وعیدیں آئی ہیں، سودی معاملہ سے باز نہ آنے والوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان آیا ہے نیز اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ سب برابر کے گنہگار اور ملعون ہیں۔

اَلْآخِذُ وَالْمُعْطِيْ فِيْهِ سَوَاءٌ (۱) کیونکہ اگر سود دینے والے افراد کسی سماج میں نہ ہوں تو سود خوروں کا کاروبار خود بخود بند ہو جائے گا۔

الغرض سودی معاملہ کا مرتکب سخت گناہگار فاسق، باغی و سرکش ہے اور اس کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔

البتہ سود لینے اور دینے میں فرق ہے، دونوں کی نوعیت یکساں نہیں ہے، کیوں کہ سود پر قرض لینے کے لیے آدمی بعض ناگزیر حالات میں مجبور ہو سکتا ہے، یا دیگر الفاظ میں ایسی کوئی ناگہانی مصیبت جس میں آدمی سود پر قرض لینے کے لیے مجبور ہو جائے اور اس کے بغیر اس کے پاس کوئی دوسرا چارہ کار نہ ہو، یا جان یا عزت پر آفت آ گئی ہو، تو ایسی صورت میں ایک مجبور و مضطر انسان کے لیے سودی قرض لینے کی اجازت ہو سکتی ہے، مگر سود لینے اور سود کھانے کے لیے فی الواقع کوئی مجبوری نہیں، سود تو وہی لے گا جو مالدار ہو،

---

(۱) مسلم شریف باب الصرف و بیع الذهب، حدیث نمبر: ۱۵۸۴

اور مالدار کو ایسی کیا مجبوری پیش آسکتی ہے کہ جس میں اس کے لیے سود لینا حلال ہو جائے۔

الغرض اضطرار اور حد درجہ کی مجبوری کی حالت میں جب کہ ہلاکتِ نفس کا خوف ہو جس طرح بقدر ضرورت مردار کھا کر اپنی جان بچانے کی اجازت ہے، اسی طرح فقہاء نے اضطرار اور حد درجہ کی احتیاج اور شدید مجبوری کی صورت میں جبکہ قرض وغیرہ ملنے کی بھی امید نہ ہو بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں ہے، الاشباہ والنظائر میں ہے: **و فی القنیة و البغیة یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح۔**(۱)

اور ''**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**'' کا مطلب علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے: ''محتاج کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ جو شخص مضطر ہو جائے اور شئی مباح یا شئی حرام مثلاً مردار میں سے کوئی چیز بقائے نفس کے لیے موجود نہ ہو، نیز لوگوں سے دست سوال دراز کر کے بھی حصول مال نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں زندگی بحال رکھنے کے لیے سودی قرض لینے کی اجازت ہوگی ورنہ نہیں۔(۲)

اس موقع پر یہ بات مکمل طور پر پیش نظر رہنا چاہیے کہ سودی قرض لینے کی اجازت حد درجہ کی مجبوری اور شدید احتیاج کی صورت میں ہے، زیب وزینت اور اپنی خواہش پوری کرنے کو ''ضرورت واحتیاج'' کا عنوان دینا سخت دھوکہ دہی اور بے ہودہ تاویل ہے، اور ضرورت وحاجت وغیرہ کے پانچ درجے ہیں: (۱) ضرورت (۲) حاجت (۳) منفعت (۴) زینت (۵) فضول۔

۱) **ضرورت:** کی تعریف یہ ہے کہ اگر ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو یہ شخص ہلاک یا قریب الموت ہو جائے گا، یہی صورت اضطرار کی ہے، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت سے مراد وہ اشیاء ہیں کہ جن پر شریعت کے مقاصد خمسہ - حفظ دین،

---

(۱) الاشباہ والنظائر ص:۱۱۵، البحر الرائق:۱۲۶/۶، باب الربوا

(۲) إعلاء السنن:۴۵۰/۱۴

حفظ نفس، حفظ نسل، حفظ مال اور حفظ عقل- کا حاصل ہونا موقوف ہو:

"أما الضرورية فمعناها أنها لابد منها فى قيام مصالح الدين والدنيا بحيث إذا فقدت لم تجز على استقامة، بل على فساد وتهارج وفوت حياة" (۱)

''ضرورت سے مراد وہ چیزیں ہیں، جو دین ودنیا کے مصالح کو قائم رکھنے میں ناگزیر ہوں کہ اگر وہ مہیا نہ ہوں تو دنیا کی مصلحتیں پوری نہ ہوسکیں؛ بلکہ فساد ودشواری اور وسائل زندگی سے محرومی ہوجائے''۔

اس حالت میں حرام وممنوع چیز کا استعمال (بہ چند شرائط) جائز ہوجاتا ہے۔

۲) حاجت: کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرے تو ہلاک تو نہیں ہوگا مگر مشقت اور تکلیف شدید ہوگی، یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ حاجت سے مراد وہ چیزیں ہیں جو شریعت کے مقاصد خمسہ کو حاصل کرنے میں شدید مشقت سے بچاتی ہوں، مثلاً کوئی شخص بھوکا ہے اور بھوک سے بہت زیادہ پریشان وبے چین ہو، لیکن کھانا نہ ملنے کی صورت میں ہلاکت تک نہ پہنچے، یہ صورت اضطرار کی نہیں اس لیے اس کے واسطے روزے، نماز، طہارت وغیرہ کے بہت سے احکام رعایت اور سہولتیں تو دی گئی ہیں مگر ایسی حالت میں حرام چیزیں نص قرآنی کے تحت حلال نہیں ہوں گی۔

۳) منفعت: یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال کرنے سے اس کے بدن کو فائدہ پہنچے گا لیکن نہ کرنے سے کوئی سخت تکلیف یا ہلاکت کا خطرہ نہیں جیسے عمدہ قسم کے کھانے اور مقوی غذائیں، اس حالت کے لیے نہ کوئی حرام حلال ہوتا ہے، نہ روزہ کا افطار جائز ہوتا ہے، مباح اور جائز طریقوں سے یہ چیزیں حاصل ہوسکیں تو استعمال کرے اور نہ حاصل ہوسکیں تو صبر کرے۔

---

(۱) الموافقات للشاطبی: ۲/ ۲۲۴

۴) **زینت:** جس سے بدن کی کوئی خاص تقویت بھی نہیں، محض تفریح خواہش ہے، ظاہر ہے اس کام کے لیے کسی ناجائز چیز کے جائز ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۵) **فضول:** وہ ہے جو زینت مباح کے دائرہ سے بھی آگے محض ہوس ہو، اس کا حکم بھی ظاہر ہے کہ اس کے لیے احکام میں کوئی رعایت ہونے کے بجائے اس فضول کی مخالفت احادیث صحیحہ میں وارد ہے۔ (۱)

لغات القرآن میں ہے: ''المضطر'' اسم فاعل واحد مذکر (اس کے معنی) بے قرار بے کس، بے بس۔ (۲)

مندرجہ بالا ضرورت و حاجت وغیرہ کی تعریف سے یہ ثابت ہوا کہ حرام چیز ضرورت اور اضطرار ہی کی حالت میں بقدر ضرورت جائز الاستعمال ہوتی ہے، لہٰذا سود جو بہ نص قطعی حرام ہے اضطرار اور مجبوری ہی کی حالت میں بقدر ضرورت جائز الاستعمال ہوگا، اور یہ بھی شخصی وانفرادی حالت میں، اس لیے کہ انفرادی صورت میں ضرورت متحقق ہونا سہل ہے کہ جو شخص اضطرار اور ضرورت میں مبتلا ہو وہ اپنی شخصی حالت کسی مفتی یا ماہر عالم کے سامنے پیش کرے اور اجازت ملنے پر بقدر ضرورت استعمال کرے۔ (۳)

اور بعض حالات میں حاجت کو بھی ضرورت کے درجہ میں مان کر اس پر بھی ضرورت کے احکام جاری کر دیتے ہیں ''الحاجة تنزل منزل الضرورة'' حاجت کو بھی ضرورت کے مرتبہ میں اتار لیا جاتا ہے۔

ان دو کے علاوہ باقی تین مرحلوں میں حرام و ممنوع شئی مباح نہیں بنتی ہے۔

ضرورت کی دو قسمیں:

---

(۱) جواہر الفقہ: ۲/ ۲۷، ۲۸

(۲) لغات القرآن: ۵: ۴۰۲، مؤلف مولانا عبد الرشید نعمانی

(۳) مستفاد: فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۲۷۹، ۲۸۱

پھر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ ضرورت کی دو قسمیں کرتے ہیں چنانچہ حضرت فرماتے ہیں:

ضرورت کی عرفی دو قسمیں ہیں: (۱) تحصیل منفعت خواہ دینی ہو یا دنیوی خواہ اپنی ہو یا غیر کی اور (۲) دفع مضرت (یعنی ضرر کا دور کرنا) اسی تعمیم کے ساتھ (یعنی خواہ ضرر دینی ہو یا دنیوی اور خواہ اپنا ہو یا غیر کا)۔

سو تحصیل منفعت کے لیے ایسے (یعنی حرام) افعال کی اجازت نہیں مثلاً محض تحصیل قوت ولذت کے لیے دوائے حرام کا استعمال کرنا یہ ناجائز ہے البتہ دفع مضرت کے لیے جائز ہے جبکہ وہ قواعد صحیحہ منصوصہ (یعنی جو کتاب وسنت میں صراحۃً منقول ہوں) یا اجتہادیہ (یعنی جو کتاب وسنت میں صراحۃً منقول نہ ہوں بلکہ مجتہدین کے قواعد سے مؤید ہوں) اور شرعی ضرورت یہی ہے مثلاً دفع مرض کے لیے دوائے حرام کا استعمال جبکہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہو گیا ہو۔ کیونکہ بدون اس کے ضرورت کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔

حضرت کی اس تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شریعت جس ضرورت کے پیش نظر اکل واستعمال حرام کی اجازت دیتی ہے وہ ضرورت ''دفع مضرت'' کی ہے جبکہ مضرت ایسے مرحلے میں پہنچ جائے کہ بجز ارتکاب حرام یا استعمال حرام کے اس کا کوئی اور علاج نہ رہ جائے اور اس کی تشخیص کوئی تجربہ کار اور متدین شخص کرے یا جیسا کہ حضرت نے لکھا ہے کہ تجربہ سے دوسری دوا وتدابیر کا نافع نہ ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ (۱)

اس حوالہ سے ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب رماتے ہیں:

ایک اور دلچسپ عذر سود کے تحفظ کا یہ پیش کیا جارہا ہے کہ اس وقت ملک وقوم ایک اضطراری کیفیت کا شکار ہیں اور اضطرار میں قرآن پاک نے حرام کھانے کی بھی اجازت دی ہے لہٰذا موجودہ حالات میں سود جائز ہونا چاہیے، معلوم نہیں یہ بات ارشاد

---

(۱) مستفاد از الربا (سود) ص: ۲۴۹

فرمانے والے حضرات سنجیدگی سے ایسا فرمارہے ہیں یا برسبیل مزاح یہ بات کہتے ہیں، بہرحال دونوں صورتوں میں یہ ایک قابل افسوس رویہ ہے، سنجیدگی کی صورت میں کہنے والے حضرات کی عقلی اور فکری سطح پر افسوس ہوتا ہے اور برسبیل مزاح کہنے والوں کے اس رویہ پر جوانہوں نے قرآن وسنت کی نصوص قطعیہ کے بارے میں اپنایا ہوا ہے، یہاں ان گزارشات کے مخاطبین صرف اول الذکر حضرات ہیں اس لیے کہ آخر الذکر حضرات کے حق میں سوائے دعا اور اظہار افسوس کے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

اضطرار سے مراد شریعت کی اصطلاح میں وہ کیفیت ہے جس میں کسی شخص یا اشخاص کی جان، مال، خاندان، عقل، آبرو یا دین کو ایسا شدید خطرہ لاحق ہو جس میں یہ بات یقینی اور حتمی ہو کہ اگر فوری مداوا نہ کیا گیا تو ان میں سے کوئی ایک چیز فوری طور پر تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائے گی، مثال کے طور پر کوئی شخص دوران سفر اتنی شدید پیاس کا شکار ہے کہ اگر فوراً چند گھونٹ پانی کے اس کے حلق میں نہ ٹپکائے گئے تو فوری طور پر اس کی موت واقع ہو جائے گی، ایسی صورت میں اگر پانی یا کوئی اور جائز مشروب دستیاب نہ ہو تو شراب کے چند گھونٹ پلا کر جان بچالینا جائز ہے، لیکن جہاں قرآن پاک کی اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھانا مقصود ہو اور ناگزیر ضرورت سے زیادہ حرام مال کا استعمال کیا جائے، مثلاً اگر تین گھونٹ شراب سے جان بچ سکتی ہو تو چار گھونٹ جائز نہ ہوں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج ہمارے سودخوروں میں کوئی ایسا ہے جو اضطرار کی اس کیفیت میں مبتلاء ہو کہ اگر سودخوری سے بچنے لگا تو جان چلی جائے گی یا جائز کمائی برباد ہو جائے گی، یا اگر حکومت آج سودی اسکیمیں ختم کردے تو لوگ مرنے لگ جائیں یا ان کی جائیدادوں کو فوراً آگ لگ جائے گی؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر اضطرار کی دہائی دینا کیا معنی البتہ اگر ملک کے دفاع کے ضمن میں بعض ایسی ناگزیر اشیاء کا حصول مقصود ہو جن کے حصول پر ملک وملت کا دفاع موقوف ہے اور ان کا غیرمما لک

سے حصول بلاسودی لین دین کے ممکن نہ ہوتو شاید اضطرار کا اصول کام دے سکے اس لیے کہ اسلامی ریاست کا دفاع شریعت کے بنیادی اہداف میں سے ہے۔(۱)

ضرورت کی حد بقدر ضرورت ہے

یہ امر بھی ذہن نشین کرلیا جائے کہ ضرورت یا حاجت کی بنا پر جو رخصت اور چھوٹ حاصل ہوتی ہے وہ صرف ضرورت کو پورا کر لینے کی حد تک ہوتی ہے اس لیے ضرورت وحاجت کی بنا پر حاصل ہونے والی رخصتوں کے ذکر کے بعد ایک قاعدہ ''ما أبیح للضرورة تتقدر بقدر الضرورة'' کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کا اعتبار بس بقدر ضرورت ہوتا ہے اور ضرورت کے پورا ہوجانے کے بعد پھر کوئی اعتبار نہیں رہ جاتا مثلاً مضطر (مجبور وضرورتمند) کو مردار یا خنزیر سے اتنا ہی کھانے کی اجازت ہے جس سے وہ اپنی جان بچالے، پیٹ بھر کھانے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ علماء احناف نے ارشادِ باری: ''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ'' کے تحت عدوان کی تفسیر کرتے ہوئے تصریح کی ہے؛ لہٰذا جو شخص کسی ماہر عالم دین کی نگرانی میں سودی قرض لیا ہو یا کسی حرام کا مرتکب ہو چکا ہوتو وہ اپنی ضرورت پوری ہوتے ہی اس سے گلوخلاصی کرنا ضروری ہوگا کہ یہ حرام کام کی رخصت ضرورت کے بقدر ہی ہوتی ہے۔

ضرورت وحاجت کا معیار شریعت کی نظر میں

احکامِ فقہیہ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بہت سے احکام کا مدار عام دلائل سے قطع نظر ''ضرورت'' پر ہے یا یوں کہیے کہ بہت سی چیزوں کا حکم عام حالات کے اعتبار سے کچھ ہوتا ہے اور ضرورت کے درپیش ہونے پر کچھ اور ہوجاتا ہے یعنی عام حالات کے مقابلے میں کچھ چھوٹ اور رخصت حاصل ہوجاتی ہے۔

بلکہ کلام پاک جو کہ احکامِ فقہیہ کی اصل ہے خود اس میں بعض مواقع پر تصریحات

---

(۱) حرمتِ ربا اور غیر سودی مالیاتی ادارے، ص:۸۷

موجود ہیں کہ بعض چیزیں جن کا کھانا عام حالات میں جائز نہیں ہوتا مخصوص حالات میں ان کے کھانے کی اجازت ہوتی ہے۔ جن آیات میں جسم سے بہنے والا خون، مردار، خنزیر نیز غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانوروں کی حرمت کا تذکرہ ہے ان میں یہ بھی مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بھوک مٹانے کے لیے انھیں چیزوں کے کھانے پر مجبور ہوجائے کہ کوئی دوسری چیز کھانے کے لیے اسے میسر نہ ہو تو اس کے لیے ان اشیاء کا کھانا جائز ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''(۱) کہ جو شخص بھوک سے بہت ہی بیتاب ہوجائے بشرطیکہ نہ تو کھانے میں طالبِ لذت ہو اور نہ ضرورت وحاجت کی مقدار سے آگے بڑھنے والا ہو تو اس حالت میں ان چیزوں کے کھانے میں بھی اس شخص پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اسی جیسی آیت سورۂ مائدہ رکوع (۱) اور سورۂ نحل رکوع (۱۵) میں موجود ہے۔

اور مشکوۃ شریف میں ابوواقد لیثی سے ایک روایت منقول ہے کہ

'' ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں ہم کو سخت بھوک کی حالت سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو مردار ہمارے لیے کب حلال ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جب صبح یا شام کو تمہیں ایک پیالہ بھی پینے کو نہ ملے اور کسی قسم کی کوئی سبزی بھی کھانے کو نہ ملے تو تمہارے لیے مردار حلال ہوگا۔ (۲)

فقہاء نے ان آیات واحادیث کو نیز ان آیات کو جن میں دین کے سلسلے میں آسانی وسہولت کا ذکر ہے اپنے اس استنباط کے سلسلہ میں اصل قرار دیا ہے کہ کوئی بھی ایسی چیز جس کا کھانا یا استعمال میں لانا یا کرنا شرعاً حرام ہو۔ اگر کوئی انسان کسی وجہ سے اس کے ارتکاب

---

(۱) البقرۃ:۱۷۲

(۲) مشکوۃ:۳۷۰

واستعمال پر اس معنی کر مجبور ہو کہ اس کی ضرورت کا دفعیہ بغیر اس حرام کو اختیار کیے ممکن ہی نہ ہو تو اسے اس حرام کے استعمال کی اجازت دی جائے گی خواہ ضرورت بھوک مٹانے اور پیٹ بھرنے کی ہو یا دوا وعلاج وغیرہ کی یا کسی اور قبیل کی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ'' (۱) ''اللہ تمہارے لیے آسانی کا ارادہ فرماتا ہے دشواری کا نہیں'' اور سورۂ حج میں ارشاد ہے: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'' (۲) ''اللہ نے دین کے معاملہ میں تم پر تنگی نہیں رکھی ہے''۔

اس حوالہ سے ملا علی قاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: انسان کو یہ ضرورت تو لاحق نہیں ہوسکتی کہ وہ سود کھانے پر مجبور ہو جائے (یعنی سود کے لینے پر) اس لیے کہ سود کھانے والے کے پاس روپیہ ضرور ہوتا ہے اسی کو بطور قرض دوسروں کو دیکر ان سے وہ سود لیا کرتا ہے تو جب اس کے پاس روپیہ موجود ہے تو وہ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی بھی معاملہ یا تجارتی صورت اختیار کرسکتا ہے۔

البتہ سود دینے والے کو کبھی ایسا اضطرار پیش آسکتا ہے (کہ وہ سود دینے پر مجبور ہو جائے) لیکن اسے بھی صریح ربا سے بچنا چاہیے اور کسی قسم کا بیع وغیرہ کا معاملہ کر لینا چاہیے اس لیے کہ فرمان باری ہے: ''وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' ''سود کو اس نے حرام کیا ہے'' اور اس حیلہ میں بھی ڈرتے رہنا چاہیے اگرچہ امید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائیں گے۔ (۳)

اور شیخ محمد ابوزہرہ فرماتے ہیں کہ سود کا کسی بھی طرح استعمال اور اس کا کھانا یہ تو حرام لذاتہ ہے ضرورت شرعیہ کے پیش آنے پر ہی مباح ہوسکتا ہے البتہ سودی قرض لینا تو اس کی حرمت لغیرہ ہے یعنی اس وجہ سے ہے کہ سود کے استعمال اور اس کے کھانے کا

---

(۱) البقرۃ:۱۸۵

(۲) الحج:۷۸

(۳) مستفاد از الربا (سود):۲۵۲-۲۵۳

ذریعہ نہ بنے اور جس چیز کی حرمت اس انداز کی ہو وہ ’’حاجت شرعیہ‘‘ کے پیش آنے پر مباح ہو جاتی ہے اور اس کی اباحت کے لیے ضرورت شرعیہ کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔(۱)

حضرت مولانا عبید اللہ اسعدی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

سودی قرض لینے کے حق میں ضرورت کا ذکر تو بے سود ہے اس لیے کہ ضرورت تو وہ حالت ہے جس میں انسان کے لیے مردار اور خنزیر کا کھانا نیز بھیک مانگنا بھی جائز ہو جاتا ہے لہٰذا اس حالت میں تو کسی ذریعہ سے بھی ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی ؒ نے ذکر فرمایا ہے۔

البتہ مرحلہ جات کا ذکر ضرور کیا جاسکتا ہے جس کا مرتبہ ضرورت سے کمتر ہے اور جس سے وہ حالت مراد ہوتی ہے کہ اگر اس کا دفعیہ نہ کیا جائے تو ضرورت سے دوچار ہونا یقینی ہو، جس کا عام حکم یہ ہے کہ اس کی بنا پر حرام کی حلت نہیں ہوتی، ہاں یہ کہ بعض حالات میں اسے ضرورت کے درجے میں مان کر استعمال حرام کی اجازت دے دیا کرتے ہیں۔

لہٰذا صرف اپنی حاجت کو پورا کرنے کے بقدر ماہر شریعت کی رہبری میں سودی قرض لینا جائز ہوگا۔(۲)

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی ؒ اس موضوع سے متعلق اپنے ایک فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’جو لوگ سودی روپیہ لیتے ہیں جہاں تک دیکھا گیا ہے فضول کام کے لیے لیتے ہیں اور جو ضرورت میں بھی لیتے ہیں تو اپنے گھر کے ذخیرہ کو زیور و اسباب کو ملحوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی اپنے پاس رہے اور قرض سے کام چل جائے پس یہ بھی ضرورت میں لینا نہ ہوا وہ ضرورت یوں ہی پوری ہو سکتی ہے کہ اول سب چیزیں اپنی بیچ ڈالیں، یا اپنی شان اور وضع

(۱) مستفاد از الربا (سود)::۲۵۶

(۲) حوالہ سابق:۲۶۱-۲۶۲

کو محفوظ رکھنے کے لیے محنت ومزدوری کو عار سمجھتے ہیں لہٰذا عقلاً وشرعاً یہ ضرورتیں قابل اعتبار نہیں، پھر ان سب کے بعد ایسے اضطرار کے وقت مردار کھانا بھیک مانگ لینا بھی درست ہے پس سود پر قرض لینے کی کسی حال میں ضرورت نہیں ہے اس لیے گنہگار ہوگا لہٰذا اگر ضرورت کی بنیاد، مال ودولت کی بڑھوتری وزیادتی اسراف وعیش پرستی، حصول جاہ، حفاظت مال واسباب، خیال ولحاظ شان ووضع کو بنایا جائے تو حرام کے ارتکاب واستعمال کی ہرگز ہرگز گنجائش واجازت نہ ہوگی"۔(۱)

خلاصہ

لہٰذا سودی قرض لینے کے لیے ہر ضرورت اضطرار اور مجبوری کی تعریف میں نہیں آتی، شادی بیاہ کی رسموں میں فضول خرچی کرنا، عیش وعشرت کے سامان مہیا کرنا، یا کاروبار کو ترقی دینے کے لیے روپیہ فراہم کرنا اور ایسے ہی دیگر امور جن کو "ضرورت" اور "مجبوری" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کے لیے ہزاروں روپے مہاجنوں اور بینکوں سے قرض لیے جاتے ہیں، کوئی حقیقی ضرورت اور مجبوری نہیں ہے، اور شریعت کی نگاہ میں ان کی قطعاً کوئی وقعت نہیں ہے، اور ان جیسی اغراض کے لیے جو لوگ قرض لے کر سود دیتے ہیں، وہ سخت گنہگار ہیں، شریعت اگر کسی مجبوری پر سودی قرض لینے کی اجازت دے سکتی ہے تو وہ اس قسم کی مجبوری ہے جس میں آدمی کے لیے حرام حلال ہوسکتا ہے، ارشاد ربانی ہے: إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (۲) مگر یہ کہ تم اس حرام کے کرنے پر مجبور ہو جاؤ، مگر وہ تمام ذی استطاعت مسلمان گنہگار ہوں گے جنہوں نے اس مصیبت میں اپنے بھائی کی مدد نہیں کی اور اس کو اس فعل حرام کے ارتکاب پر مجبور کر دیا، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس گناہ کا وبال پوری قوم پر ہوگا، کیوں کہ اس نے زکوۃ وصدقات اور اوقاف کی تنظیم سے مجرمانہ

---

(۱) مستفاد از امداد الفتاویٰ جدید مطول: ۶/ ۵۹۳

(۲) سورۃ الانعام: ۱۱۹

غفلت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے افراد بے سہارا ہوگیے اور ان کے لیے اپنی ضرورتوں کے وقت ساہوکاروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔

ضرورت کا تعین ماہر شریعت کرے گا

پھر یہ بات بھی یاد رکھیں کہ ضرورت وحاجت کا تعین خود صاحب معاملہ نہیں کرے گا بلکہ شرعی قوانین واصول کی روشنی میں کوئی ماہر شریعت اور صاحبِ بصیرت شخص ہی اس کا تعین کرے گا۔

لہٰذا اس حالت کے شرعی تعین کے لیے ہر صاحب معاملہ کو اپنے حالات کسی ماہر کے سامنے بیان کرنے ہوں گے، تاکہ وہ شرعی اصول وقوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے صورت حال کی نزاکتوں اور اس کے تمام پہلوؤں سے واقف ہوکر صحیح مناسب حکم کی تجویز کر سکے، جیسے کہ بطور دوام کسی حرام شئ کو استعمال کرنے کے لیے مسلم طبیب حاذق سے رجوع ضروری ہے۔

ماہر شریعت کی قید کی دو مصلحتیں

اس قید یعنی کسی ماہر شریعت سے رجوع میں دو مصلحتیں ہیں اول تو یہ کہ احکام شریعت عوام کے ہاتھوں میں پڑھ کر کھیل نہ بن جائیں، اس لیے اگر کوئی ایسی قید نہ لگائی جائے تو شاید ہر شخص خود کو حاجت مند قرار دے کر اپنے حق میں ربا کے جواز کا دعویٰ کر بیٹھے گا، چنانچہ یہ بات موجودہ حالات میں پورے طور پر ظاہر ہے کہ بے شمار لوگ اپنی ذہنی ضرورتوں کی بنیاد پر اپنے حق میں اس کو درست سمجھتے ہیں اور علماء سے جواز کہلوانا ولکھوانا چاہتے ہیں۔

دوسری مصلحت یہ ہے کہ اس صورت میں حرام کے ارتکاب واستعمال کی اجازت کی تمام تر ذمہ داری اس عالم ومفتی کے سر ہوگی جو صاحب معاملہ کو شرعاً حاجت مند قرار دیکر اسے حرام کے استعمال کی اجازت دے گا، اور خود صاحبِ معاملہ کی اس پر کوئی دارو گیر نہ ہوگی۔

کتب فقہ میں بعض ایسے مسائل مذکور ہیں جن میں کسی فقیہ ومفتی سے رجوع کے

بعد عمل قابل مواخذہ نہیں قرار پاتا اگر چہ شرعاً وہ عمل درست نہ ہو، مثلاً روزوں کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ لکھا ہے کہ اگر روزہ دار پچھنا لگوائے اور یہ سمجھ کر کہ اس عمل سے روزہ جاتا رہا بعد میں کھانا کھالے تو اسے روزے کی قضا بھی کرنی ہوگی اور کفارہ بھی ادا کرنا ہوگا، لیکن اگر اس نے کسی فقیہ کے فتویٰ کی بنا پر ایسا کیا تو صرف قضا ہوگی کفارہ نہ ہوگا۔(۱)

ضرورت پر سودی قرض دینا

چونکہ اس صورت میں سودی قرض کا دینا محض سود کو حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ قرض وہی دے گا جس کے پاس ضرورت سے فاضل سرمایہ ہو اور سرمایہ کے ہوتے ہوئے نہ تو ضرورت کا تعلق ہوسکتا ہے اور نہ حاجت کا لہٰذا سودی قرض دینے کے حق میں دونوں میں سے کسی کے وجود واعتبار کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ جیسا کہ ملا علی قاری علیہ الرحمۃ نے تصریح کی ہے۔(۲)

سودی قرض سے کاروبار اور اس کی آمدنی

اگر کوئی شخص اپنی بنیادی ضرورتوں یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کو پورا کرنے کے لیے کسی سے قرضِ حسنہ نہ پائے، اور اس مجبوری کی حالت میں کسی سے سودی قرض لے، اور پھر اس قرض کی رقم سے کوئی جائز کاروبار کرکے ذاتی زمین خریدے، مکان بنالے، یا دوسری ضرورت کی چیزیں حاصل کرلیں، تو یہ تمام چیزیں اسی کی ملک ہیں، اور حلال ہیں، کیونکہ بوقت ضرورت سود پر قرض لینے کی گنجائش ہے اور بلاضرورت سودی قرض لینا حرام ہے مگر اس صورت میں بھی محض سود دینا حرام ہے، نہ کہ وہ رقم جو قرض پر لی گئی اور باقی ماندہ مال میں یہ حرمت سرایت نہیں ہوگی، بخلاف سود لینے کے، کیونکہ سود لینا ہر حال میں حرام ہے، اور اس سے حاصل آمدنی بھی حرام ہوتی ہے۔(۳)

---

(۱) مستفاد از الربا: ۲۵۹-۲۶۰

(۲) مستفاد از الربا: ۲۵۹-۲۶۰

(۳) اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۵/ ۲۲۰

سودی قرض لینے والے پارٹنر کے ساتھ شرکت

اگر کسی مسلمان کا دوست غیر مسلم ہو اور وہ اس کے ساتھ شرکت میں یعنی پارٹنر بن کر کوئی جائز کاروبار کرنا چاہتا ہے لیکن اس غیر مسلم کے پاس رقم نہ ہونے کی وجہ سے وہ بینک سے سودی قرض لا کر لگاتا ہے تو اس طرح کی شرکت سے احتراز کرنا چاہئے، تاہم! اگر مسلمان اس کے ساتھ مل کر کاروبار کرتا ہے، تو اس کے لیے اپنے حصہ کے منافع درست ہے، کیونکہ معصیت اصل کاروبار میں واقع نہیں ہوئی بلکہ غیر مسلم دوست کے سودی قرض لینے میں ہے۔(۱)

تعلیمی قرضے

کسی بھی قوم کی بقاء زندگی اور عزت کے لیے تعلیم اس کی بنیادی ضرورت ہے، یہ ضرورت انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی اس سے کسی کو انکار نہیں اور تعلیم سے مراد دینی تعلیم ہے، اس پر بھی جمہور کا اتفاق ہے اس میں دنیوی واخروی فلاح وکامیابی مضمر و پوشیدہ ہے۔

مگر اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری فنون کی تحصیل کی بھی شریعت نے نہ صرف حمایت کی، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے جیسا کہ احادیث نبویہ اس پر شاہد ہیں، تاکہ انسان ان فنون کے ذریعہ دیگر انسانوں کی خدمت کر سکے، انہیں اپنے لیے حلال آمدنی کا ذریعہ بنا سکے، اور ان فنون میں دیگر اقوام کا دستِ نگر نہ رہے۔

لیکن عصری فنون کی تعلیم بڑی مہنگی ہو چکی ہے کیونکہ لوگوں نے اسے ایک نفع بخش تجارت بنالیا، اور ان کی تحصیل کو اس قدر گراں کر دیا کہ متوسط المعاش لوگوں کے لیے ان تک رسائی انتہائی دشوار گزار امر بن چکا، حکومتِ ہند نے ایسے لوگوں کی سہولت کے لیے کم شرح سود پر تعلیمی قرضوں کا نظم کیا ہے اور اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ ان قرضوں سے سود حاصل کرنا ہمارا مقصد نہیں بلکہ تعلیم میں تعاون مقصود ہے۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا اس کم شرح سود کو سروس چارج (اجرتِ خدمت) پر محمول کیا

---

(۱) حوالہ سابق: ۲۲۱/۵

جاسکتا ہے؟ اور ایسی تعلیم کے لیے سودی قرضہ لیا جاسکتا ہے؟

تو اس حوالہ سے مفتی محمد جعفر ملی رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ سودی قرض صرف بوقتِ ضرورت اور وہ بھی بقدرِ ضرورت ہی لیا جاسکتا ہے اور ضرورت وہی ہے جسے فقہائے کرام نے ضرورت قرار دیا ہے، اور اعلیٰ تعلیم ایسی ضرورت نہیں ہے جس کے لیے سودی قرض لینا جائز ہو خواہ وہ کم شرح سود والا قرض ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ حرام قلیل ہو یا کثیر حرام ہوتا ہے اور اس سے بچنا فرض ہے۔

نیز کم شرح سود والے قرض کو جائز قرار دینا سود کے دروازے کو کھولنے کے مترادف ہے، وہ اس طرح کہ اگر اعلیٰ تعلیم کے لیے اس طرح کے قرض کو لینا جائز قرار دیا جاتا ہے تو لوگ دیگر مواقع میں بھی بلا جھجک و بلا روک ٹوک زیادہ شرح سود والے قرض کو بھی لیں گے، اور یہی کہیں گے کہ ''یہ شرحِ سود کم ہی ہے، کیوں کہ پہلے شرح سود اتنی تھی اور اب اتنی'' جیسا کہ آج کل گھروں کے لیے قرض (housing loan) کی شرح سود کم کی گئی جب کہ فقہ کا مسلم قاعدہ ہے کہ: ذریعۂ حرام بھی حرام ہے۔

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبہ میں داخلہ کا اہل ہو اور وہ بیرونِ ملک جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کے لیے ساز گار نہیں ہیں، اور وہ کم شرح سود والے قرض سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسے بھی اس کی اجازت نہیں ہے اس لیے کہ جدید تعلیم کی تحصیل فرضِ کفائی ہے اور سود کے لین دین سے بچنا فرضِ عین ہے، اور فرضِ عین کو چھوڑ کر فرض کفائی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ شریعتِ اسلامیہ نے مامورات سے زیادہ منہیات کی جانب اعتنا کیا ہے وہ اس طرح کہ امر بالشئی میں امر حسبِ استطاعت بجالانے کا حکم ہے اور نہی میں بچنا ہی بچنا ہے۔

فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ(۱)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، حدیث نمبر: ۱۳۳۷

کہ جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم کروں، تو جہاں تک ہو سکے تم اس کو بجالاؤ اور جب میں تمھیں کسی چیز سے روکوں تو باز آجاؤ۔(۱)

❁ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مسلمانوں کو منظم طور پر تعلیمی اعتبار سے پسماندہ بنانے کی سازشیں کی جارہی ہیں اور اعلیٰ تعلیم پر مبنی ملازمتوں میں ان کا تناسب کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے، مسلمانوں کے لیے اعلیٰ عصری تعلیم کا حصول حاجب کے درجہ میں ہے اور اس سے محرومی کی وجہ سے قومی اور اجتماعی سطح پر غیر معمولی نقصان پہنچ رہا ہے جس کا اصحاب دانش کو خوب اندازہ ہے؛ اس لیے اس وقت اعلیٰ تعلیم کا حصول اور اس کے ذریعہ ان سرکاری ملازمتوں تک پہنچنا جو قومی پالیسیاں طے کرتے ہیں، ایک اجتماعی حاجت کے درجہ میں ہے؛ اس لیے تین شرطوں اور ایک تنبیہ کے ساتھ اس کی گنجائش ہونی چاہیے:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ طالب علم نے اس اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنی لیاقت ثابت کردی ہو۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے پاس اموال منقولہ یا غیر منقولہ کی شکل میں اتنا مال موجود نہ ہو کہ وہ خود اس تعلیم کا خرچ پورا کر سکے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ اس کو کسی ادارہ یا فرد سے غیر سودی قرض فراہم نہ ہو پائے تو اس صورت میں اس کے لیے اس طرح کا قرض لینے کی گنجائش ہوگی، دوران تعلیم حکومت نے بینک کو جو سود ادا کیا؛ چوں کہ اس کی ذمہ داری طالب علم پر نہیں ہوگی؛ اس لیے یہ حکومت کا عمل ہے اور ویسے بینک بھی حکومت ہی کا ادارہ ہے؛ اس لیے حکومت ایک ہاتھ

---

(۱) فقہی، فکری و اصلاحی مقالات و مضامین: ۶۸-۷۱

سے پیسے دے رہی ہے اور دوسرے ہاتھ سے لے رہی ہے۔

رہ گیا اس مدت کے بعد تاخیر پر انٹرسٹ ادا کرنا تو اس سلسلہ میں قرض حاصل کرنے والوں کو متنبہ کیا جانا چاہیے کہ وہ جلد سے قرض ادا کریں؛ تاکہ انٹرسٹ سے بچ سکیں، اور باوجود کوشش کے اگر وہ بروقت پیسے ادا نہیں کرسکا تو امید ہے کہ یہ ''**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**'' کے دائرہ میں آجائے گا اور ان شاء اللہ وہ گنہگار نہیں ہوگا''(۱)

فقہ اکیڈمی کا فیصلہ

جس طرح سود لینا حرام ہے اسی طرح شریعت نے سودی قرض لینے اور سود ادا کرنے کو بھی حرام قرار دیا ہے، اس لیے بنیادی طور پر تعلیم کے لیے سودی قرض حاصل کرنا جائز نہیں؛ البتہ اگر کسی کے پاس مالی گنجائش نہ ہو، غیر سودی قرض نہ مل پائے اور اس کے مطلوبہ تعلیم سے محروم رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ایسے طلبہ کو چاہیے کہ کسی معتبر مفتی کے سامنے اپنے حالات رکھ کر ان کے مشورہ پر عمل کریں۔(۲)

سودی قرض کے بعض مواقع ضرورت (اکابر کی نظر میں)

الف) ایک شخص عیالدار (بال بچوں والا) ہے، کوئی خدا کا بندہ بطورِ قرض اسے معمولی سے معمولی رقم دینے کو تیار نہیں خود اس کے پاس (نقد، زیورات، فاضل برتن وغیرہ) کسی صورت میں اتنا سرمایہ نہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا کوئی کاروبار کرسکے، وہ کوئی ہنر بھی نہیں جانتا کہ جس سے کام لے کر کچھ پیدا کرسکے، محنت مزدوری بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہے خواہ اس وجہ سے کہ بدن اس کی طاقت نہیں رکھتا، کمزور ہے یا کبھی محنت کا عادی نہ ہونے کی بنا پر محنت ومزدوری کی وجہ سے شدید ضرر لاحق ہونے کا اندیشہ ہے اور اس کے یہاں فقر وفاقہ کی نوبت پہنچنے والی ہے۔

---

(۱) سہ ماہی مجلہ بحث ونظر، ص:۲۱، جنوری-جون ۲۰۱۹ء

(۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۱۸۷

ب) ایک شخص ضرورت مند ہے کچھ زمین کا مالک ہے مگر زمین اتنی قلیل مقدار میں ہے کہ اپنی ضرورت پورا کرنے کے لیے وہ اگر اس کا کوئی چھوٹا موٹا حصہ بھی بیچ دے یا رہن رکھدے تو انتہائی زحمت میں پڑ جائے، عام ہے کہ ضرورت زمین ہی سے متعلق ہو مثلاً پانی کے لیے کنواں کھدانا ضروری ہو، یا جانور لینا ضروری ہو، یا گھریلو کسی امر سے متعلق ہو مثلاً گھر کے کسی ضروری حصہ کی مرمت کرانی ہو اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار اپنی درپیش ضرورت کے حل کرنے کی کوئی صورت نہ ہو۔ تو اس قسم کے لوگوں کے لیے اجازت ہے کہ وہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صرف اتنی مقدار جس سے ضرورت پوری ہوجائے مثلاً اتنی رقم جس سے چھوٹی سے چھوٹی تجارت کر کے یومیہ خرچ نکالا جاسکے یا مناسب بیل لیے جاسکیں یا کنویں کا کھدوانا اور گھر کا تعمیر کرانا ممکن ہو تو سودی قرض لے سکتے ہیں۔ لیکن (الف) ضرورت کو پورا کرنے والے کسی قسم کے سرمایہ کے ہوتے ہوئے خواہ وہ نقد ہو یا زیورات، یا ضرورت سے فاضل برتن، اور کپڑے یا دیگر سامان وغیرہ یا زمین اتنی مقدار میں ہو کہ جس کے کچھ حصہ کے بیچنے یا رہن رکھنے سے کوئی خاص زحمت نہ ہو۔ اسی طرح (ب) کوئی لمبا چوڑا کاروبار کرنے کے لیے، اسراف وعیش پرستی کی غرض سے دولت میں اضافہ کے لیے نیز اس بنا پر کہ چھوٹی موٹی تجارت یا روزمرہ کا خرچ نکالنے والے کسی کاروبار یا محنت ومزدوری کرنے میں کسر شان اور عار وشرم محسوس ہوتی ہے۔ ایسا قرض لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

خیال رہے کہ ایسی صورت حال اور اس کے لیے حاصل ہونے والی رخصت مخصوص ہی ہوتی ہے اس لیے بالعموم یا علی الاعلان اس قسم کے قرض کے جواز کا فتویٰ سخت فتنہ اور امت کی گمراہی کا باعث بن سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر نے اس سلسلہ میں ایسے موقع پر کچھ کہنے سے گریز کیا ہے کہ جہاں سے بات عام ہوجائے قیود کا خیال نہ رہے اور حکم کی شہرت ہوجائے اس لیے کہ عوام ایسے مواقع پر صرف لفظ جائز یاد رکھتے

ہیں اور مسئلہ کے باقی قیود وشرائط کو اڑا دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط کاری عام ہو جاتی ہے، چنانچہ دار الحرب میں سود کے لین دین کے جواز سے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس خدشہ کا اظہار دوسرے انداز پر فرمایا ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ بھی فرما چکے ہیں۔

نیز یہ کہ اس ضرورت وحاجت کا اعتبار اور رخصت کا استحقاق صرف انفرادی حالات کے لیے ہے اجتماعی حالات کے لیے اس قسم کی حاجت واستحقاق کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ اجتماعی ضرورتوں کے حل کی مختلف صورتیں موجود ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی صورت تو ملک میں کام آسکتی ہے۔(۱)

بقول مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ:

۱) ایسا شخص جو کہ اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا اور بغیر قرض کے گزارہ کی کوئی صورت نہیں اور قرض بغیر سود کے ملتا نہیں۔ یعنی یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس ضروریاتِ زندگی کی صورت میں یا سامان کی صورت میں کوئی اثاثہ نہیں ہے، اور نہ وہ کمانے پر قادر ہے۔

۲) یہ محتاج ایسا شخص ہے جس کے پاس ضروریات زندگی، مکان، کپڑے ضروری برتن کی صورت میں اثاثہ ہے مگر ضروریات پورا کرنے کے لیے نقد اثاثہ نہیں ہے، اور ضروریات کا جو سامان بیچ دے تو عزت کے ساتھ سر و بدن چھپانے کی صورت بھی جاتی رہے اور کمانے پر بھی قادر نہیں۔

۳) یہ محتاج ایسا شخص ہے کہ جس کے پاس مکان وغیرہ ضروریات کے ساتھ اتنی کم زمین ہے جس سے کسی طرح اس کی ضرورت کے بقدر غلہ یافت ہو سکتی ہے، مگر اس کے حصول کے لیے معاون چیزیں نہ ہونے کی وجہ سے اسے زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کھاد، بیج وسینچائی کے حق میں اور اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر مزدوری کے حق میں بھی زحمت ہوتی ہے کہ خود بدن سے محنت نہیں

(۱) مستفاد الربا: ۲۶۴

کرسکتا، اور مزدوری کے پیسے نہیں پاتا اور قسم کی صورت میں ایسے شخص کو غیر سودی قرض یا کوئی امدادی رقم کہیں سے حاصل نہیں ہوسکتی تو اس حد کے تحت آئے گا۔

اور خیال رہے کہ کمانے پر قادر نہ ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ صحت وقوی کمزور ہوں بلکہ صحت وقویٰ کے ہوتے ہوئے آدمی خاندانی طور پر محنت ومشقت کا عادی نہیں ہے تو وہ بھی قادر نہیں شمار ہوگا۔ اور جیسے قدر کفاف روزی کے لیے آدمی کو محتاج قرار دے کر جواز ہوسکتا ہے ایسے ہی اگر رہائش کے مسئلہ میں آدمی واقعی مجبور ہو کہ، کرایہ گراں پھر کرایہ داری مستقل زحمت، تو ضرورت کے لیے کافی مکان بنانے کی حد تک بھی اسے محتاج قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایسا شخص کہ جس کے پاس ایک معقول ذریعہ معاش ہے جو بقدر کفاف روزی دیتا ہے، وہ اسے اور اچھا کرنا چاہے، یا پھیلانا چاہے، تو وہ محتاج نہیں ہے جیسے کہ رہائش کے ایک مکان کے علاوہ اگر مزید ایک مکان ہے جس کے کرایہ کو استعمال کرتا ہے مگر نا کافی ہے تو وہ محتاج نہیں ہے اسے مکان بیچ کر ذریعۂ معاش اپنانا چاہیے، اسی طرح زائد از ضرورت کا سامان ہوتے ہوئے انسان محتاج نہیں کہلائے گا۔

حضرت مفتی محمود صاحب علیہ الرحمہ ایک فتوی میں لکھتے ہیں کہ جو شخص اس درجہ محتاج ہو کہ کما نہیں سکتا ہے اور بغیر قرض لیے گزارہ کی کوئی صورت نہیں اور قرض بغیر سود کے نہیں ملتا وہ اپنی مجبوری کی حد تک معذور رہے۔ (۱)

جو شخص اپنی ضرورت کی وجہ سے مجبور ہے، اپنی مجبوری اور مذکورہ لعنت (اللہ رسول کی لعنت اور اعلانِ جنگ، مال سے منھ کالا کرنا وغیرہ) دونوں کو وزن کرلے پھر اگر ضرورت کا وزن زیادہ ہو تو وہ اپنی مجبوری کی حد تک مجبور ہوگا۔ (۲)

حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ نے ایک فتویٰ میں فرمایا کہ مکان اگرچہ نقصان کے ساتھ

---

(۱) فتاوی محمودیہ: ۱۶/ ۲۷۷

(۱) فتاوی محمودیہ: ۱۶/ ۲۷۴

بیچنا پڑے مکان بیچ دے مگر سود نہ دے۔ جیسے کہ احتیاج کے تحت اس کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس وسیع کاروبار ہے، کاروبار پھیلانے کے لیے وافر سرمایہ موجود ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی ضروریات کے لیے اپنے سرمایہ کو سامنے لاتا ہے تو سرکاری قوانین کے سامنے اس کو جواب دہ ہونا پڑے گا بلکہ مجرم کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا اور بڑی زحمتیں اور نقصان اٹھانا پڑے گا اب وہ مجبور ہوکر اپنی جائز کمائی کو بچانے اور چھپانے کے لیے اگر اقدام کرے تو اس کو بھی حد ضرورت میں شمار کیا جاسکتا ہے جیسے کہ کاروبار وغیرہ کے انشورنس کے حق میں اہلِ افتاء کہتے ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ چونکہ یہ جواز مخصوص حالت وحاجت کی بنا پر ہے اس لیے صرف اسی حد تک ہوگا کہ جس سے یہ حاجت آدمی کی پوری ہوجائے یعنی معقول صورت میں کہ جو گزارہ کے لیے واقعی کافی ہو اور اس کی ضرورت کی حالت ختم ہوجائے جیسا کہ جواز کے فتاویٰ کے ساتھ اکابر نے تصریح کی ہے۔(۱)

اس حوالہ سے حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:
جب بغیر قرض لیے کام نہ چلتا ہو یا نا قابل عمل تکلیف کا سامنا ہو اور قرض غیر سودی نہ ملتا ہو تو بینک سے بقدر حاجت وضرورت لینے کی گنجائش ہوجاتی ہے: کما فی الاشباہ والنظائر ص ۱۱۴: مع الحموی ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح مثلاً اپنے جائز روپے سے بھی بڑا کاروبار کرنے میں قانون حکومت کی وجہ سے قانونی گرفت ہوکر اپنا جائز روپیہ کالا روپیہ شمار ہوکر قابل ضبطی وغیرہ ہورہا ہو تو قانونی رو سے اور اپنے حلال روپیہ کو بچانے کی بقدر مجبوری میں بقدر ضرورت حکومتِ وقت سے قرض لینے کی گنجائش ہوجاتی ہے البتہ استغفار برابر کرتے رہنا اور خدا سے دعا کرتے رہنا کہ اے اللہ یہ ہمارے اعمال بد کے نتائج ہیں"لقوله عليه السلام: كما تكونوا يولى عليكم أو كما قال "اور" لقوله عليه السلام: اعمالكم عمالكم" اس لیے

(۱) الربا: ۲۹۱-۲۹۲

ہمارے اعمال ایسے بنا دیجیے اور ہمیں ایسی توفیق دیجیے کہ ہم اس قسم کے حالات سے محفوظ رہیں۔(۱) اور مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں: کہ جب تین فاقہ ہوجائیں اور سوائے حرام کے کوئی حلال چیز میسر نہ ہوسکے تو حرام کا استعمال جائز ہوتا ہے۔(۱)

مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری علیہ الرحمہ نے اس سلسلے میں ہندستان کے دوسرے ارباب افتاء کے مقابلہ زیادہ محتاط نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، پھر بھی فرماتے ہیں:

"فقہاء نے اضطرار اور حد درجہ کی احتیاط اور شدید مجبوری کی صورت میں جب کہ قرض وغیرہ ملنے کی بھی امید نہ ہو، بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی اجازت دی ہے، ضرورت سے زیادہ لینا درست نہیں" (۳)

ماضی قریب میں ہندوستان کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"بعض حالت میں جب کہ انسان کی کوئی واقعی ضرورت (جسے شریعت بھی ضرورت تسلیم کرے) بغیر سود پر روپیہ حاصل کیے نہ پوری ہوسکتی ہو، تو ایسی صورت میں اپنے اس فعل کی شناعت اور برائی محسوس کرتے ہوئے اور دل سے توبہ واستغفار کرتے ہوئے سود پر رقم لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے" (۴)

ایک اور سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"البتہ بعض حالات ایسے پیش آتے ہیں جن میں انسان سودی قرض لینے پر مجبور ہوجاتا ہے اور سودی قرض لیے بغیر بنیادی خورد ونوش اور رہائش

---

(۱) منتخب نظام الفتاوی: ۱/۱۸۹

(۲) کفایت المفتی: ۸/۷۹

(۳) فتاوی رحیمیہ: ۹/۲۷۰

(۴) فتاوی قاضی، ص: ۲۲۶

کی تکمیل نہیں ہو پاتی اور نہ ہی اسے غیر سودی قرض ملتا ہے، جس سے وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کر سکے، ایسے ضرورت مندوں اور محتاجوں کے لیے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی''(۱)

ایک اور موقع پر بینک کے توسط سے لاری خریدنے کے تعلق سے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ بینک کے توسط کے بغیر لاری نہیں خرید سکتے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرا کاروبار بھی آپ کا نہیں ہے تو یہ ایک مجبوری ہے اور مجبوری کی حالت میں محتاج کے لیے فقہاء نے اس طرح کے قرض لینے کی اجازت دی ہے؛ اس لیے بینک کے توسط سے مذکورہ کاروبار کی گنجائش ہوگی''(۲)

بقول حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم:

- اس کے پاس اپنے علاج کے لیے پیسے نہ ہو۔
- خورد ونوش کے لیے پیسے نہ ہو۔
- بے روزگار ہو اور بنیادی روزگار کے لیے قرض کی ضرورت ہو۔
- ذاتی مکان نہ ہو، طویل مدت تک کرایہ ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو اور صرف بقدرِ ضرورت مکان حاصل کرنا چاہتا ہو۔
- اس کے پیشہ کے لحاظ سے گاڑی ضروری ہو اور ذاتی گاڑی نہ ہو۔
- کاروبار میں ایسے مرحلہ میں ہو کہ اگر قرض فراہم نہ ہو تو بہت بڑا سرمایہ ڈوب جائے گا۔
- شادی کے لیے پیسہ نہ ہو۔

---

(۱) فتاوی قاضی، ص: ۲۳۰

(۲) فتاوی قاضی، ص: ۲۳۱۔ مستفاد: مسلمانان کناڈا کے بعض مسائل، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب

یہ صورتیں بھی اس وقت مجبوری سمجھی جائیں گی، جب کہ:

- کوئی اسلامی بینک موجود نہ ہو۔
- موجود ہو؛لیکن اس سے قرض فراہم نہ ہو۔
- کوئی اور شخص غیر سودی قرض دینے کو تیار نہ ہو۔
- اس کے پاس اپنی بنیادی ضروریات کے علاوہ کوئی ایسی جائیداد نہ ہو جس کو فروخت کر کے ضرورت پوری کی جاسکے۔
- بقدرِ ضرورت قرض لیا جائے جیسے دو کمروں کے فلیٹ کی عمارت سے اس کا کام چل سکتا ہو تو اس سے وسیع عمارت سودی قرض کے ذریعہ حاصل کرنا درست نہیں۔
- اس شخص کے حالات کو جان کر کسی معتمد و مستند مفتی نے اس کے لیے اس طرح قرض لینے کو درست قرار دیا ہو۔(۱)

کیا ہم مجبور شخص ہو سکتے ہیں؟

گزشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اضطرار سے مراد شریعت کی اصطلاح میں وہ کیفیت ہے جس میں کسی شخص یا اشخاص کی جان، مال، خاندان، عقل، آبرو یا دین کو ایسا شدید خطرہ لاحق ہو جس میں یہ بات یقینی اور حتمی ہو کر اگر فوری مداوا نہ کیا گیا تو ان میں سے کوئی ایک چیز فوری طور پر تباہی اور بربادی کا شکار ہو جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج ہمارے سود خوروں میں کوئی ایسا ہے جو اضطرار کی اس کیفیت میں مبتلا ہو کہ اگر سود خوری سے بچنے لگا تو جان چلی جائے گی یا جائز کمائی برباد ہو جائے گی، یا اگر حکومت آج سودی اسکیمیں ختم کر دے تو لوگ مرنے لگ جائیں یا ان کی جائیدادوں کو فوراً آگ لگ جائے گی؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے، تو پھر ضرورت و حاجت کا نام دے کر فینانس پر گاڑی آٹو خریدنا ضرورت کا نام دے کر کسی عالم دین سے اپنی ضرورت کا تحقیق کرائے بغیر گھر کا لون لینا، ضرورت

---

(۱) جدید مالیاتی ادارے ص:۲۸

وحاجت کا نام دے کر تعلیمی لون لینا ضرورت وحاجت کا نام دے کر اپنی ساری خواہشات کو پوری کرنا کیسے روا ہوسکتا ہے؟

دراصل یہ حرام کو حلال بنانے کی تاویل کرنا، اور شریعت میں جرأت سے پیش آنا اور اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔ (أعاذ الله منه)۔

مسئلہ کا حقیقی حل اور صحیح راہ

گزشتہ تفصیلات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ربا سے متعلق نصوص اتنی سخت اور عام ہیں کہ نفس مسئلہ میں کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی نیز ضرورت کا دامن بھی اتنا تنگ ہے کہ اس کی بنیاد پر کوئی عام رخصت حاصل نہیں ہوسکتی تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امت کی معاشی پریشانیوں اور اقتصادی بدحالیوں کا کیا علاج ہو؟

پہلی بات تو اس مسئلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ مصیبت کا علاج مصیبت سے کیا جائے کوئی عقلمند نہ تو اسے گوارا کرسکتا ہے اور نہ اس کی اجازت دے سکتا ہے۔ زہر کا علاج زہر سے نہیں کیا جاتا، معاشی بدحالی اور اقتصادی پریشانی ایک مصیبت ہے اس کا علاج ایسا تجویز کیا جانا چاہیے جو واقعی راحت کا مصداق ہو، سودی قرض کے ذریعہ اگر اس کا علاج کیا جائے تو یہ صورتِ حال نہ صرف یہ کہ مصیبت بالائے مصیبت کا مصداق ہوگی بلکہ مصیبت کے ذریعہ مصیبت کے علاج کی ایسی صورت ہوگی جس میں مریض کے لیے مرض سے زیادہ دوا نقصان ہوتی ہے، اسلیے کہ معاشی تنگی انسان کے لیے مصیبت ضرور ہے مگر صرف دنیا کی، اور کسی حرام ومحظور کا ارتکاب اور ممنوع کا استعمال آخرت کی مصیبت تو ہے ہی دنیا کی مصیبت بھی ہے اس لیے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لیے آخرت کی مصیبت سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں ہوسکتی، اور کسی امر حرام کا ارتکاب واستعمال جب وہ کرے گا تو جب لوگ اس کی ممانعت وحرمت سے واقف ہوں گے ان کی نگاہوں میں اس دنیا میں بھی اس کی عزت کم ہوجائے گی، حاصل یہ ہے کہ دنیا وآخرت کی

رسوائی وعذاب کی مصیبت معاشی تنگی کی مصیبت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے اور ایسے موقعہ کے لیے سنت نبویہ یہ ہے کہ جب انسان دو مصیبتوں کے درمیان گھر جائے تو جو مصیبت اہون و اخف (یعنی معمولی وہلکی) ہو اسے اختیار کر لے۔ اور اس طرح کے مسائل میں قاعدہ بھی ہے ''اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمہا ضررا'' کہ اگر کوئی آدمی دو مصیبتوں میں پھنس جائے اور دونوں ایک ہی درجہ کی ہوں تو جسے چاہے اختیار کر لے لیکن اگر دونوں میں فرق ہو تو ان میں سے ہلکی کو اختیار کر لے، اس لیے کہ حرام کا ارتکاب واستعمال صرف ضرورت پر جائز ہے اور زیادتی کے حق میں ضرورت کا اعتبار نہیں ہے۔

یعنی جب ہلکی مصیبت کے اختیار کرنے سے کام چل سکتا ہو تو اس سے زیادہ ضرر والی شئی کا ترک لازم ہے۔

نیز ایک دوسرا قاعدہ ہے ''الضرر لا یزال بالضرر'' (ضرر کو ضرر کے ذریعہ دور نہیں کیا جائے گا) کہ ایک مصیبت کے علاج وازالہ کے لیے دوسری مصیبت کو ہرگز ذریعہ نہیں بنایا جائیگا۔ ایک اور ذیلی قاعدہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے بلکہ وہ اس صورتِ حال سے کچھ زیادہ ہی مناسبت رکھتا ہے ''درء المفاسد اولی من جلب المنفعة'' کہ مفاسد کا دفع کرنا بمقابلہ تحصیل منفعت کے اولیٰ ہے''

زیر بحث صورت میں سودی قرض لینا ایک گناہ ہے اور ضرر اخروی ہے یہ مفسدہ ہے اور سود لے کر اپنی معاشی تنگی کو دور کرنا اور اقتصادی حالت کو سنوارنا ایک مصلحت ہے، اس مصلحت کے مقابلہ میں سودی قرض جس مفسدہ کا باعث بنے گا اسے دور کرنا اولیٰ وبہتر ہے۔

اسی وجہ سے پریشانی ومشقت کو دفع کرنے کے لیے ترک واجب لازم ہے (یعنی مامورات کے سلسلہ میں شریعت نے زیادہ رخصت دے رکھی ہے) لیکن منہیات خصوصاً کبائر کے ارتکاب کے سلسلے میں کسی تسامح سے کام نہیں لیا ہے، اور سخت ضرورت کے موقع پر ہی کسی امر ممنوع کے ارتکاب کی رخصت دی ہے۔

ان تفصیلات کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پریشانی ومصیبت کا جو علاج تجویز کیا جائے، وہ ایسا ہونا چاہیے جو کہ دنیوی واخروی دونوں مصالح پر حاوی اور دونوں قسم کے مفاسد سے دور ہو اور یہ کوئی مشکل یا بعید از امکان چیز نہیں ہے۔(۱)

سودی قرض سے مکان (Home loan)

اگر کوئی شخص ایسا بے گھر ہو کہ اسے سر چھپانے کی جگہ بھی میسر نہ ہو، اور کوئی ایسا فرد یا جماعت بھی نہ ہو، جو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اسے قرضِ حسنہ دے، تو اس شخص کے لیے اپنے مکان کی ضرورت یعنی ایسا مکان جو خود انسان اور اس کی بیوی بچوں کو موسمی تکلیفوں سے بچا سکے، نیز ان تمام بشری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے درکار سہولتوں سے آراستہ ہو، پوری کرنے کے لیے بقدرِ ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے لیکن جس شخص کے پاس رہنے کی کوئی جگہ ہو، خواہ کرایہ کی ہو، یا کرایہ پر لینے کی استطاعت رکھتا ہو، اس کے لیے سودی قرض لینا درست نہیں ہے۔

بعض لوگ محض عیش وعشرت اور فراخی وخوشی کی زندگی گزارنے کے لیے بڑے مکان، یا اچھی اور عمدہ گاڑی کے لیے بینک فائنانس اداروں سے سودی قرض لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ضرورۃً سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، اس لیے ہم نے سودی قرض لیا ہے، ان کی یہ بات صحیح اور درست نہیں ہے، کیونکہ ضرورت وہ نہیں ہے جسے وہ ضرورت کہہ رہے ہیں، یا خیال کر رہے ہیں، بلکہ ضرورت وہ ہے جسے شریعتِ اسلامیہ نے ضرورت قرار دیا ہے، اور وہ یہ ہے: ”الضرورة بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب“ ضرورت نام ہے؛ انسان کا اس درجے پر پہنچ جانا کہ اگر اشیائے ممنوعہ کا استعمال نہ کرے تو ہلاک یا قریب الہلاک ہوجائے۔(۲)

❁ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) الربا: ۲۶۵-۲۶۷

(۲) اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۲۴۹/۹

(۱) جن لوگوں کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ بقدر ضرورت وسعت کا مکان خرید کر سکیں یا کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جن کو فروخت کر کے اتنی قیمت حاصل کی جا سکتی ہو، اس کے لیے سودی قرض لینا جائز نہیں۔

(۲) جن لوگوں کو افراد یا اداروں سے غیر سودی قرض مل سکتے ہوں، ان کے لیے بھی اس مقصد کے تحت سودی قرض لینا جائز نہیں۔

(۳) اگر اسلامی بینک مکان مرابحۃً اقساط پر فروخت کرتے ہوں یا شرکتِ متناقصہ کے اصول پر فروخت کرتے ہوں اور یہ سہولت خریدار کو حاصل ہو، اگرچہ عام بینکوں کے مقابلہ میں گاہک کو زیادہ پیسے دینے پڑیں، پھر بھی سودی قرض لینے کی اجازت نہیں؛ کیوں کہ حلال چیز کا زیادہ پیسوں میں حاصل ہونا بھی ارزاں قیمت میں حرام کے حاصل ہونے سے بہتر حال ہے۔

(۴) اگر ذاتی مکان میسر نہ ہو، اتنی رقم موجود نہ ہو کہ مکان خرید سکے، نہ کوئی اور ایسی شیٔ موجود ہو جس کو بیچ کر اتنی رقم حاصل کی جا سکتی ہو، تو اپنی رہائش کے لیے جتنی مکانیت کا مکان ضروری ہو، اتنے کو خرید کرنے کے لیے سودی قرض حاصل کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن ضروری ہے کہ دل سے اسے بُرا سمجھے، اپنے اس عمل پر استغفار کرے اور جلد سے جلد اس قرض کو ادا کر دینے کی کوشش کرے۔(۱)

افلاس و تنگدستی کی وجہ سے سود

سوال: مسلمانوں کے موجودہ افلاس و تنگدستی کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کیا سود کا لین دین خواہ آپس میں ہو یا دوسری قوموں سے شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ربا کی حرمت کی آیت جب نازل ہوئی، اس وقت مسلمانوں میں تنگدستی و افلاس اس وقت سے زیادہ تھا اور نیز بہت سا سود ان معاملات کا لینا باقی تھا جو زمانۂ جاہلیت اور حالتِ کفر میں ہو گئے تھے، اس پر بھی حکم ہوا کہ سود چھوڑ دو، ورنہ خدا

---

(۱) مسلمانانِ کناڈا کے بعض مسائل، ص: ۸۷-۸۸

اور رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔

جب حالتِ کفر کا سود وصول کرنا جائز نہیں رکھا گیا تو ابتداء (شروع ہی سے) ایسا معاملہ کرنا کیونکر جائز سمجھا جائے گا؟

بیہقی نے حدیث نقل کی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے کفار سے جن شرطوں پر صلح کی تھی ان میں یہ بھی قید تھی کہ ''مالم یأکلوا الربا'' (جب تک سود کا لین دین نہ کریں) جب کافروں کو اکلِ ربا (یعنی سود کے لین دین سے روکا گیا) تو مسلمانوں کو کیسے حلال ہوگا؟(۱)

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تنگدستی

اسلامی تاریخ بلکہ روایات حدیث نے ہم کو بتایا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی مسلمان بہت ضرورت مند تھے، تہذیب وتمدن اور دوسرے بہت سے امور میں دیگر ترقی یافتہ قوموں سے بہت پیچھے تھے بلکہ اس زمانہ کی تنگی مسرت سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی حتی کہ نہ جانے کتنے لوگ ''ضرورت وحاجت'' کے مراحل میں داخل ہونے کے باوجود محض حرام کے ارتکاب واستعمال سے بچنے کی غرض سے محنت ومشقت کا دامن نہیں چھوڑتے تھے اور دستِ سوال دراز کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

> ''جب تحریم ربا کی آیت نازل ہوئی تو افلاس اس وقت سے زیادہ تھا اور نیز بہت سا سود ان معاملات کے متعلق باقی تھا جو زمانہ جاہلیت اور حالتِ کفر میں ہوئے تھے پھر بھی ان کے چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔(۲)

یہی نہیں بلکہ ان حضرات کی یہ حالت صدقہ وخیرات میں حصہ لینے سے بھی مانع نہ تھی۔ اللہ کی راہ میں خرچ کی فضیلت وثواب کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ انتہائی محنت

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۱۶۰/۳، سود، جوا رشوت قرض کے شرعی احکام ص ۲۰

(۲) امداد الفتاویٰ: ۳/۱۱۴

ومشقت کرکے چند کھجوریں اجرت میں پاتے اور اس کا ایک حصہ اللہ کی راہ میں دے دیتے۔

حضرت مفتی محمود الحسن صاحب علیہ الرحمہ اسی سلسلہ کے اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

''مال میں کفار کی حرص کو قرآن نے منع فرمایا ہے مگر مسلمان اسی کو بار بار للچائی ہوئی نظریں اٹھا کر دیکھتا ہے، سودی کاروبار کے ذریعہ نہ مسلمان کا مال ترقی کرسکتا ہے نہ محفوظ رہ سکتا ہے مسلمان کی ترقی وکامیابی احکام شریعت کی پابندی میں ہے حرام اور لعنت کے کاموں سے پورے طور پر پرہیز کرنے میں ہے''۔

جب عام معاشرہ بگڑ چکا ہو غیر قومیں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں تو علماء کا یہ کام نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیے بھی جواز کی راہ نکال کر غیر قوموں کی اتباع کا فتویٰ دیں۔ بلکہ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ رضائے خداوندی اور ابدی انعامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے رکھیں اور بلا کسی تذبذب کے اصل حکم سنادیں اگر کوئی شخص مستامن وغیرہ مخصوص حالات میں گرفتار ہو جائے اور اس کے لیے کچھ گنجائش نکل آئے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو عام ضابطہ بنا کر امر ممنوع کو ختم کردیا جائے''۔

سوچنے کی بات ہے کہ جب سود کی حرمت نازل ہوئی عام طور پر معاشی حالت بہت کمزور تھی، ہفتوں؛ بلکہ مہینوں گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، مہر میں دینے کے لیے لوہے کی انگوٹھی تک میسر نہیں تھی، تن پوش کو کپڑا تک نہیں تھا، لنگی ہے تو کرتا نہیں، کرتا ہے تو لنگی نہیں، صرف ایک لنگی بدن پر رہتی تھی۔

یہود کے قرض میں دبے ہونے کی وجہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو غلام بنانے کی دھمکی دی گئی جس کی وجہ سے انہوں نے مدینہ طیبہ چھوڑ کر روپوش ہونے کا ارادہ کرلیا، گھر میں چراغ نہیں جلتا تھا، اس سب کے باوجود مسلمانوں نے سود پر کاروبار نہیں چلایا، نہ سود پر روزگار کو منحصر کرکے رکھا اور نہ سود کے ذریعہ بال بچوں کی پرورش کی سوچی، صحابۂ

کرام ﷺ کے احوال سے پتا چلتا ہے کہ مجبوری کی حالت میں بھی سودی کاروبار سے بچے رہتے تھے۔(۱)

اصل حل قناعت وایثار

حضرت مفتی صاحب کی اس تحریر میں اس مسئلہ کا اہم حل مذکور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن اور بندۂ خدا کے لیے یہی سب سے بڑا حل ہے اور یہ اس مصیبت کا روحانی علاج ہے جو مادی علاج کا بھی راستہ نکال دے گا، اور وہ یوں کہ غریب طبقہ صبر وقناعت اختیار کر کے اپنی ضرورتوں کو زیادہ سے زیادہ مختصر کر دے گا اور مالدار طبقہ ایثار وہمدردی کا سبق پڑھ کر فقراء ومساکین کی دستگیری میں لگ جائے گا۔

جو لوگ تجارتی مجبوریوں کی بناء پر یا اپنے مال کی حفاظت کے لیے بینکوں میں روپیہ جمع کرانے پر مجبور ہو جائیں، ان کے لیے لازم ہے کہ وہ صرف اپنے رأس المال ہی کو اپنا مال سمجھیں، ارشاد ربانی ہے: وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ (۲) ہاں! اگر تم سود سے توبہ کر لو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، اور اس رأس المال سے بھی ڈھائی فیصدی سالانہ کے حساب سے زکوۃ ادا کریں، کیوں کہ اس کے بغیر وہ جمع شدہ رقم ان کے لیے ایک نجاست ہوگی، اور بروز قیامت وبال جان۔

اس زمانہ میں انسان جائز ناجائز قرض کا بوجھ اور ذلت اٹھانا چاہتا ہے مگر سادگی یا اپنی آمدنی وحیثیت کے مطابق پر سکون زندگی نہیں بسر کرنا چاہتا ہے، جائز قرض ہی بڑا اذیت ناک ہے اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعاؤں میں اس سے پناہ چاہی ہے۔ ناجائز قرض، مہینہ کی قسط، سود کی تلوار ایک تاریخ کی دن رات سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ یہ حقیقت یاد رکھنا چاہیے کہ خرچ کرنا ہمارے اختیار میں ہے لیکن آمدنی بڑھانا ہمارے بس میں نہیں اخراجات کو قابو میں کرنا آسان ہے، ذرائع آمدنی بڑھانا رزاقِ عالم کے

---

(۱) ترمذی، کتاب الزہد

(۲) سورۃ البقرۃ:۲۷۹

فیصلہ سے ہوگا، ہر انسان واقعی پریشان ہے مقدر سے زیادہ وقت سے پہلے چاہنے کی وجہ سے۔

ترقیاتی یا سبسڈی والے قرض کا حکم

مفتی نظام الدین صاحب نے اپنے فتاویٰ میں بار بار اس کی صراحت کی کہ حکومت کی ترقیاتی وفلاحی اسکیموں کے متعلق قرضوں کی حیثیت عام قرضوں کے تحت لیے جانے والے قرضوں سے مختلف ہے، حکومت کا مقصود ایسے قرضوں سے بالخصوص زراندازی وتحصیل زر نہیں ہے۔ بلکہ ملک کے معاشرہ کی فلاح وصلاح ہی مقصود ہوتی ہے اوراس کے تحت انہوں نے اس کی وضاحت کی ہے کہ ایسے قرضے کہ جن میں گورنمنٹ اصل دی ہوئی رقم پر کچھ چھوٹ دیکر واپسی کا مطالبہ کرتی ہے اور ایک مقررہ وقت پر ادانہ کرنے کی صورت میں پھر اضافہ کرتی ہے حتی کہ اضافہ شدہ رقم کے ساتھ باقی ماندہ رقم اصل کے برابر اور بعد میں اس سے زائد بھی ہوجاتی ہے ایسے قرضے سودی قرضوں کے تحت اس وقت تک نہ آئیں گے جب تک کہ قرض لینے والے کو واپسی میں اصل رقم سے کچھ زائد دینے کی نوبت نہ آئے اس لیے کہ اس سے پہلے جو کچھ دے گا اس پر سود کی تعریف نہ آئے گی، اور سود کہنے سے رقم سود نہ بن جائے گی۔

دوسرے ایسے قرضے کہ جن میں حکومت بنیادی طور پر ضرورت مندوں کو نقد رقم فراہم کرنے کے بجائے ضرورت کے مطابق اسباب، مشینری وغیرہ فراہم کرتی ہے اوراس کے ساتھ کام چلانے کے لیے معمولی رقم بھی دیتی ہے وہ بھی عام سودی قرضوں کے تحت نہیں آئیں گے، اس لیے کہ واپسی میں جو زیادتی دی جائے گی اس میں بھی دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ہم نے گورنمنٹ سے پیسہ لیکر مشین نہیں خریدی بلکہ گورنمنٹ نے ہم کو خرید کر دی ہے اب اگر وہ اپنی دی ہوئی رقم پر ہم سے کچھ زائد لیتی ہے تو گویا وہ مشین کی قیمت ہی لیتی ہے جو کہ گورنمنٹ وکمپنی کے درمیان کم ہے اور ہمارے اور گورنمنٹ کے درمیان زیادہ۔

دوسرے یہ کہ زائد رقم جو دی جائے گی ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کو اپنا نظام چلانے اور عوام کی ایسی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے وسیع عملہ اور دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ زائد رقم انتظامی اخراجات کے لیے بطور اجرت وفیس کہی جاسکتی ہے۔ یعنی ایسے قرضوں میں زائد دی جانے والی رقم کے حق میں یہ توجیہ کی جاسکتی ہے، مفتی صاحب نے فرمایا بالخصوص ہندوستان جیسے ملک میں اگرچہ ان کا یہ قصد نہ ہو، مگر ضرورت کی بنا پر جیسے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے منی آرڈر کی فیس میں توجیہ فرمائی ہے جواز کی شق نکالنے کے لئے، ایسے ہی یہاں بھی ہوسکتی ہے اور یہ توجیہ اس قسم کے معاملات اور ضرورتوں کے عام ہونے کی وجہ سے اختیار کی گئی ہے۔

مفتی صاحب موصوف نے اس جہت سے بڑی تفصیلی اور واضح ومدلل گفتگو فرمائی اور قواعد کی بنیاد پر توجیہ کی ضرورت ومناسبت کو ثابت کیا ہے۔(۱)

حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب حیدری قدس سرہ نے بھی سب سیڈی والے قرض کی گنجائش دی ہے اس شرط کے ساتھ کہ سود کی رقم چھوٹ میں ملی ہوئی رقم یعنی سبسڈی سے زیادہ دینی نہ پڑے ورنہ وہ معاملہ سود کا ہوگا۔(۲)

یہی رائے مفتی سلمان منصور پوری قدس سرہ کی ہے اور یہی فتویٰ منتخب نظام الفتاویٰ میں ہے۔(۳)

❁ فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ (subsidy) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی اضافی رقم چھوٹ (subsidy) کے مساوی ہو یا اس سے کم ہوتو

---

(۱) الربا (سود) ص: ۲۹۲، ۲۹۳

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ص ۱۲۳ ج ۵ فتاویٰ رحیمیہ

(۳) کتاب النوازل: ۱۱/ ۳۱۱

یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔(۱)

گاڑی دلوانے کے عوض اصل رقم سے زائد کا مطالبہ کرنا سود ہے

آج کل ٹرانسپورٹ کے کاروبار میں یہ رواج ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو اپنے پیسوں سے گاڑی خرید کر دیتا ہے اور اس سے یہ اقرار نامہ تحریر کراتا ہے کہ سال یا دو سال کے بعد دو لاکھ کی جگہ تین لاکھ دے گا (یہ کاروبار بینک بھی کرتا ہے) تو کاروبار کی مذکورہ صورت سودی ہے اس لیے کہ گاڑی خریدنے والا مشتری کا وکیل ہے اور گاڑی کی رقم مشتری کے ذمے قرض ہے جبکہ قرض پر منافع لینا شرعاً ربو (سود) ہے البتہ یہ جائز ہے کہ پہلے گاڑی اپنے لیے خریدے اور پھر تین لاکھ روپے میں مشتری پر فروخت کردے۔(۲)

اس طرح خریداری میں حرمت سے بچنے کے لیے بہترین شکل یہی ہے کہ اگر نقد خریدنے میں مثلاً اسی ہزار کی ملتی ہے، اور قسطوار ادا کرنے میں ۸۵/ہزار دینا پڑتا ہے تو سودی معاملہ سے حفاظت اس طرح ہوسکتی ہے کہ قسطیں پانچ سال میں پوری ہوسکتی ہیں، تو بوقت خریداری یوں معاملہ طے کیا جائے کہ ادھار خرید میں ۸۵/ہزار روپیہ شئی کی قیمت ہے اور نقد میں ۸۰/ہزار ہے؛ اس لیے کہ نقد کے مقابلہ ادھار میں قیمت زیادہ کرنے میں شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے، تو اس طرح معاملہ جائز اور درست ہوجائے گا۔(۳)

مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ فرماتے ہیں: کہ ادھار پر بیچنے کی وجہ سے گاڑی کی اصل قیمت میں زیادتی کرنا بھی جائز ہے، یہ سود کے حکم میں نہ ہوگی، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ ایک ہی مجلس میں یہ فیصلہ کرلیں کہ خریدار نقد لے گا یا ادھار قسطوں پر تاکہ اسی حساب سے قیمت مقرر کی جائے۔(۴)

---

(۱) نیے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص:۱۷۰، نیز دیکھیے: کتاب الفتاوی:۱۰/۶۰، نعیمیہ

(۲) فتاویٰ حقانیہ:۶/۲۱۳

(۳) فتاویٰ قاسمیہ:۲۰/۳۷۶

(۴) آپ کے مسائل اور ان کا حل:۷/۱۷۴

مفتی جعفر ملی رحمانی صاحب فرماتے ہیں:

آج کل یہ اسکیم نکلی ہے کہ کوئی چیز مثلاً: گاڑی، کولر، فریج، شوکیس، وغیرہ نقد لینے کی صورت میں ۵ / ہزار اور قسط وار لینے کی صورت میں ۶ / ہزار روپئے میں ملتی ہے تو نقد اور ادھار کی قیمت میں یہ فرق شرعاً منع نہیں لیکن اگر وقتِ متعین پر قسط نہ ادا کرنے کی صورت میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے، یا وصول کردہ رقم سوخت ہوجاتی ہے، اور خریدی ہوئی چیز بھی ضبط کرلی جاتی ہے تو اس طرح کا معاملہ سود اور جوا کو شامل ہے اور یہ دونوں نص قطعی سے حرام وممنوع ہیں۔(۱)

بینک سے گاڑی خریدنے کی جائز شکلیں

۱) اگر بینک کمپنی سے ٹریکٹر خرید کر خود آگے بیچتا ہے تو قسط وار زیادہ رقم قیمتِ خرید سے وصول کرسکتا ہے اور ثمن کی یہ زیادتی ادھار کی وجہ سے ہے جو کہ شرعاً مرخص ہے: لما قال العلامة المرغيناني ﷫: الايدیٰ أنه يزاد في الثمن لأجل الاجل۔(۲)

۲) اگر بینک گاہک کا وکیل بن کر ٹریکٹر اپنے مؤکل کو خرید شدہ قیمت سے زیادہ پر دیتا ہے تو یہ ناجائز ہے، کیوں کہ وکیل اپنے مؤکل کی شرائط کے مطابق چلے گا۔

لما قال العلامة الكاساني ﷫: اذا قال له اشتر لي جارية بالف درهم فاشتری جارية باكثر من الالف يلزم الوكيل دون المؤكل لأنه خالف أمر المؤكل فيصر مشتريا لنفسه۔(۳)

۳) بینک نے مثلاً گاہک کی طرف سے کمپنی کو ایک لاکھ روپے دے دیے اور گاہک سے ڈیڑھ لاکھ وصول کرنا چاہتا ہے، ٹریکٹر گاہک نے کمپنی سے خرید لیا لیکن اب

---

(۱) اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۱ / ۱۱۳

(۲) هداية: ۳ / ۷۴

(۳) بدائع الصنائع: ۲ / ۲۹

بینک کی رقم اس کے ذمہ قرض ہے اور بینک زیادہ وصول کرنا چاہتا ہے، تو اس کا حیلہ یہ ہے کہ بینک اپنے ایک لاکھ کے عوض گاہک سے زمین وغیرہ خرید کر اپنے قبضہ میں لے لے پھر اس زمین کو گاہک کے ہاتھ ڈیڑھ لاکھ میں فروخت کردے اور قسط وار ڈیڑھ لاکھ وصول کرتا رہے۔

قال العلامة ابن نجیم ؒ: رجل له علی اخر عشرة دراهم فاراد أن یؤجلها الی السنة و تأخذ منه ثلاثة عشر فالحیلة أن یشتری منه بتلک العشرة متاعا و یقبض المتاع منه و قیمة المتاع عشرة ثم یبیع المتاع منه بثلالة عشر الی سنة۔(۱)

اصول: اگر کوئی شکل لون پر گاڑی لینے میں ایسی ہو کہ اس میں اصل عقد میں سودی شرط نہ لگی ہو، تو اس کی مطلقاً اجازت ہے؛ لیکن اگر اسمیں وقت پر قسطیں ادا نہ کرنے کی صورت میں سود دینے کی شرط ہو یا یہ شرط معروف ہوتو اس طریقہ پر گاڑی لینا سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ کل شرط لا یقتضیه العقد و فیه منفعة لأحد المتعاقدین الخ یفسده۔(۲)

اس حوالے سے مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ لکھتے ہیں کہ گاڑی بینک خرید کر منافع پر بیچنے کی دوصورتیں ہیں (ایک جائز اور ایک نا جائز) اول یہ ہے کہ بینک ۳۰ ہزار روپے میں گاڑی خرید کر اس کو ۳۵ / ہزار روپے میں فروخت کردے، یعنی کمپنی سے سودا بینک کرے اور گاڑی خریدنے کے بعد اس شخص کے ہاتھ فروخت کرے، یہ صورت تو جائز ہے۔

دوم یہ ہے کہ گاڑی گاہک نے خریدی اور اس گاڑی کا بل ادا کرنے کے لیے بینک سے قرض لیا، بینک نے ۳۰ / ہزار روپے پر ۵ / ہزار روپے سود لگا کر اس کو قرض

---

(۱) البحر الرائق: ۶/ ۱۲۶، فتاویٰ حقانیہ: ۶/ ۱۹۶

(۲) الهدایة: ۳/ ۴۳، کتاب النوازل: ۱۱/ ۳۱۲

دے دیا تو یہ صورت ناجائز ہے۔(۱)

کیا ورثا پر میت کے سودی قرض کو ادا کرنا لازم ہے؟

بینک اور بلاک سے لون اور سود پر روپیہ لینا حرام اور موجب وعید ہے، اور جب لے لیا اور مر گیا تو ورثاء پر سرکاری قرضہ ادا کرنا میت کے مال میں سے واجب ہے۔ اور اگر بلا سود قرض ادا کرنا ممکن نہ ہو، سرکار کی طرف سے جبر وزیادتی ہو، تو دفع ظلم کے لیے حالتِ اضطراری میں مع سود کے قرض ادا کر دیا جائے، تو خدائی وعید سے بچنے کی امید ہے۔(۲)

اضافہ کے ساتھ قرض کی ادائیگی

قرض کے معاملے میں ادھار جائز ہے، مشروط اضافہ جائز نہیں، یعنی: عقد کے وقت اگر قرض میں یہ بات مشروط ہو جائے کہ ادائیگی کے وقت اضافہ کر کے دے گا تو یہ مشروط اضافہ سود ہے اور حرام ہے؛ کیوں کہ قرض کا حکم ہی یہی ہے کہ جیسا دیا ہے ویسا ہی واپس کرے اور اگر اضافہ صلب عقد میں مشروط نہیں ہوا (یعنی قرضہ دیتے لیتے وقت زیادتی کی بات نہیں آئی تھی) بعد میں اپنی خوشی سے قرض دار کچھ اضافہ کر کے قرض واپس کرتا ہے تو یہ جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ہدیہ ہے، قرض کا معاوضہ نہیں:

"بل الحق أن الزيادة الذى (التى) لا تجوز فى البيع الربوى مطلقا لا تجوز فى الدين كذلك، والتى تجوز فى الدين بلا شرط كقبول الهدية وإجابة الدعوة قبل أدائه أو بعده لا مع الأداء...إلخ"(۳)

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۳۱

(۲) فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/ ۲۷۳

(۳) اعلاء السنن: ۱۴/ ۵۵۲، مروجہ سودی معاملات، ص:۶۱

ملازمت کے احکام

بینک کی ملازمت

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

دراصل بینک کی ملازمت ناجائز ہونے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک وجہ تو یہ ہے کہ ملازمت میں سود وغیرہ کے ناجائز معاملات میں اعانت ہے، دوسرے یہ کہ تنخواہ حرام مال سے ملنے کا احتمال ہے، ان میں سے پہلی وجہ یعنی حرام کاموں میں مدد کا جہاں تک تعلق ہے، شریعت میں مدد کے مختلف درجے ہیں، ہر درجہ حرام نہیں، بلکہ صرف وہ مدد ناجائز ہے جو براہ راست حرام کام میں ہو، مثلاً سودی معاملہ کرنا سود کا معاہدہ لکھنا، سود کی رقم وصول کرنا وغیرہ، لیکن اگر براہ راست سودی معاملہ میں انسان کو ملوث نہ ہونا پڑے، بلکہ اس کے کام کی نوعیت ایسی ہو جیسے ڈرائیور، چپراسی، یا جائز ریسرچ وغیرہ تو اس میں چونکہ براہ راست مدد نہیں ہے اس لیے اس کی گنجائش ہے۔

جہاں تک حرام مال سے تنخواہ ملنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں شریعت کا اصل یہ ہے کہ اگر ایک مال حرام اور حلال سے مخلوط ہو اور حرام مال زیادہ ہو تو اس سے تنخواہ یا ہدیہ لینا جائز نہیں، لیکن اگر حرام مال کم ہو تو جائز ہے، بینک کی صورت حال یہ ہے کہ اس کا مجموعی مال کئی چیزوں سے مرکب ہوتا ہے۔ (۱) اصل سرمایہ (۲) ڈاپازیٹرز کے پیسے (۳) سود اور حرام کاموں کی آمدنی (۴) جائز خدمات کی آمدنی، اس سارے مجموعے میں صرف نمبر ۳ حرام ہے، باقی کو حرام نہیں کہا جا سکتا، اور چوں کہ ہر بینک میں نمبر ۱ اور نمبر ۲

کی اکثریت ہوتی ہے، اس لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجموعے میں حرام غالب ہے، لہذا کسی جائز کام کی تنخواہ اس سے وصول کی جاسکتی ہے۔

یہ بنیاد ہے جس کی بناء پر علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں خود کوئی حرام کام کرنا نہ پڑتا ہو، جائز ہے، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔(۱)

حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ فرماتے ہیں: بینک میں ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو، جائز ہے، اس کی ہر ملازمت ناجائز نہیں ہے۔(۲)

ان تحقیقات سے پتا چلا کہ حقیقی اور واقعی نوعیت پتا کر کے جائز و ناجائز کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔

سودی حساب و کتاب کی ملازمت

ایسے سرکاری ملازم جو سرکاری قرضہ جات پر سود لگانے، اسے جاری کرنے کا حساب لکھتے ہیں، یا سود کی جو رقم حکومت کے یہاں جمع ہوتی ہے، اس کا حساب لکھنے کا کام کرتے ہیں، اسی طرح لاٹری ٹکٹ کے حسابات لکھنے کا کام کرتے ہیں، یہ کام بھی حرام ہے اور حرام کام کرنے کی اجرت اور تنخواہ بھی حرام ہے، جس طرح سود کھانا اور کھلانا حرام ہے اسی طرح سودی حساب و کتاب لکھنا بھی حرام ہے، جس طرح سے سود کے کھانے کھلانے پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے، ایسے ملازم کو چاہیے کہ دوسری جائز ملازمت تلاش کرے جب مل جائے تو اس ناجائز ملازمت کو چھوڑ دے اور توبہ و استغفار کرتا رہے، ایسے ہی بیمہ کمپنی میں ملازمت کرنا ناجائز ہے جس میں بیمہ کے کام پر ملازم ہوں، ایسے ہی بیمہ پالیسی ایجنٹ بن کر کام کرنا بھی ناجائز ہے چوں کہ بیمہ جو کہ سود اور جوے پر عمل ہے اس کا ایجنٹ بن کر اس کی تشہیر کرنا گویا سود اور جوے کو فروغ دینا ہے۔(۳)

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۳۹۵، ۳۹۶ (۲) منتخب نظام الفتاوی: ۱/ ۱۹۳

(۳) مسائل سود: ۱۰۲، ۲۴۴، ۲۴۵، بحوالہ سابق، نیز تفصیلات کے لیے دیکھئے: چند اہم عصری مسائل: ۲/ ۲۹۲، منتخب فتاوی، ص: ۱۳۸، حضرت فضیل الرحمن ہلال عثمانی

کیا حکومت کی ہر ملازمت نا جائز ہے؟

یہ خیال علی الاطلاق درست نہیں، حکومت کی ہر ملازمت نا جائز نہیں ہے، اور نہ ہر ملازمت کی تنخواہ حرام ہے جس ملازمت میں کوئی غیر شرعی کام نہ کرنا پڑتا ہو یا براہ راست حرام آمدنی سے تنخواہ نہ دی جاتی ہو وہ جائز ہے اور اس کی تنخواہ حلال ہے۔(۱)

سعودی عرب کے بینک میں ملازمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سودی کاروبار کرنے والوں یا اسمیں تعاون کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور کسی عمل کے درست ہونے کی دلیل یہ نہیں ہوسکتی کہ مسلمان ملک میں یہ کام ہو رہا ہے، اس لیے سعودی عرب کے (سودی) بینک کی ملازمت کرنا بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ مسلم ملک میں بینک (سودی بینک) کی ملازمت ہندوستان میں بینک کی ملازمت کے مقابلے میں زیادہ قبیح اور شناعت کی حامل ہے، کیونکہ ہندوستان کو بعض علماء دار الحرب قرار دیتے ہوئے بینک انٹرسٹ کو جائز قرار دیتے ہیں، اگر چہ جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ ہندوستان دار الحرب نہیں، اور یہاں سود کا لین دین جائز نہیں تاہم جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس میں اختلاف ہے، لیکن مسلم ممالک تو دار الاسلام ہیں اور دار الاسلام میں بینک انٹرسٹ کے حرام ہونے کی بابت کوئی اختلاف نہیں، اس لیے مسلم ممالک میں سودی بینکوں کی ملازمت کرنے کی حرمت متفق علیہ ہے اور بدقسمتی سے چند استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عالم اسلام اور عالم عرب میں بینکنگ کا نظام سود ہی پر قائم ہے۔(۲)

بینک کے اسلامی کاؤنٹر میں ملازمت

یورپ میں بعض ایسے بینک بھی ہیں، جن میں اسلامک کاؤنٹر بھی ہوتا ہے جس میں سود کے لین دین اور اس کی لکھائی پڑھائی میں ملوث ہونے کی نوبت نہیں آتی ہے تو ایسی

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۳۶۳

(۲) کتاب الفتاوی: ۱۰/ ۱۱۱

ملازمت جائز ہے کیونکہ بینک میں ملازمت کرنے کی ممانعت اس لیے ہے کہ اس میں سودی کاروبار میں تعاون ہے جس سے اللہ کے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے لیکن جب اسلامی کاؤنٹر میں سودی لین دین اور اس کی لکھائی پڑھائی نہیں ہوتی ہے تو یہ ملازمت جائز ہوگی بلکہ ایسے کاؤنٹر غیر سودی بینک کاری کی ترقی کا باعث بن سکتے ہیں۔(۱)

بینک کے چوکیدار کی ملازمت

بینک کے چوکیدار کی ملازمت کے حوالے سے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحب فتاویٰ حقانیہ) فرماتے ہیں کہ بینکوں کا موجودہ نظام گرچہ سودی نظام ہے جو شرعاً ممنوع ہے مگر چوکیداری کا تعلق چونکہ براہ راست بینک کے سودی معاملات سے نہیں ہے؛ اس لیے بینک کی چوکیداری میں کوئی حرج نہیں تاہم اگر ہو سکے تو اجتناب ہی کیا جائے۔

مسلم آجر من مجوسی لیوقد النار لا بأس به کذا فی الخلاصة (۲)

مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ روزی روٹی کے لیے بینک کی ملازمت میں چوکیداری، چپراسی اور کلرک وغیرہ کا عہدہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر وہ عہدہ قبول کرنا جائز نہیں ہے جس میں سودی حساب وکتاب لکھنا پڑتا ہو۔(۳)

ملازم بینک کی پنشن

بینک کی ایسی ملازمت جس میں سودی معاملات کو لکھنے، حساب وکتاب کرنے اور رقمی لین دین کی نوبت آتی ہو، سود میں تعاون کی وجہ سے جائز نہیں، البتہ تنخواہ اور پنشن میں فرق ہے، تنخواہ کام کی اجرت ہے اور پنشن اس کا تعاون ہے، اس لیے اگر نیشنلائزڈ بینک ہو جس میں پنشن گورنمنٹ دیتی ہو اور آپ ضرورت مند ہوں تو پنشن سے استفادہ

---

(۱) مستفاد از کتاب الفتاویٰ: ۱۰/ ۱۲۷

(۲) الفتاوی النهدية: ۴/ ۲۵۸

(۳) فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/ ۲۱۳، ۲۱۴

کرنے کی گنجائش ہے اور اگر اس کے بغیر بھی آپ کی ضروریات پوری ہوسکتی ہوں تو احتیاط کرنا بہتر ہے۔(۱)

مسلم فنڈ کی ملازمت

مسلم فنڈ میں جبکہ اس میں سودی حساب و کتاب نہ ہوتا ہو اور اسلامی اصول وضوابط کی پابندی ہوتی ہو تو اس میں ملازمت جائز ہے؛ البتہ سودی حساب و کتاب لکھنے کی ملازمت جائز نہیں ہے۔(۲)

ناجائز ملازمت کی تنخواہ بھی ناجائز؟

بینک اپنے ملازمین کو سود میں سے تنخواہ دیتا ہے، اس لیے یہ تنخواہ حلال نہیں، اس کی مثال ایسی سمجھ لیجیے کہ کسی زانیہ نے اپنے ملازم رکھے ہوئے ہوں اور وہ ان کو اپنے کسب میں سے تنخواہ دیتی ہو، تو ان ملازمین کے لیے وہ تنخواہ حلال نہیں ہوگی، بالکل یہی مثال ناجائز ملازمت کے ملازمین کی ہے۔(۳)

حرام کام کی اجرت بھی حرام ہوتی ہے:

ما حرم فعله حرم طلبه، فكما ان فعل السرقة و القتل و الظلم ممنوع فاجراء ذلك بواسطة اخرىٰ ممنوع أيضا (۴) أيضا لا يجوز الاستيجار على المعاصى كاستيجار الانسان للعب و اللهو المحرم و تعليم السحر و الشعر المحرم وانتساخ كتب البدع المحرمة و كاستيجار المغنية و النائحة للغناء والنوح لأنه استيجار على معصية و المعصية لا تستحق بالعقد (۵)

---

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۱۰/۱۱۰

(۲) فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/۳۴۵

(۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/۳۵۴

(۴) شرح المجلة لسليم رستم باز ص: ۳۴ المادة: ۳۵

(۵) الفقه الإسلامي و أدلته: ۴ ص: ۷۴۴، آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/۶۲

دیگر اکابر کے فتاویٰ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حرام کام کی اجرت بھی حرام ہے۔

چنانچہ فتاویٰ بینات میں لکھا ہے کہ یہ محقق و مسلم اصول ہے کہ جو پیشہ حرام ہو، اس کا معاوضہ بھی حرام ہوتا ہے، جیسا کہ آئندہ نصوص سے واضح ہوگا، چنانچہ اس مضمون کی احادیث کی شرح کرتے ہوئے امام نووی ﷬ نے اکابر علماء کرام کے حوالے سے مذکورہ اصول پر اہل اسلام کا اجماع نقل فرمایا ہے۔

قال الجوزی من اصحابنا و القاضی عیاض :أجمع المسلمون علی تعریف حلوان الکاهن لأنه عوض عن محرم، و لأنه اکل المال بالباطل، الخ (۱)

علامہ نووی ﷬ کی اس عبارت سے حرام فعل کے معاوضہ کی حرمت پر اجماع نقل ہوا، اس کے تناظر میں بینک کی ملازمت کو دیکھا جائے تو اس کی ملازمت کی حرمت پر بھی اجماع کا ہوگا۔(۲)

البتہ مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی (مفتی شاہی مرادآباد) فرماتے ہیں کہ اس نوکری پر جو تنخواہ ملتی ہے وہ اپنے عمل اور محنت کی اجرت ہے، اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے، نیز ماتحت لوگوں کے لیے اس کی کمائی سے اپنے اخراجات پورے کرنے میں بھی از روئے شرع کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح ان کی دعوت قبول کرنا، ہدیہ کا لین دین اور مشترکہ قربانی وغیرہ یہ سب امور جائز ہیں، البتہ چوں کہ ذریعہ آمدنی حرام ہے اس لیے ایسے لوگوں کے ساتھ مذکورہ معاملات میں احتیاط ہی بہتر ہے۔

الأجرة إنما تکون فی مقابلة العمل۔(۳)

عن محمد ﷬ : رجل استاجر رجل لیصور له صورا ، أو

---

(۱) شرح مسلم للنووی:۲/۱۹

(۲) فتاویٰ قاسمیہ:۲۰/۷۷،۷۸

(۳) شامی:۴/۳۰۴

تماثيل الرجال فى بيت، أو فسطاط فانى أكره ذلك، و أجعل له الأجرة (۱) وإن استاجره لينحت له طينورا ، أو بربطا ، ففعل طاب له الأجر إلا يأثم به (۲)

اس حوالے سے مفتی سلمان منصور پوری صاحب فرماتے ہیں کہ اس عمل پر تنخواہ کی شکل میں ملنے والا معاوضہ حرام نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ یہ معاوضہ اس کی محنت کا بدلہ ہے؛ البتہ یہ آمدنی کراہت سے خالی نہیں اس لیے کہ اس میں گناہ پر تعاون پایا جاتا ہے ۔۔۔۔الخ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (۳)

ناجائز ملازمت کو کیسے چھوڑیں؟

بینک کی وہ ملازمت جس میں سودی حساب وکتاب لکھا جاتا ہے یا اس میں تعاون ہوتا ہے یا انشورنس کمپنی کی ملازمت ناجائز ہے جس کو چھوڑنا ضروری اور واجب ہے لیکن اگر فوراً اس کو چھوڑ دیا جائے جبکہ بیوی بچوں اور ماں باپ کی خدمت کی ذمہ داری بھی اسی شخص پر ہے تو ایسا شخص فوری طور پر اپنی ملازمت کو نہ چھوڑے البتہ کسی جائز ذریعہ معاش کی تلاش میں رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہے کہ اس سود کی لعنت سے نجات عطا فرمائیں۔ جب کوئی جائز ذریعہ معاش میسر آجائے تو چھوڑیں، اس وقت تک اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے ہوئے استغفار کرتے رہیں، اور اگر کوئی صورت ہو سکے کہ آپ کسی غیر مسلم سے قرض لے کر گھر کے خرچ کے لیے دیدیا کریں اور تنخواہ کی رقم سے اس کا قرض ادا کردیا کریں تو یہ صورت اختیار کرنی چاہیے۔ (۴)

اس حوالہ سے دارالعلوم دیو بند کا فتوی یہ ہے:

"اگر سودی لین دین اور اس کا حساب وکتاب لکھنے کی ملازمت ہے تو

---

(۱) هندية: ۴/ ۴۸۶

(۲) هندية: ۴/ ۴۵۰، فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/ ۳۱۱، ۳۱۸

(۳) کتاب النوازل: ۱۲/ ۵۰۳، ۵۰۸

(۴) مستفاد از آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۶۱

اسے چاہیے کہ دوسرا جائز ذریعہ معاش تلاش کرنے کی سعی بلیغ کرے اور اللہ سے توبہ واستغفار بھی کرتا رہے، جیسے ہی دوسرا ذریعہ فراہم ہو جائے تو اسے ترک کر دے"۔(۱)

اس بات کا انتظار نہ کریں کہ موجود تنخواہ کے برابر معیاری ملازمت مل جائے بلکہ گزارہ کے بقدر کسی طرح مل گیا ہو تو اس حرام ملازمت سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے، ورنہ جتنے دن گزر جاتے جائیں توبہ کرنا دشوار ہوتا چلا جاتا ہے۔

حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس حوالہ سے فرماتے ہیں:

کسی کی ملازمت ناجائز ہو یا تنخواہ تھوڑی ہو اور رشوت لیتا ہو ان سے میں کہتا ہوں کہ ابھی ملازمت اک دم سے نہ چھوڑیں بلکہ جائز ملازمت اور حصولِ روزی کی فکر میں سچے دل سے لگ جائیں اور جب تک نہ ملے اس کو حرام سمجھیں اور یہ کہ مجبوری میں پاخانہ کھا رہا ہوں، دوسرے روز توبہ واستغفار کرے، یہ نہ سمجھیں کہ میں ناجائز ملازمت کی اجازت دے رہا ہوں، بلکہ اس کو ناجائز بتلا کر دوسری بڑی مصیبت سے بچا رہا ہوں کیونکہ تنگدستی اور افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ "كاد الفقر أن يكون كفرا" (الحدیث) قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ حرام ملازمت کی اجازت دیدی حالانکہ وہ حرام ملازمت کی اجازت نہیں بلکہ اس کے ایمان کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت تو گناہ میں مبتلا ہے پھر کہیں ایمان سے بھی ہاتھ نہ دھولے، نیز اس وقت تو وہ اپنا نقصان کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر پھر کہیں مخلوق کو پریشانی میں نہ ڈال دے، فقہی قاعدہ ہے کہ بڑے مفسدے سے بچنے کے لیے چھوٹے مفسدہ کو اختیار کر لینا چاہیے، اگر اس نے حلال روزی تلاش کیے بغیر حرام ملازمت کو بھی چھوڑ دیا تو پھر دوسروں کو نقصان پہونچائے گا۔

خلاصہ یہ کہ اگر کسی کا تعلق ناجائز نوکری یا ناجائز ذریعہ معاش سے ہو تب بھی اس

---

(۱) چند اہم عصری مسائل: ۲/ ۲۹۳

کو قائم رکھے اور اس سے نکلنے کی فکر میں رہے، اک دم سے نوکری چھوڑنے میں بعض اوقات پریشانی سے دور تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ برے خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں مثلاً اللہ سے شکایت ہوتی ہے کفر تک نوبت پہونچتی ہے۔

اسی لیے ہمارے حضرات بعض لوگوں کو ناجائز ملازمت چھوڑنے سے منع فرماتے تھے کہ جب تک حلال ملازمت ملے اس وقت تک اسی کو کیے جاؤ، اور استغفار و توبہ کرتے رہو، کیونکہ یہ ملازمت حرام ہے مگر ایمان کا وقایہ ہے۔

ایسا نہ ہو کہ افلاس (تنگدستی) پریشانی سے ایمان ہی جاتا رہے، ہم نے مسرف (فضول خرچی کرنے والوں) کو مرتد ہوئے خوب دیکھا ہے کسی نے بخیل کو مرتد ہوتے ہوئے دیکھا ہو تو بتلائے، بخیل کو کبھی مرتد ہوتے ہوئے نہیں سنا گیا، وجہ یہ ہے کہ بخیل کے ہاتھ سے جب مال نہیں نکلتا تو ایمان کیسے نکلے گا خیر یہ تو لطیفہ ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ایمان سے پھرتے ہیں وہ دنیوی تنگی سے پریشان ہو کر مرتد ہوتے ہیں، غیر اسلام کو حق سمجھ کر کوئی مرتد نہیں ہوتا اور بخیل آدمی کو تنگی سے تکلیف ہوتی ہے۔

الغرض بعض لوگوں سے حرام روزی نہ چھڑانیکی وجہ یہ ہے کہ محقق شیخ جب دیکھتا ہے کہ کسی شخص اور اس کے اہل وعیال میں توکل کی قوت نہیں، اور ملازمت وغیرہ کسی حرام ذریعۂ معاش کے چھڑانے میں اور طرح طرح کے خطرات ومفاسد ہیں مثلاً چوری کرنے لگے، قرض مارنے لگے، عیسائی ہو جائے، یا اور کوئی مذہب اختیار کرلے تو وہ ملازمت چھڑوانے کا مشورہ نہیں دیتا البتہ کچھ قید لگا دیتا ہے مثلاً اس نوکری کو حرام سمجھتے رہو دوسرے استغفار کرتے رہو، اور دوسری حلال نوکری ملنے پر بھی فوراً پہلی نوکری کو چھوڑنے کی رائے نہیں دیتا بلکہ رخصت لے کر دوسری نوکری کی حالت کا اندازہ کر لینے کا مشورہ دیتا ہے۔(۱)

حرام تنخواہ کے وبال سے بچنے کے لیے کیا کریں؟

جو لوگ سودی بینک میں کام کرتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی نوکری

---

(۱) احکام المال، ص: ۴۷۶،۴۷۷

نہیں ہے تو بینک کی تنخواہ سے ہونے والے گناہ کی شدت کم کرنے اور اس کے وبال سے بچنے کے لیے چار کام کریں:

۱- اپنے آپ کو گناہ گار اور قصوروار تسلیم کرتے ہوئے اللہ پاک سے معافی مانگتے رہیں۔

۲- اس بات کا یقین رکھیں کہ بینک (حرام کام یا حرام کی معاونت) کی ملازمت جائز نہیں ہے اور اس سے ملنے والی تنخواہ بہر حال ناجائز ہے۔

۳- حلال ذریعۂ معاش کی تلاش میں رہیں، اور اللہ پاک سے دعا بھی کرتے رہیں کہ اللہ پاک ہمیں ناجائز کام سے نجات دے اور جائز ذریعۂ معاش میسر فرما، ہمیں اور ہمارے بچوں کو حلال رزق کھلا۔

۴- ایک حیلہ یہ اختیار کریں جس کی علمائے کرام نے صورت لکھی ہے کہ بینک سے جو تنخواہ ملتی ہے اس سے نہ صدقہ خیرات کریں اور نہ حج وعمرہ کریں، نہ گھر میں خرچ کریں، اس موقع سے حیلہ یہ کریں کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے کر خرچ کرتے رہیں اور پھر اسی مال سے اس کا قرض چکتا کر دیا کریں، امید ہے اس سے گناہ کی شدت کم ہو جائے گی۔

لیکن یہ صرف گناہ کی شدت کم کرنے کا حیلہ ہے اس طریقے سے گناہ ختم نہیں ہوتا، ناجائز رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ باقی رہے گا، گناہ ختم کرنے کے دو ہی طریقے ہیں، اگر مال کا مالک معلوم ہو تو اس کا مال واپس کر دے، نہیں تو مالک کی نیت سے صدقہ کر دے، اس طرح کے گناہ چوں کہ حقوق العباد کی قبیل سے ہیں؛ اس لیے توبہ سے معاف نہیں ہوں گے، بہر حال یہ مال اس کے مالک کو واپس کرنا ہوگا، یا اس کی طرف سے صدقہ کرنا ہوگا اور اگر ابھی پوری رقم صدقہ کرنا ممکن نہ ہو تو بینک کی ملازمت ترک کرنے کے بعد تھوڑی تھوڑی رقم صدقہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ تنخواہ لی ہوئی پوری رقم ادا ہو جائے۔(۱)

---

(۱) مروجہ سودی معاملات، ص: ۱۱۰

سودی کاروبار کرنے والے غیر مسلم کے ساتھ پارٹنر شپ

غیر مسلموں کے ساتھ کاروبار اور پارٹنر شپ جائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کے بعد بھی ابوسفیان، صفوان بن امیہ اور سائب وغیرہ کے ساتھ کاروباری شرکت کی ہے، جب کہ ابھی وہ دامنِ اسلام میں نہیں آئے تھے، جو شخص بھی مسلمان نہ ہوا ہو وہ احکامِ شریعت کے ابھی مخاطب نہیں ہیں اس لیے ان کے مال کو کاروبار میں شریک کرنے کی گنجائش ہے۔(۱)

بینک کے زیور پرکھنے کی اجرت

بینک میں سونے کے زیورات جو گروی رکھے جاتے ہیں، انھیں کسوٹی پر پرکھنے اور اصلی ونقلی کی پہچان کرنے کے لیے زیورات کی دکان کے مالک و ماہر کو بلایا جاتا ہے، اور پھر اسے اصلی ونقلی کی پہچان کرنے پر کمیشن اور اجرت بینک کی طرف سے دیا جاتا ہے تو کیا اس کمیشن یا اجرت کا لینا جائز ہے؟

اس حوالہ سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ

> ''کسوٹی پر پرکھنے اور اصلی ونقلی کی پہچان کرنے کی اجرت لینا تو جائز ہے لیکن بینک کی پوری آمدنی بنیادی طور پر سودی آمدنی ہوتی ہے، اس لیے بینک سے اس طرح کی اجرت لینا جائز نہیں''۔(۲)

لیکن جیسا کہ قارئین اہل علم جانتے ہیں کہ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بینک کی ملازمت کے احکام میں لکھا ہے کہ بینک چار طرح کے اموال رکھتے ہیں: سرمایہ، ڈپازٹ، سود، جائز خدمات کی آمدنی، زائد حصہ تو حلال ہے اس لیے حضرت نے چپراسی، الکٹریشن وغیرہ کی آمدنی کو جائز قرار دیا، شاید اس کے تناظر میں یہ زیور پرکھنے کی اجرت بھی جائز ہوگی۔

---

(۱) کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۲۸۷، تجارت سے متعلق سوالات

(۲) کتاب الفتاویٰ: ۵/ ۳۹۰

سودی بینک کا متبادل

سودی بینک کا متبادل

گزشتہ صفحات میں بینک کے مروجہ نظام کی قدرے وضاحت کی کوشش کی گئی ہے، اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ بینک کے موجودہ نظام کی بنیاد سود ہے، اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر سود کو ختم کر دیا جائے، تو بینک کے نظام کو چلانے کا متبادل طریقہ کیا ہو، اس سلسلہ میں کچھ تجاویز رکھی جاتی ہیں:

سودی بینکاری کے متبادل نظام پر گفتگو سے پہلے چند باتیں ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے:

۱) سودی بینکاری کا متبادل تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بینک کے جو کام موجودہ تجارتی حالات میں ضروری یا مفید ہیں، ان کی انجام دہی کے لیے ایسا طریق کار اختیار کیا جائے جو شریعت اسلامیہ کے اصولوں کے دائرہ میں ہو اور جس سے شریعت کے معاشی مقاصد پورے ہوں، اور جو کام شرعی اصولوں کے مطابق ضروری یا مفید نہیں ہیں اور جنہیں شرعی اصولوں کے مطابق ڈھالا نہیں جا سکتا، ان سے اعراض کیا جائے۔

۲) چوں کہ سود کی قانوناً ممانعت کا اثر تقسیم دولت کے پورے نظام پر پڑتا ہے، اس لیے یہ توقع کرنا بھی غلط ہوگا کہ سود کے شرعی متبادل کو برسر کار لانے سے تمام متعلقہ فریقوں کے نفع کا تناسب وہی رہے گا جو اس وقت کے سودی نظام میں

پایا جاتا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلامی احکام کو ٹھیک ٹھیک روبکار لایا جائے تو اس تناسب میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آئیں گی جو اسلامی مثالی معیشت کے لیے مطلوب ہیں۔

۳) آج کل بینک جو خدمات انجام دیتا ہے، ان میں یہ پہلو مفید ہے کہ وہ لوگوں کو منتشر انفرادی بچتوں کو یکجا کر کے انہیں صنعت وتجارت میں استعمال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، یہ بچتیں اگر ہر شخص کی اپنی تجوری میں پڑی رہتیں، تو ان سے صنعت وتجارت کے فروغ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ان بچتوں کو صنعت وتجارت میں مصروف کرنے کے لیے جو راستہ مروجہ بینکوں نے اختیار کیا ہے، وہ قرض کا راستہ ہے، چنانچہ یہ ادارے سرمایہ داروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ دوسروں کے مالی وسائل کو اپنے منافع کے لیے اس طرح استعمال کریں کہ ان وسائل سے پیدا ہونے والی دولت کا زیادہ تر حصہ خود ان کے پاس رہے اور سرمایہ کے اصل مالکوں کو ابھرنے کا کماحقہ موقع نہ مل سکے۔

اسلامی احکام کی رو سے بینک کو ایک تجارتی ادارہ بننا پڑے گا جو بہت سے لوگوں کی بچتوں کو اکٹھا کر کے ان کو براہ راست کاروبار میں لگائے اور وہ سارے لوگ براہ راست اس کاروبار میں حصہ دار بنیں اور ان کا نفع ونقصان اس کاروبار کے نفع ونقصان سے وابستہ ہو جو ان کے سرمایہ سے انجام دیا جارہا ہے۔

۴) چوتھی بات یہ ہے کہ صدیوں سے جمے اور بیٹھے نظام کو بدل کر اس کی جگہ نیا نظام جاری کرنے میں ہمیشہ مشکلات پیش آتی ہیں، ان مشکلات کی بناء پر نئے نظام کو ناقابل عمل قرار دینا کسی طرح درست نہیں، ایسے میں ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاتا ہے اور اسے روبکار لایا جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۰۴، ۱۰۵

متبادل شکلیں

ماہرین شریعت اور ماہرین بنکاری نے مشترکہ غور وفکر سے اس کی متعدد متبادل شکلیں تجویز کی ہیں، جو ایک طرف شریعت کے احکام سے متعارض بھی نہیں ہیں اور دوسری طرف جدید بنکاری اور سرمایہ کاری کے مقاصد کو بھی کما حقہ پوری کرتی ہیں، ذیل میں ان متبادل شکلوں کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱) مشارکہ
۲) مضاربہ
۳) کرایہ
۴) اجارہ(Leasing)
۵) مرابحہ مؤجلہ
٦) سروس چارج
۷) قرض حسنہ
۸) بیع مؤجل
۹) بیع بالوفاء(Buy-back Agreement)
۱۰) ملکیتی کرایہ داری(Hire Purchase)
۱۱) وصولیاتی ترقیاتی اخراجات(Developement,Charges)
۱۲) ایکویٹی پارٹیسپیشن(Equity Porticipation)
۱۳) رینٹ شیئرنگ(Rent Sharin)
۱۴) خریداری حصص
۱۵) ٹریڈبلوں کی خریداری

ان شکلوں کے علاوہ درج ذیل شکلیں بھی ممکن ہیں جن سے سرمایہ کاری اور بنکاری کے متعدد مقاصد پورے کیے جاسکتے ہیں:

۱۶) بیع سلم

۱۷) مزارعہ

۱۸) مساقاۃ

۱۹) بالاقساط فروخت

۲۰) عقد استصناع

۲۱) ادارہ اوقاف کا استعمال صرفی قرضوں کی مد میں۔(۱)

ذیل میں ان شکلوں میں سے چند ضروری شکلوں کی وضاحت کی جارہی ہے۔

شرکت ومضاربت: سود کا صحیح اسلامی متبادل ''شرکت اور''مضاربت'' کا طریقہ ہے جو سود سے بدرجہا اچھے نتائج کا حامل ہے، یہ تمویل کا نہایت مثالی، عادلانہ اور منصفانہ طریقہ ہے جس کی تقسیم دولت پر بہت اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں، شرکت اور مضاربت کا نظام جاری ہونے کی صورت میں بینک کا باقاعدہ کاروبار میں عمل دخل ہوگا، اس کی حیثیت اب صرف روپے کے لین دین کے ادارے کی نہیں رہے گی۔

اصل اسلامی طریقہ تو''مشارکت'' یا مضاربت'' ہی ہے مگر بعض حالات میں مضاربہ ممکن نہیں ہوتا، مثلاً کسی کسان کو ٹریکٹر خریدنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہو، تو اس میں مضاربت ممکن نہیں، ایسی صورت میں چند اور بھی تمویل کے طریقے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

کرایہ واجارہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہے جس کو انگریزی میں (Leasing) کہا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی بینک سے قرض لے کر خود ٹریکٹر خریدنے کے بجائے کسی بینک یا مالیاتی ادارے کو یہ کہے کہ یہ ٹریکٹر خرید کر ہمیں کرایہ پر دے دو، اس دوران ٹریکٹر کا مالک بینک یا مالیاتی ادارہ ہوگا، اور وہ آدمی کرایہ دار کی حیثیت سے

(۱) حرمت ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام:۵۹/۶۰

اسے استعمال کرے گا، کرایہ اس تناسب سے طے کیا جائے کہ اس میں ٹریکٹر کی قیمت بھی وصول ہوجائے اور اتنی مدت کے لیے اگر رقم بینک سے شراکت کی جاتی، تو اس پر جتنا نفع ملنا تھا وہ بھی وصول ہوجائے، جب یہ مدت گزر جائے اور کرایہ کی شکل میں ٹریکٹر کی قیمت بمعہ کچھ نفع کے وصول ہوجائے تو اب یہ ٹریکٹر اس آدمی کی مملوک بن جاتا ہے۔

مرابحہ مؤجلہ

اس کی صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص بینک سے قرضہ لینے کے لیے آئے تو بینک اس سے پوچھے کہ کس چیز کو حاصل کرنے کے لیے رقم درکار ہے؟ بینک اس کو رقم دینے کے بجائے وہ چیز خرید کر ''مرابحہ'' کے طور پر نفع پر ادھار بیچ دے، نفع کی ایک شرح طے کر کے ''مرابحہ'' اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ نظام میں یکسانیت رہے اور تمام لوگوں سے نفع ایک شرح کے ساتھ وصول ہو، نفع کی جو شرح طے کی جاتی ہے اسے انگریزی میں مارک اپ (Mark Up) کہتے ہیں۔

یہ بھی تمویل کا ایک جائز طریقہ ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ضروری شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے، اس لیے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا باتفاق فقہاء جائز ہے، اور اسلامی بینکوں میں اس طریقے پر بڑی وسعت کے ساتھ عمل ہورہا ہے لیکن یہ انتہائی نازک طریقہ ہے اس میں ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔

بینک کا شرعی طریق کار

بینک کا تعلق دوطرفہ ہوتا ہے، ایک طرف اس کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنی رقمیں بینک میں رکھوائی ہیں، دوسری طرف ان کے ساتھ متعلق ہوتا ہے جن کو بینک سرمایہ فراہم کرتا ہے، ان دونوں قسم کے تعلقات پر الگ الگ گفتگو کی جاتی ہے۔

بینک اور ڈیپازیٹر (Depositors) کا تعلق

موجودہ نظام میں بینک میں جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں آج کل بینک کی اصطلاح میں ان کو ''امانت'' کہا جاتا ہے، لیکن فقہی اعتبار سے وہ حقیقت میں قرض ہوتا ہے، اگر بینک کو اسلامی طریقہ کے مطابق چلایا جائے، تو امانت داروں کے ساتھ بینک شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے گا، اس طریقہ میں وہ رقم قرض نہیں ہوگی، بلکہ اب صورت حال یہ ہوگی کہ رقم رکھوانے والے رب المال ہوں گے اور بینک مضارب ہوگا اور لگایا گیا سرمایہ رأس المال ہوگا جس پر بینک کسی خاص شرح سے نفع دینے کا پابند نہیں ہوگا، بلکہ جو کچھ نفع حاصل ہوگا وہ ایک طے شدہ تناسب (percentage) کے مطابق تقسیم ہوگا۔

پھر کرنٹ اکاؤنٹ (Current Account) میں بینک آج بھی امانت داروں کو کوئی سود نہیں دیتا، اسلامی طریق کار میں اس مد پر کوئی منافع نہیں دیا جائے گا اور کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم امانت دار کی طرف سے بینک کو دیا ہوا غیر سودی قرض سمجھا جائے گا، البتہ دوسرے نفع بخش کھاتے ''مضاربت'' یا ''شرکت'' کے کھاتوں میں تبدیل ہوجائیں گے۔

بینکوں کی شرکت ومضاربت میں نفع کی تقسیم کا طریق کار اس طرح ہو کہ شرکاء کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ جب چاہیں مخصوص قواعد کے مطابق بینک سے رقمیں نکالتے یا اس میں داخل کرتے رہیں، لیکن جب ایک مدت شرکت ختم ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس مدت میں کتنی رقم کتنے دن بینک میں رہی اور فی روپیہ فی یوم منافع کا اوسط کیا رہا، پھر جس شخص کے جتنے روپے اس مدت کے دوران جتنے دن بینک میں رہے اس کے حساب سے نفع تقسیم کردیا جائے۔ (۱)

ہندوستان کے مختلف مسلم مالیاتی ادارے

یہاں ہندوستان کے ان غیر سودی اداروں اور سوسائٹیوں کا مختصراً ذکر مناسب

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۰۵، ۱۰۶

معلوم ہوتا ہے:

۱) الفلاح میچول بنفیٹس لمیٹیڈ لکھنؤ

۲) عشرہ لیزنگ اتوسٹمنٹ اینڈ فائنس کمپنی، بنگلور

۳) تجارت انوسٹمنٹ اینڈ فائنس کمپنی، بنگلور۔

۴) اسلامی بیت المال کولار

۵) اسلامک ویلفیر سوسائٹی سندھنور، رائچور۔

۶) معمار انوسٹمنٹ اینڈ بلڈنگ ڈولوپمنٹ کمپنی، بنگلور

۷) الامین بنگلور، کرناٹک

۸) بلاسودی اسلامک جامعہ مارکیٹ مرچنٹ ویلفیر، بنگلور

۹) اسلامی بیت المال، وانمباڑی

۱۰) البیت النافع، وانم باڑی

۱۱) طور بیت المال، حیدرآباد، آندھرا پردیش

۱۲) مسلم رفاہی سوسائٹی

۱۳) قرض بچت فنڈ اسکیم لکھنو

۱۴) ایب وم بلاسودی فنڈ، اعظم گڑھ

۱۵) مسلم فنڈ، دیوبند، یوپی

۱۶) ملی امدادی سوسائٹی، بہرائچ۔(۱)

مروجہ بینک اور اسلامی بینک میں فرق

اگرچہ بعض خدمات وہ ہیں، جو اسلامی بینک بھی فراہم کرتے ہیں اور مروجہ بینک بھی؛ لیکن دونوں کے طریقۂ کار میں نمایاں فرق ہے، جن میں سے چند اہم اور قابل ذکر نکات یہ ہیں:

---

(۱) مجلہ فقہ اسلامی سمینار نمبر: ۳، ص: ۵۴۷ بحوالہ اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ص: ۲۹۷

الف) مروجہ بینک کی بنیاد سود پر ہے، وہ قرض لینے والوں سے سود حاصل کرتا ہے اور رقم جمع کرانے والوں کو سود ادا کرتا ہے، جب کہ اسلامی بینک نفع ونقصان میں شرکت کی اساس پر کام کرتے ہیں اور سود سے بچتے ہیں۔

ب) اسلامی بینک بھی مروجہ بینک کی طرح تمویل یعنی فائنانسنگ کی سہولت بہم پہنچاتا ہے؛ لیکن عقود کی بنیاد قرض نہیں ہوتی؛ بلکہ کبھی تجارت، جیسے: مرابحہ کنٹراکٹ، کبھی شرکت، جیسے: مشارکہ متناقصہ اور کبھی اجارہ، جیسے: اجارہ منتہیہ بالتملیک وغیرہ جیسے معاملات پر ہوتی ہے؛ جب کہ مروجہ بینک کے اکثر عقود کی بنیاد قرض پر ہوتی ہے اور معاملات میں سود کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔

ج) اسلامی بینک ٹھوس منقولہ (Liquid assets) اور غیر منقولہ اثاثہ (Fixed assets) حاصل کرتے ہیں اور ان کو نفع حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں ، جب کہ مروجہ بینک کے یہاں ٹھوس سامان خریدنے کی ممانعت ہے، وہ روپیہ سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔

د) مروجہ بینک کھاتہ داروں کی رقم اضافہ کے ساتھ واپس کرنے کا ضامن ہوتا ہے، کھاتہ دار نقصان کا خطرہ قبول نہیں کرتے، جب کہ اسلامی بینک ایسی ضمانت نہیں لیتا اور کھاتہ دار نقصان کا خطرہ قبول کرتے ہیں۔

ہ) مروجہ بینک ہر طرح کے کام کے لیے قرض فراہم کرتے ہیں، خواہ وہ پیام انسانیت کے لیے نقصاندہ اور اخلاق کے لیے تباہ کن ہو، جب کہ اسلامک بینک خلافِ انسانیت اور خلاف شرع کاموں میں سرمایہ کاری نہیں کرتے؛ اسی لیے شراب کی صنعت اور ہتھیار کی صنعت وغیرہ میں اسلامک بینک سرمایہ کاری نہیں کرسکتا۔(۱)

سودی اور اسلامی بینک کے اجارہ میں فرق

اجارہ کا معاملہ سودی اور اسلامی دونوں بینکوں میں ہوتا ہے، اس لیے یہاں

---

(۱) جدید مالیاتی ادارے:۲۹

دونوں کے درمیان پائے جانے والے فرق بیان کیے جاتے ہیں:

اس وقت کنونیشنل بینکوں میں اجارہ کا جو طریقہ کار رائج ہے اس میں درجِ ذیل تین خرابیاں پائی جاتی ہیں:

الف) ایک ہی عقد کے اندر بیع اور اجارہ کے دو معاملے ہوتے ہیں، یعنی جو اقساط کلائنٹ مدت اجارہ کے دوران ادا کرتا ہے انھیں ابتداء میں تو اجارہ کی اقساط شمار کیا جاتا ہے، لیکن جونہی کرایہ داری کی مدت پوری ہوتی ہے تو یہ اقساط قیمت سمجھی جاتی ہیں اور مطلوبہ چیز خود بخود کلائنٹ کی ملکیت میں آجاتی ہے، اسے فقہی اصطلاح میں ''صفقتان فی صفقة'' کہتے ہیں جو کہ شرعاً جائز نہیں۔

ب) اجارہ پر دی گئی چیز سے متعلق تمام ذمہ داریاں مستاجر کے ذمہ ہوتی ہیں، حالانکہ شرعاً صرف استعمال سے متعلق ذمہ داریاں مستاجر پر ڈالی جاسکتی ہیں، جیسے گاڑی کی سروس کرانا، آئل تبدیل کرانا وغیرہ جب کہ وہ ذمہ داریاں جن کا تعلق اس چیز کے مالک ہونے سے ہے، وہ موجر کے ذمہ ہوتی ہیں، جیسے ٹیکس ادا کرنا کسی ناگہانی آفت کی وجہ سے وہ تباہ ہوجائے تو اس کی مرمت کرانا وغیرہ۔

ج) اجارہ پر دی گئی چیز کلائنٹ کے حوالے کرنے سے پہلے ہی اس کا کرایہ لگنا شروع ہوجاتا ہے حالانکہ شرعاً مستاجر سے اس وقت تک کرایہ لینا جائز نہیں جب تک مطلوبہ چیز اس کے حوالہ نہ کردی جائے۔

اس کے برعکس اسلامی بینکوں کے اجارہ میں مذکورہ بالا شرعی خرابیوں کو درجِ ذیل طریقہ پر دور کیا جاتا ہے:

الف) ابتداء میں صرف اجارہ کا معاملہ ہوتا ہے، اور اجارہ پر دی گئی چیز بینک ہی کی ملکیت میں رہتی ہے پھر اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد کلائنٹ کو اختیار ہے کہ اسے متعین قیمت پر خرید لے یا بینک کو واپس کردے، اول الذکر شکل میں بینک مستقل عقد کے ذریعے وہ چیز کلائنٹ کو فروخت کرتا ہے اور بعض مرتبہ ایک

مستقل عقد کے ذریعہ بینک وہ چیز کلائنٹ کو ہبہ کر دیتا ہے۔اس سے ''صفقتان فی صفقة'' والی خرابی لازم نہیں آتی۔

ب) اسلامی بینکوں کے اجارہ کے معاملات میں یہ بات صراحتاً مذکور ہوتی ہے کہ مستاجر صرف وہ ذمہ داریاں برداشت کرے گا جو گاڑی کے استعمال سے متعلق ہیں اسے ''صیانہ عادیہ'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ گاڑی کے مالک ہونے کی حیثیت سے عام ذمہ داریاں بینک برداشت کرتا ہے، چنانچہ اس کے ٹیکس، انشورنس، تکافل اور حادثہ کی صورت میں اگر گاڑی کو کوئی نقصان پہنچے تو اس کا ازالہ بینک کے ذمہ ہوتا ہے۔

ج) اسلامی بینک جب تک کرایہ داری کا معاملہ کر کے مطلوبہ چیز کلائنٹ کے حوالے نہیں کر دیتا، اس وقت تک کرایہ وصول نہیں کرتا۔(۱)

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/۲۷۷

انشورنس اور اس کے متعلقات

انشورنس کی تعریف وحقیقت

انشورنس کو بیمہ بھی کہتے ہیں اور بیمہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات در پیش ہوتے ہیں کوئی انسان یا ادارہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کر دوں گا۔(۱)

اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے وہ بیمہ کرانے والے سے بالاقساط رقمیں وصول کرتا ہے، بعض صورتوں میں بیمہ کرانے والے کو اپنی رقم سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور بعض صورتوں میں وہ رقم مع سود واپس مل جاتی ہے۔(۲)

مثلاً ایک شخص عبدالرحیم نے (زندگی/مال کا) بیمہ بیس ہزار روپے کا کرایا بیمہ کمپنی کی طرف سے پچاس روپے ماہوار کا پریمیم مقرر رہوا، ابھی عبدالرحیم بطور پریمیم صرف دو ہزار روپے ہی جمع کر پایا تھا کہ وہ واقعہ پیش آ گیا جس کی تلافی کے لیے بیمہ کرایا گیا تھا (یعنی موت/مال کا نقصان/یا فقدان) لہذا کمپنی نے معاہدہ کی رو سے عبدالرحیم کو یا اس کے نائب ورثاء کو (موت کے بیمہ کی صورت میں) بیس ہزار روپے دیے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ اٹھارہ ہزار روپیے کا اضافہ کس چیز کے عوض میں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو عبدالرحیم نے کمپنی کو اٹھارہ ہزار روپے کے عوض دی ہو،

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۱۵

(۲) چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۳۰

تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ یہ ''اضافہ بلاعوض'' ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اضافہ کی رقم اسی معاملہ (عقد) کے نتیجہ میں ملی ہے جیسے انشورنس (یا عقد تامین) کہتے ہیں اور اسی عقد کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ کمپنی کی طرف سے اس رقم کے ملنے سے پہلے کچھ رقم عبدالرحیم پریمیم کے طور پر کمپنی کو دے چکا ہو، اگر پہلے کچھ بھی نہیں دیا تھا تو عبدالرحیم کو کمپنی کی طرف سے یہ مزید اٹھارہ ہزار روپے نہیں مل سکتے تھے۔ (۱)

کچھ اہم اصطلاحات

۱) بیمہ دار یا پالیسی ہولڈر (policy holder) وہ شخص ہوتا ہے جو بیمہ خریدتا ہے اور اس بیمہ پالیسی کا مالک (owner) ہوتا ہے۔

۲) بیمہ شدہ (insured) وہ شخص یا چیز جس کا بیمہ کیا جائے وہ انشورڈ (insured) کہلاتی ہے، زندگی کے بیمہ کی صورت میں یہ کوئی شخص ہوتا ہے اور عام یعنی جنرل انشورنس میں یہ کوئی اثاثہ (assetslpropety) ہوتا ہے۔

۳) قسط (premium) وہ رقم جو بیمہ دار کمپنی کو بیمہ کے عوض ادا کرتا ہے، اس کو بیمہ کی قسط یا پریمیم (premium) کہتے ہیں۔

بیمہ کی رقم (sumassured sum insured)

وہ متعین رقم جو بیمہ دار کو نقصان کی صورت میں ملتی ہے، وہ رقم ''سم انشورڈ'' یا ''سم اشورڈ'' (sumassured sum insured) کہلاتی ہے یہ رقم عام انشورنس میں اس چیز کی مالیت سے کم تو ہوسکتی ہے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ (۲)

انشورنس کی تاریخ

بیمہ کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں بحری

(۱) بینک انشورنس اور سرکاری قرضے: ۷۶

(۲) تکافل شرعی حیثیت ۶۶، ۶۷

بیمہ (marine insurance) سے ہوا، دوسرے ممالک کی تجارت میں مال بحری جہاز سے روانہ کیا جاتا تھا، کبھی بحری جہاز ڈوب جاتے تھے، اور کبھی بحری قذاقوں کے ہاتھوں لوٹ لیے جاتے تھے اور اس طرح تاجروں کا مال سمندر میں ضائع ہو جاتا تھا، لہٰذا بحری جہاز کے نقصان کی تلافی (indemnity) کے لیے ابتداءً بیمہ کا آغاز ہوا۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی فقہ میں مروجہ بیمہ سے تعارف بیسویں صدی عیسوی میں ہوا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ تحقیق و جستجو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ بیمہ سے متعلق سب سے پہلے فتویٰ ملک شام کے مشہور و معروف محقق عالمِ دین علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمۃ نے اپنی معروف حاشیہ "رد المحتار" (جو فتاویٰ شامیہ کے نام سے مشہور ہے اور مستند فتاویٰ میں سے ہے) میں دیا ہے۔

علامہ شامی علیہ الرحمۃ کے زمانہ میں یہ رواج ہو گیا تھا کہ بعض لوگ تاجروں کا سامان سمندر کے راستے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تو اس سامان کا کرایہ لینے کے علاوہ کچھ مزید متعین رقم بھی لیتے تھے اور وہ اس زائد رقم کے عوض اس بات کی ضمانت دیتے کہ اگر کسی تاجر کا مال ہلاک ہو گیا تو رقم لینے والا اس کی تلافی کرے گا، یہ زائد رقم جو لی جاتی تھی اس کو "سوکرہ" کہا جاتا تھا، سوکرہ کا مطلب بیمہ اور ضمانت (security) کے ہیں۔ درحقیقت یہ مذکورہ بالا صورت بحری بیمہ کی تھی۔ اسی زمانہ میں علامہ شامیؒ نے اس صورت کے ناجائز ہونے کا فتویٰ جاری کیا تھا۔(۱)

انشورنس کے مقاصد

۱) تخیلاتی خدشات Specuative Risks: انشورنس کروانے والے امکانی نقصانات سے اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے ارادہ سے یہ راہ اختیار کرتے ہیں جسے تخیلاتی خدشات ہی کہا جا سکتا ہے، مثلاً کسی کاروبار میں سرمایہ لگاتے وقت پالیسی بنواتے ہیں، عام طور پر روایتی سودی بینک بھی قرض دینے سے قبل صارف

---

(۱) تکافل کی شرعی حیثیت: ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب ص: ۶۵، ۶۶

کو انشورنس کروانا ناجائز ہے کیوں کہ اس سے فریقین میں غیر یقینی حالات اور آگے چل کر نزاع کے اسباب و مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

۲) حقیقی خدشات Real Risks: نقصان کے حقیقی خدشات مثلاً آگ لگ جانے کا خوف وغیرہ ایسے حالات میں اجازت کی گنجائش نکل آتی ہے۔(۱)

بیمہ کمپنی کا تعارف

بیمہ کی چند قسموں کو تجارتی بیمہ یا کمرشل بیمہ (commercial insurance) التامین التجاری کہتے ہیں۔ اس میں ایک کمپنی ہوتی ہے اور وہ اسی مقصد کے لیے قائم کی جاتی ہے اور ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ حساب کا ایک طریقہ ہے جس کو آج کل کی اصطلاح میں ایکچوری کہتے ہیں، اس حساب کے ذریعہ یہ بتایا جاتا ہے کہ مثلاً ہمارے ملک میں جو حادثات و واقعات پیش آتے ہیں ان کا سالانہ اوسط کیا ہے، سال میں کتنی جگہ آگ لگتی ہے، کتنی جگہوں پر کاروں کا تصادم ہوتا ہے، کتنی جگہ ریل کا تصادم ہوتا ہے، کتنے جہاز ڈوبتے ہیں، کتنے زلزلے آتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اس کا ایک اوسط نکالتے ہیں اور اس اوسط کی بنیاد پر آنے والے سال کے لیے بھی وہ حادثات کا تخمینہ لگاتے ہیں کہ آئندہ سال اس قسم کے اس نوعیت کے کتنے حادثات پیش آنے کا خطرہ یا توقع ہے، اور ان حادثات میں اگر ہر حادثہ کے متاثرہ شخص کو معاوضہ دیا جائے تو کل کتنے اخراجات آئیں گے، فرض کریں کہ انہوں نے آئندہ سال پیش آنے والے حادثات کا اندازہ لگایا کہ ایک ارب روپیہ ہے، اب بیمہ کمپنی یہ کرتی ہے کہ اگر میں ایک ارب روپیہ خرچ کر کے ان سارے حادثات کا معاوضہ ادا کر دوں تو مجھے لوگوں سے کتنی قسطوں کا مطالبہ کرنا چاہیے جس سے نہ صرف یہ کہ ایک ارب روپے حاصل ہوں بلکہ ایک ارب سے زیادہ حاصل ہوں جو میرا نفع ہو اور کم از کم کمپنی کو لازماً دس کروڑ کا نفع تو ہونا چاہیے، اب انہوں نے ایک ارب دس کروڑ روپے لوگوں سے وصول کرنے کے لیے قسطوں کی

---

(۱) اسلامی نظام اقتصادیات و مالیات: ۱۷

تعداد مقرر کردی جو بھی بیمہ کرائے وہ اتنی قسط ادا کرے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب ساری قسطیں اکٹھی ہوجائیں تو کل ہمیں کتنی رقم ملے گی، ایک ارب دس کروڑ ملیں گےتو ایک ارب معاوضہ میں دے دیں گے اور دس کروڑ ہمارا نفع ہوجائے گا۔ یہ تجارتی کمپنیوں کا طریقۂ کار ہوتا ہے۔(۱)

اس بیمہ کا آغاز چودہوں صدی عیسوی میں ہوا، جن خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے، ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں۔

کمپنی کا مقصد اس رقم کے جمع کرنے سے یہ ہوتا ہے کہ اسے دوسرے لوگوں کو بطور قرض دے کر ان سے اعلیٰ شرح پر سود حاصل کرے یا کسی تجارت میں لگا کر یا کوئی جائیداد خرید کر اس سے منافع حاصل کرے اس کے شرکاء اپنی ذاتی رقم خرچ کیے بغیر کثیر رقم بصورت سود یا منافع حاصل کرتے رہتے ہیں اور اسی سود یا منافع میں سے بیمہ دار کو ایک حصہ دیتے ہیں۔(۲)

انشورنس کے دنیوی مصالح

ناگہانی حادثات صورت میں بیمہ دار تباہی و بربادی سے بچ جاتا ہے مثلاً:

۱) ہندو مسلم فساد میں بہت سے مسلمانوں کے کارخانے خاک سیاہ اور تباہ و برباد کردیے گیے جن لوگوں نے اپنے کارخانوں کا بیمہ کرالیا تھا وہ تباہی سے بچ گیے اور انہوں نے دوبارہ اپنا کاروبار جاری کردیا لیکن جنہوں نے اپنے کارخانوں کا بیمہ نہیں کرایا تھا وہ پورے طور پر برباد ہوگئے اور پنپ نہ سکے، دکانوں اور مکانوں وغیرہ کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔

نوٹ: فسادات ہندوستان کا روزمرہ بن چکے ہیں اور ان کا انسداد مسلمانوں کی استطاعت سے باہر ہے۔

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۳/۱۲ ۳ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

(۲) فتاویٰ بینات: ۴/۷ ۱۳

۲) اوسط طبقہ کے افراد جو کثیر العیال بھی ہوں اگر ناگہانی طریقہ سے وفات پا جائیں تو ان کے پسماندگان سخت پریشانی میں پڑتے ہیں اپنی قلیل آمدنی میں عموماً کوئی رقم پس انداز کر کے نہیں رکھ سکتے جو ان کے پسماندگان کے کام آسکے، ایسی حالت میں اگر وہ بیمہ پالیسی خرید لیں تو ایک طرف تو انہیں پس اندازی میں سہولت ہوتی ہے دوسرے ان کی ناگہانی وفات پر ان کی پس انداز رقم مع مزید رقم کے ان کے پسماندگان کو مل جاتی ہے جو ان کے لیے بہت مفید اور معاون ہوتی ہے۔

تعلیم وغیرہ کی صورت تو یہ مصلحت اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اس لیے کہ اگر وہ اپنی اولاد کو مناسب تعلیم دلانے سے قبل وفات پا جائیں تو اولاد کا سلسلہ تعلیم منقطع نہیں ہوتا اور کسی نہ کسی دن اولاد اس قابل ہو جاتی ہے کہ کچھ کما سکے۔

۳) اگر اولاد ناہنجار ہو تو باپ کے مرنے کے بعد ماں غفلت برتتی ہے اور اس کا شرعی حق نظر انداز کر کے باپ کی کل جائیداد واملاک پر قابض ہو جاتی ہے۔

اگر شوہر بیمہ کی پالیسی خرید کر اپنی بیوی کو اس کا وارث قرار دے دے تو یہ رقم بیوہ کو بے خرخشہ مل جاتی ہے۔

اگر اولاد کے درمیان تحاسد وتباغض ہو یا بعض بچے چھوٹے ہوں اور دوسری اولاد سے خطرہ ہو کہ ان کے حقوق ان سے غصب کر لیں گے تو بھی ان کے نام سے بیمہ پالیسی خرید لینا مفید ہو سکتا ہے۔

۴) چوں کہ کمپنیاں عموماً اہل ہنود کی ہیں اس لیے پالیسی خریدنا فساد کی تباہ کاریوں کو روکنے کا بھی ایک ذریعہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ فسادی یہ معلوم کر کے کہ مسلمان کی بیمہ شدہ مملوکہ شئ کو نقصان پہچانے خود ہندوؤں کو نقصان پہنچانا ہے، شاید اس نقصان پہنچانے سے باز رہیں، اس طرح ممکن ہے کہ کسی درجہ میں یہ حفاظت جان کا ذریعہ بھی بن سکے۔

نوٹ: اب سے دو چار صدی بیشتر مسلمانوں کے حالات مختلف تھے، اول تو ناگہانی حادثات کی اتنی کثرت نہیں تھی جو آج مشینوں کے رواج کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے، دوسرے بکثرت مسلمان اسلامی حکومتوں میں رہتے تھے، جہاں بیت المال بڑی حد تک ان حوادث کے نتائج سے پناہ دیتا تھا، تیسرے مصارف زندگی کا اتنا بوجھ بھی نہیں ہوتا تھا، چوتھے آپس کی ہمدردی کا جذبہ اتنا سرد نہیں ہوا تھا جتنا آج ہوگیا ہے، پانچویں تعداد کی قلت اور قوم کی بحیثیت مجموعی دولت مندی، زکوۃ وصدقات کا رواج یہ سب امور مل کر اس قسم کے نقصانات کی تلافی کردیا کرتے تھے، اب ان سب چیزوں کے تقریباً فقدان سے آبادی میں اضافہ مزید پریشانی کا باعث ہے، سو میں ایک کی تباہ حالی دور کرنا آسان ہے مگر سو میں ۲۵ کے ساتھ مواسات کرنا بہت مشکل ہے۔

دنیوی مفاسد ومضر نتائج

واضح رہے کہ یہاں صرف دنیاوی مفاسد کا تذکرہ مقصود ہے جن کی طرف بعض اوقات بعض اہل کی نظر نہیں جاتی دینی مفاسد سے چوں کہ ہر صاحب علم واقف ہے اس لیے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

۱) ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ کسی وارث نے بیمہ کی رقم وصول کرنے کے لیے مورث کو (جو کہ بیمہ دار تھا) قتل کروادیا۔

۲) اس قسم کے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ بیمہ دار نے دھوکہ دے کر اپنی دوکان یا اپنے مکان یا کسی اور چیز کی مالیت زیادہ ظاہر کردی اور اس کا بیمہ کرادیا اور کچھ عرصہ کے بعد سود کی رقم (جو اس کی مملوکہ شئی کی مالیت سے معتد بہ حد تک زائد تھی) وصول کرنے کے لیے اس شئی کو مخفی طریقہ سے خود تلف کردیا مثلاً آگ لگادی یا اور اسی قسم کی حرکت کی اور اس طرح نقصان کی تلافی کے ساتھ مزید نفع بھی اٹھایا۔

۳) اس قسم کے واقعات کی تعداد اگر چہ قلیل ہے مگر نہ تو بعید از قیاس ہے اور نہ النادر کالمعدوم کہے جاسکتے ہیں۔

تجربات شاہد ہے کہ جو دولت بے مشقت اور بے محنت ہاتھ آجاتی ہے آدمی اسے بہت بے دردی کے ساتھ خرچ کرتا ہے، نوجوان اولاد کو اگر باپ کے بعد بیمہ کی رقم بغیر محنت و کوشش ملے گی تو ظن غالب یہی ہے کہ وہ اسے بے دریغ صرف کرے گی، اسراف وتبذیر کی عادت فی نفسہ مذموم ہونے کے علاوہ افلاس وتباہی کا پیش خیمہ بھی ہے جو اخلاقی خرابیاں ایسی صورت میں پیدا ہوتی ہیں ان کی تفصیل بے ضرورت ہے۔

۴) یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ بیمہ پالیسی کی خریداری میں سرمایہ دار طبقہ ہی پیش پیش ہوسکتا ہے۔

سود کی رقم اس کی دولت میں اور اضافہ کرے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کو مزید ترقی ہوگی۔(۱)

۵) اس حرص وآز کی دنیا میں جبکہ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی ہیں، یہ صورت حال کیا اس نقطۂ نظر سے خطرناک نہیں ہوسکتی کہ یہ ورثاء اپنے اس مورث کی موت کو اس کی زندگی پر ترجیح دینے لگیں اور اس کی زندگی کے بجائے موت کے خواہاں ہوجائیں، سوچنے کا مقام ہے کہ یہ احساس یا خواہش انسان کو کیسی کیسی خرابیوں بلکہ جرائم تک میں مبتلاء کردیتی یا کرسکتی ہے پھر جو بھیانک حادثہ پیش آجائے مستبعد نہیں ہوگا۔

اس پہلو کو سامنے رکھنے سے بیمہ کے اصل محرک (خطر محض) کا مقابلہ کرنے کے علاوہ دوسرے امکانات اور جذباتی محرکات کے احتمال سے بھی انکار مشکل ہوگا اس طرح اس اسکیم میں ''افادی'' پہلوؤں کے علاوہ فی الجملہ مضر اثرات کے لیے بھی سوء ظن کی

---

(۱) فتاویٰ بینات: ۴/ ۱۴۰، ۱۴۳

گنجائش نکل آتی ہے اس کے علاوہ یہ پہلو بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے کہ جس قسم کے خطرات کو خطر محض سمجھا جاتا ہے وہ بھی عموماً یا ان کی معتد بہ صورتیں کسی انسانی غلطی یا کم سے کم حزم و احتیاط میں کسی درجہ کی کوتاہی سے پیش آتے ہیں اب یعنی انشورنس کرا لینے کے بعد ''خطر محض'' پیش آجانے سے مالی نقصان کی تلافی کا مکمل یقین حاصل ہوگیا اور خسارہ برداشت کرسکنے کا احتمال بھی ختم ہوگیا تو یہ شخص اور زیادہ بے پروائی اور بے فکری اختیار کرلے گا یا کرسکتا ہے (کیوں کہ عام انسانی فطرت ہی بے پروا اور سہولت پسند واقع ہوئی ہے) جس کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے ''خطر محض'' قسم کے واقعات زیادہ پیش آنے لگیں اور قومی دولت کی تباہی اور اس کے ضائع ہونے کے امکانات بڑھ جائیں، اس طرح یہ علمی دریافت اور انکشاف سماج کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچانے کا سبب ہوجائے اور اللہ کی نعمت ثابت ہونے کے بجائے یہ مصیبت ونقمت مظہر بن جائے کیوں کہ ظاہر ہے کہ انشورنس براہ راست قومی دولت میں تو کوئی اضافہ کرتا نہیں، زیادہ سے زیادہ شخصی نقصان کی تلافی کردیتا ہے، سو وہ اس شخص کی حد تک ہو ہی جائے گی تو اس خود غرضی اور سہل نگاری کے زمانہ میں محض ''قوم'' کی خاطر کوئی کیوں دل سوزی کرنے لگا۔

اس پر یہ اضافہ اور کرلیجیے کہ اگر یہ ''خطر محض'' کسی دوسرے کی غلطی سے پیش آیا (مثلاً کپتان کی غفلت سے جہاز ڈوبا) تو اس نقصان رسیدہ شخص کو (مثلاً جہاز کے مالک کو) بعض شکلوں میں (قانون شرعی کی رو سے) ضمان بھی مل سکتا ہے (کتب فقہ میں تفصیل دیکھی جاسکتی ہے) اور انشورنس کرا لینے کے بعد، اسے بیمہ کمپنی کی طرف سے تلافی نقصان کا پورا اطمنان ہے ہی، اس طرح یہ شخص نقصان نہیں بلکہ اپنا فائدہ اسی خطرہ میں سمجھ سکتا ہے (بلکہ سمجھنا چاہیے) تو سود و زیاں کے اس عالم میں ایسے نقصان نما فائدے کے لیے از خود خفیہ کوشش کرے، احتمالات نہیں رہ گیے بلکہ چشم سر کے سامنے واقعات بن کر آرہے ہیں، اس لیے احتیاط اور دور اندیشی کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ

یہاں ''خیر'' کی توقع کے ساتھ ساتھ اس ''شر'' کا امکان بھی سامنے رہے۔(۱)

خلاصہ ونتیجہ

اب رہا یہ سوال کہ انشورنس کے معاملہ میں بڑی مصلحتیں ہیں، لہٰذا ان مصالح کے پیش نظر کیا اس کی اجازت ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مصالح کا اعتبار وہاں کیا جاتا ہے جہاں مقاصدِ شریعت فوت نہ ہوتے ہوں اور جہاں مقصدِ شریعت فوت ہوتے ہوں وہاں مصالح کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، پھر مصالح کے اعتبار کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں حکم منصوص نہ ہو، اور یہاں ایک تو حکم منصوص ہے اور وہ ہے سود کا حرام ہونا اسی طرح قمار کا حرام ہونا دوسرے ان مصالح کے اعتبار کرنے سے مقاصد شریعت (جو سود کی حرمت سے متعلق ہیں) فوت ہوجاتے ہیں، لہٰذا ان مصالح کا اعتبار کرکے انشورنس کے جواز کا فتویٰ کسی طرح نہیں دیا جاسکتا۔ پھر وہ مصالح جن کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی تفصیل کچھ اسی معاملہ پر منحصر نہیں ہے کہ اس میں جواز تلاش کیا جائے، بلکہ شریعت نے ان مصالح کی تحصیل کے لیے دوسری صورتیں تجویز فرمائی ہیں۔ اس کو اختیار کی جاسکتی ہیں)۔(۲)

کیا انشورنس امداد باہمی ہے؟

انشورنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تعاون کی ایک شکل ہے، لیکن محض نام سے حکم نہیں متعلق ہوتا، بلکہ حقیقت سے ہوتا ہے، مزید برآں یہ کہ اگرچہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس جیسی نوعیت رکھنے والے معاملات میں دی جانے والی رقم کو بھی جس جگہ ''زر تعاون'' یا ''چندہ'' کا نام دے کر تعاون اور چندہ کی معروف اور اصل شکل کی طرح اس صورت کو بھی جائز اور درست سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر کہیں ایسا ہوا یا ہوتا ہے تو اسے بھی جائز ہی کہنا چاہیے، اور سب جانتے ہیں کہ تعاون اور چندہ کی عام طور پر جو شکلیں رائج

---

(۱) بینک انشورنس اور سرکاری قرضے: ۸۶، ۸۸

(۲) انشورنس پالیسی اور اسلام ص ۱۴

ہیں اور درست سمجھی جاتی ہیں ان میں تعاون کرنے اور چندہ دینے والا شخص، وصول کرنے والوں سے اس رقم کو مع اضافے کے واپس لینے کا تصور بھی نہیں کرتا، چہ جائیکہ واپسی کا باقاعدہ معاہدہ کرتا ہو، مثلاً تعلیمی اور رفاہی اداروں میں چندہ اور تعاون دینے والے یہ سوچتے بھی نہیں یہ رقم اضافے کے ساتھ لوٹا دی جائے گی! زیادہ سے زیادہ یہ خیال ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے کہ ان اداروں سے ان کو یا ان کی اولاد کو (یا کسی طرح کا تعلق! مثلاً مذہبی تعلق رکھنے والوں کو) کسی نوعیت کا مثلاً تعلیم وتربیت وغیرہ کا فائدہ پہونچ سکتا ہے تو اس صورت میں ''ربا'' کدھر سے آسکتا ہے؟ جبکہ نہ معاہدہ ہے، نہ ہم جنس شئے کا تبادلہ، نہ اضافہ کی شرط ہے اور نہ کوئی ایسی چیز!

اسی طرح اگر کوئی شخص مثلاً آج کسی مصیبت زدہ کی مدد اور اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے، اس خیال اور اس امید کی بنا پر کہ کل مجھے بھی یہ مصیبت پیش آسکتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ آج کا مصیبت زدہ کل مدد کرنے کے لائق ہوجائے اور میری مدد کرے، آئندہ اگر یہ توقع پوری بھی ہوجاتی ہے تو بھی اسے ''ربو'' نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ یہاں یہ معاہدہ نہ اضافہ کی شرط! صرف توقع ہے ''سو وہ ہوا کرے'' اس سے حکم نہیں بدلتا اور اگر یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو اسے قانوناً اپنی دی ہوئی رقم کو اضافہ کے ساتھ واپس لینے کا کوئی حق نہ ہوگا، زیادہ سے زیادہ بعض شکلوں میں بس اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکتا ہے (رجوع عن الہبۃ کی شکل) کسی اضافہ کا قطعاً حق نہ ہوگا اور اصل رقم کی واپسی بھی سخت ناپسندیدہ کام، بلکہ بعض علماء کے نزدیک ناجائز ہی ہے۔

لیکن اگر یہاں کوئی شکل ''تعاون'' اضافے کے ساتھ واپسی کی شرط سے کرتا ہے تو وہ اضافہ ''ربو'' ہی ہوگا، اس کا نام تعاون (بلکہ جود وسخا بھی) رکھ دینے سے حکم نہیں بدلے گا۔

خلاصہ یہ کہ انشورنس اور عقد ربوا میں بہ لحاظ حقیقت وصورت ایسا کوئی فرق نہیں نظر آتا جس سے حکم میں فرق کیا جاسکے، یوں تھوڑا بہت فرق ''ربو'' کی معروف شکلوں

کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔

رہا یہ کہ انشورنس میں بعض دنیاوی ''منافع'' اور ''سماجی فوائد'' ہیں سو اس کا انکار نہیں، لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بعض دنیاوی منافع کس حرام معاملہ میں نہیں ہوتے؟ اگر کوئی نفع نہ ہو تو وہ معاملہ کیا ہی کیوں جائے؟ اور اسے حرام قرار دینے کی ضرورت ہی کب پیش آئے۔(۱)

ایک بہت بڑا دھوکہ

درحقیقت مروجہ بیمہ کو ''امداد باہمی'' کہنا ایک بہت بڑا دھوکہ ہے اور بیمہ اور سٹہ جیسے سودی کاروبار کی لعنت اور اس پر آنے والی نحوست کو پوری قوم کے سر ڈالنے کا ایک خوب صورت ''حیلہ'' ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ ''سودی کاروبار'' کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ مثلاً دس ہزار کا سرمایہ رکھنے والا تاجر اپنے دس ہزار کے ساتھ بینکوں کے ذریعہ نوے ہزار روپیہ پوری قوم سے بطور ''سودی قرض'' وصول کر کے ایک لاکھ روپے کا کاروبار کرتا ہے اب اس کاروبار میں جو نفع ہوتا ہے وہ ''سارا کا سارا'' کاروبار کرنے والے ساہوکار کی جیب میں جاتا ہے، برائے نام دو فیصد یا چار فیصد کے حساب سے وہ اس قومی سرمایہ کے ''سود'' کے نام سے دیتا ہے جو بینک کے حصہ داروں میں تقسیم ہو کر ''قومی سرمایہ'' میں ایک بے منفعت اور بے فائدہ ''اضافہ'' ہے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا البتہ اس کاروبار کے کرنے والے سیٹھ کے (نوے ہزار قومی سرمایہ کی بدولت) ایک لاکھ کے دو لاکھ ہو جاتے ہیں اور اس کی ''سرمایہ داری'' بڑھ جاتی ہے اور اگر بالفرض اس کاروبار میں غیر معمولی خسارہ اور اس کی تجارت کو زوال آیا اور تمام سرمایہ ڈوب گیا تو اس کاروبار کرنے والے کا نقصان تو صرف دس ہزار یعنی دس فیصد کا ہوا باقی نوے فیصد سرمایہ قوم کا تھا اس کو نوے فیصد نقصان اٹھانا پڑا، اول تو یہی صریح ظلم سے کچھ کم نہیں کہ ملت کو منافع ملے تو چار فیصد کے حساب سے اور نقصان اٹھانا پڑے تو نوے فیصد کے حساب سے۔

---

(۱) حوالہ سابق: ۸۰، ۸۱

ستم بالاستم ان سودی کاروبار کرنے والے خودغرض سیٹھوں اور مہاجنوں نے اپنے دس ہزار (اصل سرمایہ) کے نقصان کو بھی قوم کے سر ڈالنے کے لیے دو طریقہ ایجاد کر رکھے ہیں ایک بیمہ دوسرے سٹہ کیوں کہ کاروبار میں غیر معمولی نقصان دو طریقوں سے ہوتا ہے۔

۱) کبھی کسی ناگہانی حادثہ مثلاً آگ لگ جائے (یا جہاز ڈوب جائے وغیرہ) پیش آجائے۔

۲) خرید کردہ مال کی قیمت عالمی مارکیٹ میں گر جائے۔

پہلی قسم کے نقصان کو جو خالص اس کی ذات پر پڑنے والا تھا بیمہ (انشورنس) کے ذریعہ پوری قوم پر ڈال دیا (پورا نقصان بیمہ کمپنی سے وصول کرلیا اور خود خسارہ سے صاف بچ گیا) دوسری قسم کے نقصان سے بچنے کے لیے سٹہ کا بازار گرم کیا تا کہ جہاں ذرا نقصان کا خطرہ نظر آئے فوراً اپنی بلا دوسرے کے سر ڈال کر خود نقصان سے پاک اور بیباق ہو جائے۔

اسی طرح اگر موجودہ طریق کے کاروبار کی گہرائیوں پر غور کیا جائے تو چھپا ہوا راز کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ بیمہ (انشورنس) اور سٹہ درحقیقت صرف سودی کاروبار کے ہتھکنڈے ہیں جن کو بڑی ہوشیاری اور خوبصورتی کے ساتھ بھولے بھالے مسلمانوں اور حقیقت سے بے خبر لوگوں کو ''قومی ہمدردی'' اور ''امداد باہمی'' کا سبز باغ دکھا کر اور ناگہانی حادثات کے ہونے سے ڈرا کر اس دام فریب میں گرفتار کیا جاتا ہے اور ان کے تھوڑے بہت ''پس انداز'' سرمایہ پر بھی ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔(۱)

انشورنس (بیمہ) کے اقسام

۱) سامان کا بیمہ (Goods Insurance)

اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ جو شخص کسی سامان کا بیمہ کرانا چاہتا ہے وہ معین شرح

---

(۱) فتاویٰ بینات: ۴/ ۱۹۳، ۱۹۴

سے بیمہ کمپنی کو فیس ادا کرتا رہتا ہے جسے پریمیم (Premium) کہتے ہیں، اس سامان کو حادثہ لاحق ہونے کی صورت میں کمپنی اس کی مالی تلافی کر دیتی ہے، اگر سامان کو کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو بیمہ دار نے جو پریمیم (Premium) ادا کیا ہے وہ واپس نہیں ہوتا، البتہ حادثہ کی صورت میں بیمہ کی رقم بیمہ دار کو مل جاتی ہے جس سے وہ اپنے نقصان کی تلافی کرلیتا ہے اس میں جہاز کا بیمہ، گاڑی کا بیمہ، مکان کا بیمہ وغیرہ شامل ہے۔

۲) ذمہ داری کا بیمہ

جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آسکتی ہے، اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لیے بیمہ کرالیا جاتا ہے، مثلاً گاڑی چلانے پر حادثہ کے نتیجہ میں کسی دوسرے کا نقصان ہوجانے کا خطرہ ہے اس صورت میں گاڑی چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہوجائے گا، اس کا بیمہ کرالیا جاتا ہے اور حادثہ کے وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے اس کو عموماً ''ثالثی بیمہ''(Thirdparty Insurance) کہتے ہیں۔

۳) (زندگی کا بیمہ(Life Insurance)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ اگر ایک مخصوص مدت میں بیمہ دار کا انتقال ہوگیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثہ کو ادا کرے گی اس کی کئ شکلیں ہوتی ہیں، بعض صورتوں میں مدت مقرر ہوتی ہے اس مدت میں انتقال نہیں ہوا تو مدت ختم ہونے سے بیمہ ختم ہوجاتا ہے اور رقم مع سود کے واپس مل جاتی ہے بعض صورتوں میں مدت مقرر نہیں ہوتی، جب بھی انتقال ہوگا تو بیمہ کی رقم ورثہ کو مل جاتی ہے۔

بیمہ کے طریق کار اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے مزید تین قسمیں ہیں:

۱) گروپ انشورنس(Group Insurance)

حکومت کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس میں افراد کے کسی مجموعہ کو اپنے کسی نقصان کی تلافی یا کسی فائدہ کے حصول کی سہولت حاصل ہوجاتی ہے، مثلاً سرکاری

ملازمین کی تنخواہوں سے تھوڑی سی رقم ہر ماہ کاٹ کر اسے ایک فنڈ میں جمع کرلیا جاتا ہے، پھر ملازم کی وفات یا کسی حادثہ کی صورت میں بھاری رقمیں ورثہ کو یا خود ملازم کو ادا کی جاتی ہے، یہ ایک سوشل کام ہے جو حکومت اپنے اہل وطن کے مستقبل کے حادثات میں بطور تعاون انجام دیتی ہے، گویا یہ حکومت کی طرف سے تبرع وعطیہ ہے کوئی معاوضہ کا عقد نہیں ہے اس سبب سے کسی بھی عالم کا اس کے جواز میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) تعاونی بیمہ (Mutual Insurance)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں، وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنالیتے ہیں اور یہ طے کرلیتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ سے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی، اس فنڈ میں صرف اس کے ممبران کی رقم ہوتی ہے اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے، سال کے بعد حساب کرلیا جاتا ہے اگر ادا کیے گیے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید رقم وصول کی جاتی ہے، اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کردی جاتی ہے، یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لیے فنڈ میں حصہ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

ابتداء میں بیمہ کی یہی شکل رائج ہوئی تھی اور شرعاً اس میں کوئی قباحت واشکال نہیں، جتنے علماء نے بیمہ پر گفتگو کی ہے، سب اس کے جواز پر متفق ہیں۔ (اس کو اسلامی انشورنس کہا جاتا ہے عربی میں تکافل جس کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

مجلس مجمع الفقہ الاسلامی (اسلامک فقہ اکیڈمی) جو رابطہ عالم اسلامی (مسلم ورلڈ لیگ) کا ایک ذیلی ادارہ ہے، اس نے سعودی کے "مجلس هيئة كبار العلماء" (ممتاز علماء کونسل) کے قرارداد کی تائید وموافقت کی جو اس نے ۴ر۴ر۱۳۹۷ء کو اس ادارہ کے تحت پاس کی کہ تعاونی بیمہ درج ذیل دلائل کی بنیاد پر جائز ہے، جبکہ تجارتی بیمہ جائز نہیں ہے۔

۱) تعاونی بیمہ خیراتی عقد میں سے ہے جس کا مقصد خطرات کے وقت صرف تعاون ہے اور حادثات کے اس بوجھ کے اٹھانے میں حصہ لینا ہے، اور وہ اس طرح سے کہ کچھ لوگ نقد روپیے دینے میں حصہ لے جو اس آدمی کو معاوضہ دینے کے لیے خاص کردیا جائے جسے کسی قسم کا نقصان ہوتا ہے، گویا تعاونی بیمہ کرنے والی جماعت کا مقصد تجارت اور دوسرے کے مال سے نفع کمانا نہیں ہے، ان کا مقصد صرف خطرات کو آپس میں بانٹ لینا ہے اور نقصان کی تلافی میں تعاون کرنا ہے۔

۲) تعاونی بیمہ سود کی قسموں (ربا الفضل، ربا النسیئۃ) سے پاک ہے، اس لیے اس میں حصہ لینے والوں کا عقد سودی عقد نہیں ہے اور نہ یہ لوگ قسطوں میں جمع کیا ہوا روپیہ کو سودی کاروبار میں لگاتے ہیں۔

۳) تعاونی بیمہ میں حصہ لینے والوں کی طرف لوٹنے والے فائدہ کا متعین نہ ہونا، اس میں نقصان دہ نہیں ہے، کیوں کہ یہ لوگ خیرات کرنے والے ہیں، اس وجہ سے نہ اس میں کوئی خطرہ ہے اور نہ غرر ہے اور نہ ہی جوا ہے، بخلاف تجارتی بیمہ کے، کیوں کہ اس میں تجارتی مال کے معاوضہ عقد ہوتا ہے۔

۴) اس میں شریک ہونے والی جماعت کا قسطوں میں جمع شدہ مال کو بڑھانا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہے جس کے لیے یہ تعاونی بیمہ بنایا گیا ہے، خواہ یہ استثمار بطور خیرات ہو یا خاص اجرت کے مقابلہ میں ہو۔(۱)

تجارتی بیمہ(Commercia Insurance)

اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے اس کمپنی کا مقصد بیمہ کو بطور تجارت اختیار کرنا ہوتا ہے اور اس کا اصل مقصد بیمہ کے ذریعہ سے نفع کمانا ہوتا ہے، یہ کمپنی مختلف قسم کے بیمے کی اسکیمیں جاری کرتی ہے، جو بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کے ساتھ بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں گے اور نقصان کی

---

(۱) محقق ومدلل جدید مسائل: ۲/ ۱۱۸

صورت میں کمپنی آپ کے تعاون کی تلافی کرے گی، کمپنی قسطوں کا تعین کرنے کے لیے حساب کر لیتی ہے کہ جس خطرہ کے خلاف بیمہ ہوا ہے وہ کتنی بار متوقع ہے تاکہ ان کے معاوضات ادا کر کے کمپنی کو نفع بچ سکے، اس کے حساب کے لیے ایک مستقل فن ہے جس کے ماہر کو انگریزی میں "Actuary" کہتے ہیں۔

بیمہ کی اس قسم کا رواج زیادہ ہے اور اسی کا شرعی حکم علماء معاصرین میں زیادہ محل بحث بنا ہے، اس وقت عالم اسلام کے تقریباً مشاہیر علماء کرام اس کی حرمت کے قائل ہیں ، جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمہ میں قمار بھی اور ربا بھی، قمار اس لیے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے، جو قسطیں ادا کی گئیں ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے، اسی کو قمار کہتے ہیں اور ربا اس طرح سے کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے۔(۱)

بیمہ کی قسموں کا ایک خاکہ

بیمہ کی دیگر بہت ساری قسمیں ہیں، قارئین کے استفادہ کے لیے بیموں کا ایک مختصر نقشہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ان کے علاوہ بیمہ کی اور بہت سی قسمیں ہیں۔

۱) جسم میں لگنے والی چوٹ کا بیمہ۔

۲) بیماری کا بیمہ۔

۳) شادی اور اولاد کا بیمہ۔

۴) زندگی کا بیمہ۔

پھر زندگی کے بیمہ کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) حالت وفات کا بیمہ۔

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۱۶، ۱۱۸

(۲) حالت بقا کا بیمہ۔

(۳) حالت وفات وبقا دونوں کا بیمہ۔

(۴) زندگی بھر کے لیے بیمہ۔

(۵) خاص عمر تک کے لیے بیمہ۔

(۶) بقیہ زندگی کے لیے بیمہ۔(۱)

عدم جواز کی وجوہات

روایتی طریقہ پر قائم انشورنس کمپنیاں وادارے درج ذیل وجوہات کی بناء پر ناجائز ہیں:

۱) غرر: غیر یقینی کیفیت جو بیشتر باہمی نزاع کا سبب بنتی ہے روایتی انشورنس میں ایک ہی فریق یقینی طور پر نفع کماتا ہے، مثلاً انشورنس کمپنی کہ وہ ممبروں کی جانب سے ایک طویل مدت کے لیے فراہم کردہ بطور پریمیم رقومات کو نفع بخش کاروبار میں لگاتی ہے اور جواباً کوئی قابل ذکر خدمات بھی مہیا نہیں کرتی، ایک مدت گزرنے کے بعد سرمایہ کے مالک کو بطور ڈیوڈیڈینڈ (Dividend) کچھ رقم دے کر مطمئن کردیتی ہے۔

۲) میسر: بے بنیاد خیالی نفع کے لالچ میں صارف سرمایہ دار یہ سوچ کر پالیسی لیتا اور پریمیم ادا کرتا ہے کہ نقصان اگر ہو تو مکمل بھرپائی ہوگی جب کہ یہ اندیشہ بے بنیاد وتخیلاتی ہے، پالیسی کی مدت کے دوران جب وہ نقصان سے دوچار نہیں ہوتا تو پھر اس کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

۳) ربوا: زائد رقم کی کمپنی کی جانب سے وصولی کے عوض صارف کو کوئی خدمات یا نفع نہیں ملتے۔ روایتی انشورنس کمپنی میں ربوا دو طرح سے ہوتا ہے۔

۱) جس وقت ایک صارف سے پریمیم وصول کرنے کے بعد کمپنی اس کے

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۱۶

اپنے حق دعویٰ (Claim) پیش کرنے پر اس کی ادا کردہ رقومات کے ساتھ زائد رقم اضافی ادا کرے۔

۳) صارف کے وصول کردہ پریمیم کی رقومات بطور قرض، قرض داروں کو دی جاتی ہیں اور ان پر سود وصول کر کے جمع رقم کے مالکین کو تجویز کردہ شرح فیصد پر ادا کی جاتی ہے۔(۱)

۴) انشورنس کا کاروبار مشروط بالشرط ہوتا ہے اور قرضِ مشروط حرام ہے۔

۵) انشورنس مؤجل (ادھار) ہوتا ہے اور قرض میں تاجیل صحیح نہیں ہے۔

۶) کمپنی والے اس رقم سے لوگوں کے ساتھ سودی معاملہ کرتے ہیں، تو انشورنس کرنے میں گناہ پر تعاون لازم آ رہا ہے۔(۲)

ہندوستان میں جان کا انشورنس

انشورنس میں ربا اور قمار پائے جانے کی وجہ سے انشورنس ناجائز اور حرام ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے، یہی انشورنس کا اصل حکم ہے۔

لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات یہ ہیں کہ منصوبہ بند فرقہ پرستوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان و مال مستقل خطرے میں ہے، آئے دن فسادات ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کا عملہ کہیں تو مفسدین کی پشت پناہی کرتا ہے اور کہیں خاموش تماشائی بن کر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا منظر دیکھتی رہتی ہے اس لیے ایسے علاقے جہاں فسادات کا امکان ہو تو بیمہ کرانے کی اجازت ہوگی، ورنہ نہیں۔(۳)

❁ فتاویٰ دار العلوم میں ہے، بیمہ کرانا مکان و جان کا شرعاً ناجائز ہے اور یہ قمار ہے جو کہ بنص قاطع حرام ہے۔(۴)

---

(۱) اسلامی نظام اقتصادیات و مالیات: ۱۷

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: احسن الفتاوی: ۷/ ۲۴، محقق و مدلل جدید مسائل: ۱/ ۳۹۰-۳۹۱

(۳) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۹۰

(۴) مکمل و مدلل فتاویٰ دار العلوم: ۱۴/ ۵۰۹

- چند اہم عصر مسائل میں ہے: ”بیمہ کی یہ صورت سود اور غرر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے“۔(۱)
- مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ: انشورنس سود اور قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے، البتہ جو انشورنس حکومت کی طرف سے لازمی ہو مثلاً موٹر وغیرہ کا بیمہ اس کو مجبوراً کرا سکتے ہیں، مگر جب رقم ملے تو صرف اتنی رقم خود استعمال کر سکتے ہیں جتنی خود داخل کی تھی اس سے زائد نہیں۔(۲)
- مفتی محمود الحسن گنگوہی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ: بیمہ میں سود بھی ہے اور جوا بھی، یہ دونوں چیزیں ممنوع ہیں، بیمہ بھی ممنوع ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہو کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت نہ ہوسکتی ہو یا قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا درست ہے۔(۳)
- مفتی نظام الدین صاحب اعظمی فرماتے ہیں کہ بیمہ میں عموماً قمار، جوا اور ربوا ہوتا ہے؛ اس لیے ناجائز ہے البتہ اگر کسی ملک یا خطہ کی بدحالی ایسی ہو جائے کہ بغیر اس بیمہ کے جان و مال کا تحفظ متعذر ہو جائے یا قانونی مجبوری ہو جائے تو اس اضطراری کیفیت کی وجہ سے اپنے تحفظ کے لیے بقدر ضرورت استعمال کی گنجائش ہو جائے گی پھر اس کا بھی لحاظ ضروری ہے کہ اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زائد رقم ملے تو اس کو خود کسی کام میں نہ لائے؛ بلکہ اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے غرباء و مساکین کو دیدے، ہاں اگر اپنے اوپر مرکزی حکومت کا کوئی غیر شرعی ٹیکس لاگو ہو تو اس ٹیکس میں دیدینے کے بعد جو رقم بچے اس کو بطریق مذکورہ غرباء و مساکین کو دے دے۔(۴)

---

(۱) چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۳۰

(۲) فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۳۱۴

(۳) فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۳۸۸

(۴) منتخب نظام الفتاویٰ: ۱/ ۱۹۲، مستفاد احکام مال حرام: ۷۵، ۷۶

فقہ اکیڈمی کا فیصلہ: مروجہ انشورنس اگرچہ شریعت میں ناجائز ہے کیونکہ وہ ربا، قمار، غرر جیسے شرعی طور پر ممنوع معاملات پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں جبکہ مسلمانوں کی جان و مال، صنعت وتجارت وغیرہ کو فسادات کی وجہ سے ہر آن شدید خطرہ لاحق رہتا ہے، اس کے پیش نظر ''الضرورات تبیح المحظورات'' رفع ضرر، دفع حرج اور تحفظ جان و مال کی شرعاً اہمیت کی بنا پر ہندوستان کے موجودہ حالات میں جان و مال کا بیمہ کرانے کی شرعاً اجازت ہے۔

واضح رہے کہ فقہ اکیڈمی کی طرف سے یہ تجویز اور سیمینار میں شریک اہلِ علم کی طرف سے اس کی تائید کا یہ مطلب نہیں کہ انشورنس مسلمانوں کی حفاظت کا ضامن ہے، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس انشورنس کے بعد جو بھی صورت پیش آئے اس میں ملنے والی سب رقم انشونس کرانے والوں کے لیے جائز و درست ہوگی، بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ کہ صرف فسادات کی صورت میں مال و جان کے نقصان کے بعد جو کچھ ملے اور جو حق قانون وضابطہ میں بتایا جائے، اس کے مطابق ملنے والا مال تو انشونس کرانے والوں کے لیے جائز و درست ہوگا اور بقیہ صورتوں میں صرف اپنی جمع کردہ رقم کے بقدر لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد کا نہیں۔ اور انشورنس کی صورت میں زائد کے جواز کی جہت حکومت کی نااہلی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس کی طرف سے اور اس پر ضمان کی ہے۔(۱)

اس حوالہ سے مفتی شعیب اللہ خان صاحب فرماتے ہیں:

ہندوستان کے موجودہ حالات میں، جہاں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ رہتا ہے اور مسلمانوں کی جانیں اور املاک بالکل محفوظ نہیں رہتیں، بلکہ بسا اوقات مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں تباہ و ہلاک کردی جاتی ہیں، کیا اس کی گنجائش ہے کہ محض اپنی جان کی حفاظت کی خاطر لائف انشورنس کرایا جائے؟

اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں، کیوں کہ:

(۱) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۱۶۵، ۱۶۶

۱) ایک عام حادثہ میں مارے جانے میں اور فرقہ واریت میں مارے جانے میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر ایک شخص اس لیے انشورنس کراتا ہے کہ کسی عام حادثہ میں مارے جانے کی وجہ سے مصائب پیش آتے ہیں تو اس کا ناجائز ہونا مسلم ہے، تو اگر کوئی اس لیے انشورنس کراتا ہے کہ فرقہ واریت میں مارے جانے سے مصائب کا سامنا ہوگا تو اس کے جائز ہونے کی کیا علت ہے؟ اور آخر ان دونوں میں بنیادی اور جوہری طور پر فرق کیا ہے؟

۲) دوسرے اس سلسلہ میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ لائف انشورنس کرانے سے حکومت ہماری جانوں کی ذمہ دار ہوجاتی ہے، اور فسادات کی صورت میں حفاظت کا چست نظام بنا کر فرقہ واریت کو ختم کرسکتی ہے، یہ محض ایک خام خیالی ہے، کیوں کہ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ فرقہ واریت میں ہونے والے حوادث کی انشورنس کمپنی ذمہ دار نہیں ہوتی۔

۳) تیسرے یہ کہ کیا انشورنس کرانے کی صورت ہی میں حکومت ہماری جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہے؟ کیا اس کے بغیر وہ اس کی ذمہ دار نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر وہ کیوں حفاظت نہیں کرتی؟ اور اگر ذمہ دار ہونے کے باوجود وہ اس میں کوتاہی کرتی ہے تو کیا یقین ہے کہ انشورنس جیسی حرام چیز کا ارتکاب کرنے کے باوجود وہ اپنی ذمہ داری کو پوری کرے گی؟

۴) اگر ان حالات کی وجہ سے انشورنس کو جائز قرار دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ جواز صرف ان حالات کے زمانے میں ہوگا یا ہر زمانے میں؟ اگر اس کا زمانہ محدود ہوگا تو اس کی حد کیا ہوگی؟ کیوں کہ حالات تو ہر وقت یکساں نہیں رہتے، جس طرح عافیت کے حالات یکساں نہیں ہوتے اسی طرح فسادات کے حالات بھی یکساں نہیں ہوتے، تو یہ جواز کب تک کے لیے ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا متعین کرنا ایک متعذر امر ہے، اس لیے یہ متعین تو کیا نہ جاسکے گا، لامحالہ اس کو غیر

محدود طور پر جائز کہنا پڑے گا، چاہے حالات کچھ بھی ہوں، تو کیا اس کی کوئی اہل علم و دین اجازت دے سکتا ہے؟

الغرض لائف انشورنس کی گنجائش دینا بلا وجہ ایک حرام کو حلال کرنے کے مترادف ہے، اور اس میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ سراسر مفاسد ہیں، لہٰذا سوال خارج از بحث ہے۔(۱)

املاک کا انشورنس (اکابر کی نظر میں)

املاک و اشیاء کے انشورنس میں یہ ہوتا ہے کہ طالب انشورنس ایک مقررہ مدت مثلاً تین ماہ یا چھ ماہ یا سال بھر کے لیے انشورنس کمپنی کے شرائط وضوابط کے مطابق، ایک متعینہ رقم جمع کرتا رہے گا، اور اس طیے شدہ مدت کے درمیان اگر وہ املاک کسی حادثہ کا شکار ہو جائے، تو انشورنس کمپنی اس کے نقصان کی تلافی کرتی ہے، اور اگر اس مدت میں اس املاک پر کوئی حادثہ نہیں پیش آیا تو وہ جمع شدہ رقم کمپنی واپس نہیں کرتی، بلکہ خود رکھ لیتی ہے۔

اس صورت کا حکم بھی یہی ہے کہ یہ ناجائز ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر چہ سود نہیں آتا؛ کیوں کہ کمپنی کوئی رقم واپس نہیں کرتی، لیکن اس صورت میں قمار پایا جاتا ہے، کیوں کہ املاک کو نقصان پہنچنے اور نہ پہنچنے دونوں کا امکان ہے، اگر نقصان ہوا اور کمپنی نے اس کی تلافی کی تو فائدہ ہو گیا، اور اگر نقصان ہی نہ ہوا اور تلافی کی نوبت ہی نہ آئی تو بیمہ کرانے والے کا نقصان ہوا، اس طرح یہ معاملہ نفع ونقصان کے درمیان دائر ہونے کی وجہ سے قمار میں داخل ہے، علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

لان القمار الذی تارۃ و ینقص اخری و سمی القمار قمارا لان کل واحد من المقامرین ممن یجوز أن یذھب مالہ الی صاحبہ ویجوز أن یستفید مال صاحبہ۔۔۔۔وھو حرام بالنص (۲)

---

(۱) نفائس الفقہ: ۱/ ۲۱۵

(۲) نفائس الفقہ: ۱/ ۲۱۵

البتہ مفتی شبیر احمد صاحب املاک کے بیمہ کے جواز کے قائل ہیں جن کی مفصل تحریر یہ ہے املاک کے بیمہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تین مہینہ کے لیے یا چھ مہینہ کے لیے یا سال بھر کے لیے بیمہ کرایا جائے، مثلاً گاڑی کا بیمہ تین مہینہ کے لیے یا چھ مہینہ کے لیے یا سال بھر کے لیے کمپنی میں متعینہ مدت کے لیے جمع کردی جائے اور مدت کے درمیان اگر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تو جمع شدہ فیس میں سے کوئی پیسہ واپس نہیں ملتا، اسی طرح دوکان یا فیکٹری کا بیمہ کرالیا گیا، اس میں بھی متعینہ مدت میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے تو جمع شدہ فیس میں سے کوئی پیسہ واپس نہیں ملتا ہے، اسی طرح سالہا سال سال گزر جائیں اور پیسہ جمع کرنے کا سلسلہ جاری رہے، تو آخر تک کوئی پیسہ واپس نہیں آئے گا، ہاں البتہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو کمپنی کی طرف سے نقصان کی تلافی کی جاتی ہے، اس کو ہم کمپنی کی طرف سے اپنے ایک آدمی کے لیے تعاون کے درجہ میں سمجھتے ہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی اسکول یا مدرسہ میں ضابطہ ہے کہ سالانہ داخلہ فیس اتنے روپیہ ہے اور ساتھ میں یہ بھی ہے کہ اگر وہ بیمار ہوجائے یا آپریشن ہو، تو اس بیماری کا علاج مدرسہ برداشت کرے گا؛ اس لیے کہ یہ مدرسہ کا ایک فرد بن چکا ہے، اسی طرح املاک کا بیمہ کرنے والا اس کمپنی کا ایک فرد بن چکا ہے اور حوادثات کے موقع پر کمپنی کی طرف سے یہ نقصان کی تلافی خصوصی تعاون ہے، ہاں البتہ حوادث کا پیش آنا ایک امر متردد فیہ اور تعلیق الشئی الخطر ہے؛ اس لیے شبہة القمار کی وجہ سے اصلاً ناجائز ہے، مگر ضرورت کی وجہ سے جائز کہا گیا ہے یہی اس احقر کی بھی رائے ہے؛ اس لیے ہم اس کی گنجائش سمجھتے ہیں اور اس میں کچھ شکلیں ایسی بھی ہیں جن میں تجارتی مال کے خریدار کے پاس پہونچانے کی ذمہ داری بھی بیمہ کمپنی بنتی ہے ایسی صورت میں بیمہ کمپنی ان چیزوں کی شرعاً ذمہ دار بن جائے گی، جیسا کہ شامی کے اس طرح کے جزئیات سے یہ سمجھ میں آتی ہے۔

لأن المال ليس فی يد صاحب السوكرة ؛بل فی يد صاحب المركب ، و ان كان صاحب السوكرة ، هو صاحب المركب يكون أجيرا مشتركا قد أخذ أجرة على الحفظ و على الحمل، وكل من المودع والأجير المشترك لا يضمن مالا يمكن الاحتراز عنه كالموت والغرق و نحو ذلك ، فان قلت: سيأتی قبيل باب كفالة الرجلين ، قال لأخر :اسلك هذا الطريق فانه آمن فسلك و أخذ ماله لم يضمن ، و لو ان كان مخوفا و أخذ مالک فأن ضامن ضمن ، و علله الشارح هناك بأنه ضمن الغار صفه السلامة للمغرور نصاً الخ أي بخلاف الأولی فانه عنص على الضمان بقوله: فانه ضامن۔(۱)

❁ اور مفتی عبدالرحیم لاجپوری قدس سرہ شدید خطرہ کی حالت میں مکان دکان یا فیکٹری کے بیمہ کرانے کی اس شرط کے ساتھ گنجائش دیتے ہیں کہ بیمہ کمپنی میں جو رقم جمع کرائی جاتی ہے اس سے زیادہ جو رقم ملے وہ غرباء اور محتاجوں میں بلا نیت ثواب تقسیم کردی جائے، اپنے کام میں ہرگز استعمال میں نہ لائے۔ کیونکہ آج کل فتنہ وفساد کا زمانہ ہے، آئے دن فساد ہوتے رہتے ہیں اور مکانات، دکانات، کارخانے اور فیکٹریوں کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچایا جاتا ہے اور یہ تجربہ ہے کہ جن مکانات ودکانات وغیرہ کا بیمہ ہوتا ہے ان کو نقصان نہیں پہنچایا جاتا ہے،فسادیوں کی نظر بد سے دکان وغیرہ کی بہ ظن غالب حفاظت ہوجاتی ہے اس لیے قانون فقہ ''الضرر یزال'' کے پیش نظر خطرہ کی چیزوں کا بیمہ کرانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

---

(۱) شامی، کتاب الجهاد، فصل فی استئمار مطلب فیا فیفعله التجار من دفع ما یسمی سوکرة،زکریا:۲۸۱/٦

❁ حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بیمہ اصلاً سود اور جوا ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسے مقام پر اور ایسے ماحول میں ہے کہ بغیر بیمہ کرائے جان و مال کی حفاظت ہی نہ ہوسکتی ہو، یا پھر قانونی مجبوری ہو تو بیمہ کرانا ایسی حالت میں جائز ہے''۔(۱)

❁ اور حضرت مفتی نظام الدین صاحب اعظمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''آج کل کی ملکی حالت کی خرابی اس بات کی متقاضی ہوچکی ہے کہ جان و مال کے بیمہ کی کھلی اجازت دیدی جائے، اس لیے کہ اگر اس سے پورا تحفظ نہ ہو مگر کچھ تو ہوسکتا ہے اور حکومت جو رقم بیمہ کرانے والوں کو دے گی اس کا حکم وہی ہوگا جو پرائیویڈنٹ فنڈ کا ہے اور ہم اس کو شرعاً عطیہ وانعام قرار دیکر جائز قرار دیتے ہیں؛ البتہ پرائیویڈنٹ کمپنی سے ملنے والی رقم ربا یا قمار محض کی حقیقت پر مشتمل ہوگی، اس کی زائد رقم کو سود وقمار کی وبا سے بچنے کی نیت سے تصدق کرنا اور اپنے ملک سے نکالنا ضروری ہے''۔(۲)

❁ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی تحریر فرماتے ہیں:

''املاک کے انشورنس میں کمپنی صرف املاک ضائع ہونے کی صورت میں پیسے ادا کرتی ہے، یہ صورت قمار سے خالی نہیں، لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات یہ ہیں کہ فرقہ پرستوں کی طرف سے مسلمانوں کی جان و مال مستقل خطرے میں ہے اور جان و مال عزت وآبرو کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے، اس سے پہلوتہی کے نتیجے میں نقصان کا تاوان

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ: ۲۴۰/۴

(۲) نظام الفتاویٰ: ۳۶۶/۲

حکومت پر عائد ہوتا ہے، اگر مظلوم سیدھی راہ اپنا حق حاصل نہ کر سکے اور کسی طرح ظالم کی کوئی چیز اس کے پاس آجائے جس سے وہ اپنا حق حاصل کرلے تو یہ جائز ہے، جس کو فقہاء ظفر بالحق سے تعبیر کرتے ہیں، پھر کتاب وسنت کی روشنی میں فقہاء کے یہاں یہ متفقہ اصول ہے کہ شدید ضرورت کی وجہ سے ناجائز چیز جائز ہوجاتی ہے، اس لیے ان تمام حالات اور شریعت کے مزاج اور مذاق اور اصول وقواعد کو سامنے رکھیں تو یہ حالت موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جان ومال کے بیمہ کی گنجائش ہے''۔(۱)

املاک کے بیمہ کے سلسلے میں سب سے پہلے ۱۹۶۵ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے علماء کی ایک نشست میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا، پھر دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء نے دارالعلوم کے مفتیان کرام اور اکابر اساتذہ کے دستخط سے ۱۹۹۰ء میں ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند کے استفساء پر اس کے جواز کا فتویٰ دیا، جسے جمعیۃ علماء ہند نے اپنے مطبوعہ پمفلٹ کے ذریعہ پورے ملک میں پہونچانے کی سعی کی، نیز ۳۰،۱ اکتوبر تا ۲ نومبر ۱۹۹۲ میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے سیمینار منعقدہ اعظم گڑھ یوپی نے ملک کے ۲۵ ممتاز علماء کرام کے دستخط اور اتفاق سے ان خصوصی حالات میں انشورنس کے جواز کا فیصلہ کیا، ان دستخط کنندگان میں دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ ومفتیان دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے ذمہ داران ومفتیان کے علاوہ شمالی اور جنوبی ہند کے متعدد ارباب فتاویٰ ہیں۔(۲)

❁ اس حوالہ سے مفتی کفایت اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) مستفاد جدید فقہی مسائل: ۱/ ۴۳۳، ۴/ ۱۲۱

(۲) مستفاد جدید فقہی مسائل: ۱/ ۴۳۳

''بیمہ کرانا دراصل تو ناجائز ہے مگر اس مجبوری کے عالم میں کہ آس پاس کے دوکانداروں نے بیمے کرار کھے ہیں اور اندیشہ ہے کہ کوئی اپنی دوکان کو قصداً جلا دے بیمہ کرالیا جائے تو مضائقہ نہیں''۔(۱)

اور مفتی جعفر ملی رحمانی صاحب فرماتے ہیں کہ

''محض بغرضِ حفاظت ودفعِ مضرت مسلمانوں کو جب اپنی جان ومال کے ضائع وبرباد ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو بیمہ کرالینا درست ہے۔البتہ پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے قبل ہی انتقال کر جائے یا اپنی مدت پوری کرلے، ان دونوں صورتوں میں جمع کردہ رقم سے زائد رقم کا استعمال نہ وارثین کے لیے درست ہوگا اور نہ ہی بیمہ کنندہ کو، نیز فرماتے ہیں: سرکاری ملازمین کو جبری بیمہ زندگی کی صورت میں حکومت کی طرف سے جو رقم زائد ملتی ہے اسے پراویڈٹ فنڈ پر قیاس کر کے ملازین یا ان کے ورثا کا اسے لینا اور اپنے استعمال میں لانا درست وجائز ہے، نیز کمپنیاں چونکہ خود انشورنس کرتی ہیں اور حمل ونقل کی متعارف اجرت سے زیادہ رقم اس معاہدہ کے ساتھ صاحبِ مال سے وصول کرتی ہے کہ مال کے ضیاع ونقصان کی صورت میں ہم ضمان ادا کریں گے، تو کمپنیوں سے مال کے ضیاع یا نقصان کی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے، چاہے یہ کمپنیاں مسلمانوں کی ہوں، یا غیر مسلموں کی، دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔اس لیے کہ''ردالمحتار'' کی عبارت ہے''ان المودع اذا اخذ اجرة علی الودیعة یضمنها اذا هلکت''(ردالمحتار:۴۳/۴۷۳) جب مودع ودیعت کے رکھنے پر اجرت وصول کرے تو اس کے ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر

(۱) کفایت المفتی:۸/۸۸

ضمان واجب ہوگا‘‘۔(۱)

لیکن مفتی شعیب اللہ خان صاحب اس قول کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس مسئلہ میں میں بعض علماء کو علامہ شامی کی ایک روایت سے دھوکہ لگا ہے، اور انہوں نے املاک کے بیمہ کی ایک تاویل سے اجازت دی ہے، چنانچہ مفتی شبیر احمد صاحب (مفتی دارالاقامہ، مدرسہ شاہی مرادآباد) نے کہا کہ

’’املاک کے بیمہ میں سود نہیں ملتا، البتہ اس میں قمار پایا جاتا ہے، مگر سنگین حالات میں عارضی طور پر ’’الضرورات تبیح المحظورات‘‘ وغیرہ قواعد کے تحت اس کی گنجائش دی جاسکتی ہے، اور نقصانات کی تلافی کے نام سے بیمہ کمپنی جو رقم دیتی ہے، وہ امداد و اعانت کے درجے میں ہوگی، اور اگر بیمہ شدہ اموال و املاک کی حفاظت کی ذمہ داری کمپنی اپنے اوپر لیتی، تو قمار کا شائبہ بھی باقی نہیں رہے گا، اور جمع شدہ رقم اجرت کے حکم میں ہوجائے گی اور نقصانات کی تلافی کی رقم ضمانت و تاوان کے درجے میں ہوکر جائز ہوجائے گی‘‘۔(۲)

اور اس پر علامہ شامی کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے اور وہ یہ ہے:

”وان کان صاحب السوکرۃ ھو صاحب المرکب یکون اجیرا مشترکا (الی قولہ) و لو قال ان کان مخوفا و أخذ مالک فأنا ضامن ضمن“(۳)

خلاصہ ترجمہ: اور اگر بیمہ کمپنی از خود مال پہنچانے کی ذمہ دار ہے تو وہ اجیر مشترک ہوگا (شامی کا قول) اگر خوف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اس

---

(۱) فقہی، فکری و اصلاحی مقالات و مضامین ص: ۱۶، ۱۷ مفتی جعفر ملی رحمانی صاحب

(۲) ایضاح النوادر: ۱/ ۱۴۴، ۱۴۵

(۳) الشامی: ۴/ ۱۷۰

کا ضامن ہوں گا تو ضامن ہو جائے گا۔

مگر احقر کو اس میں کلام ہے، جہاں تک مسئلہ ہے ضرورت شدیدہ کا، تو اس میں اگر واقعی ضرورت کا تحقق ہو جائے تو بے شک فقہی قواعد کی روشنی میں اس کی اجازت ہو سکتی ہے، مگر اصل سوال تحقق کا ہے، اور دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ عارضی گنجائش کب تک ہوگی؟ اس کے حدود کیا ہوں گے؟ اور ظاہر ہے کہ اس کا طے کرنا آسان نہیں۔

اب رہا مسئلہ کہ اگر کمپنی خود مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو، تو جمع شدہ رقم اجرت مان لی جائے گی اور جو اس سے زائد نقصان کی تلافی میں لگا ہے، اس کو تاوان وضمانت قرار دیا جائے، اس میں سے پہلی بات تو صحیح ہے مگر دوسری بات صحیح نہیں، اور نہ یہ علامہ شامی کا قول ہے کہ بلکہ انہوں نے ایک اشکال کے ضمن میں لکھا ہے، اور آگے چل کر اس کی تردید کر دی ہے، ان کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ:

''علامہ شامی نے اولاً بیمہ کی صورت کو جو ان کے زمانے میں ''سوکرہ'' کے نام سے جاری تھی، ناجائز قرار دیا، پھر اس پر ایک اشکال کیا کہ جس کے پاس ودیعت رکھی جائے، وہ اگر اس پر اجرت لے تو ہلاک ہونے کی صورت میں اس پر ضمان آئے گا، اسی طرح بیمہ میں بھی کہا جا سکتا ہے کمپنی جب اجرت لیتی ہے تو ہلاکت کی صورت میں اس پر ضمان آئے گا۔

علامہ شامی نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اگر صاحب السوکرہ (کمپنی) ہی اموال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو تو جمع شدہ رقم کو اجرت قرار دیا جا سکتا ہے، اور وہ کمپنی ''اجیر مشترک'' ہوگی، لیکن اجیر مشترک ان چیزوں کا ضامن نہیں ہوتا جس سے بچنا ممکن نہ ہو، جیسے موت، غرق وغیرہ۔

اس کے بعد پھر ایک سوال قائم کیا کہ ''باب کفالۃ الرجلین'' میں یہ مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ اس راستہ سے جاؤ، یہ راستہ مامون ہے، اور وہ شخص اس راستہ سے گیا اور اس کا مال پکڑ لیا گیا، تو یہ کہنے والا ضامن نہ ہوگا، اور اگر اس نے کہا کہ

”اگر یہ راستہ خوفناک ہوا اور تیرا مال پکڑ لیا گیا تو میں اس کا ضامن ہوں، تو یہ شخص ضامن ہوگا، اور شارح نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس صورت میں اس دھوکہ دینے والے نے صاف طور پر راستہ کے سلامت رہنے کی ضمانت لی ہے، اس لیے اس پر ضمان آئے گا، بخلاف پہلی صورت کے کہ اس میں ”میں ضامن ہوں“ کہہ کر اس نے ضمانت نہیں لی ہے، اور ”جامع الفصولین“ میں لکھا ہے کہ اصل یہ ہے کہ دھوکہ کھانے والا دھوکہ دینے والے سے اس وقت لے سکتا ہے جبکہ دھوکہ آپسی لین دین میں ہو یا دھوکہ دینے والے نے سلامت رہنے کی ضمانت دی ہو، اس کی نظیر یہ ہے جیسے طحان (چکی پیسنے والے) نے گیہوں والے سے کہا کہ گیہوں ڈول میں ڈال دو، اس نے ڈال دیا اور وہ گیہوں سوراخ سے نکل کر پانی میں چلے گیے جبکہ طحان کو اس سوراخ کا علم بھی تھا تو یہ اس کا ضامن ہوگا؛ کیوں کہ اس نے معاملہ میں دھوکہ دیا ہے جبکہ وہ سلامتی کا تقاضا کرتا ہے، خلاصہ یہ کہ جس طرح ان صورتوں میں ضمان آتا ہے اسی طرح بیمہ کی صورت میں بھی ضمان لاگو کیا جاسکتا ہے۔

اس اشکال کا جواب علامہ شامی نے یہ دیا ہے کہ دھوکہ دینے والی صورت میں یہ ضروری ہے کہ دھوکہ دینے والا تو پیش آنے والے خطرہ سے آگاہ ہو، جیسا کہ طحان والا مسئلہ دلالت کرتا ہے، اور دھوکہ کھانے والے کو اس کا علم نہ ہو۔

اس کے بعد علامہ شامی بیمہ کمپنی کے مسئلہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ مخفی نہیں کہ کمپنی دھوکہ دینے کا نہ ارادہ رکھتی ہے اور نہ غرق کا خطرہ پیش آنے سے پہلے اس کو اس کا علم ہوتا ہے، اور رہا چوروں اور ڈاکوں کا خطرہ تو وہ تو سب کو معلوم ہے، کمپنی کو بھی اور بیمہ داروں کو بھی، لہذا یہ مسئلہ سے متعلق نہیں ہے۔(۱)

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ علامہ شامی اس عبارت میں کمپنی پر ضمان کو نادرست قرار دینا چاہتے ہیں، نہ یہ کہ اس کی حمایت کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ سمجھ لیا گیا ہے۔

---

(۱) شامی: ۱۷۰/۴، ۱۷۱

نیز اس سلسلہ میں مولانا کو ایک غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ علامہ شامی کی عبارت میں جو بات بطور اشکال آئی ہے، اس کو علامہ شامی کا "فتویٰ" سمجھ لیا ہے، حالانکہ خود شامی نے اس کی تردید کردی ہے، اور پھر اس عبارت میں "وإن کان مخوفا الخ "جو آیا ہے اس کا ترجمہ یا خلاصہ اس طرح کیا گیا ہے (اگر خوف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں الخ) یہ ترجمہ و مطلب بھی غلط ہے، کیوں کہ یہ "مخوفا "کسی کا حال نہیں، بلکہ یہ "کان "کی خبر ہے اور یہ پورا جملہ "قال "کا مقولہ ہے، یعنی "اگر وہ کہنے والا یہ کہتا ہے کہ "اگر یہ راستہ خوفناک ہو، اور تیرا مال پکڑ لیا گیا تو الخ" "کما لا یخفی علی من امعن النظر "۔(۱)

❁ چند اہم عصری مسائل میں لکھا ہے: "شرعی نقطۂ نظر سے جیون بیمہ کی طرح اشیاء کا بیمہ بھی مفاسد شرعیہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز و حرام ہے، اس میں ایک طرف پریمیم کی طرف سے ادائیگی متیقن ہے اور دوسری طرف کمپنی کی جانب سے ادائیگی موجود ہے اور معلق علی الخطر ہے؛ اس لیے اس میں غرر اور قمار شامل ہے جس کی وجہ سے یہ معاملہ بھی شرعاً ناجائز و حرام ہے"۔(۲)

خلاصۂ بحث: پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ، مفتی نظام الدین صاحب اعظمی رحمہ اللہ، مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ وغیرہ اکابرین ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر ضرورت و حاجت کا درجہ مان کر مجبوراً املاک کے بیمہ کی گنجائش دیتے ہیں، چند اہم عصری مسائل کے حوالہ سے دار العلوم دیوبند اور مفتی شعیب اللہ خان صاحب ایسے ماحول کو ضرورت کا معیار نہ قرار دے کر املاک کے بیمہ کو ناجائز کہتے ہیں۔

جہاز میں روانہ کیے گیے مال کا بیمہ

جو مال جہاز میں روانہ کیا جاتا ہے، اگر مالکِ جہاز اس کا بیمہ کرے، اس طرح

---

(۱) نفائس الفقہ: ۱/ ۲۲۰

(۲) چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۳۲

کہ کرایہ کی اصل مقدار سے دو چند یا سہ چند کرایہ لے کر مال بھرے اور نقصان کا ذمہ دار ہو جائے کہ اگر مال فلاں مقام پر صحیح سالم نہیں پہنچا تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا، تو اس صورت میں جہاز والا اجیر مشترک ہے اور اصل مذہب کے اعتبار سے اجیر مشترک کے ضامن ہونے نہ ہونے کی چار صورتیں بنتی ہیں۔

۱) جب مال کی ہلاکت فعل اجیر سے متعدی ہو۔

۲) جب مال کی ہلاکت فعل اجیر سے بدونِ تعدی ہو۔

۳) جب مال کی ہلاکت بدونِ فعلِ اجیر ہو اور اس سے بچنا ممکن نہ ہو۔

۴) جب مال کی ہلاکت بدونِ فعلِ اجیر ہو اور اس سے بچنا ممکن ہو۔

پہلی دو صورتوں میں امام اور صاحبین رحمہم اللہ تینوں کے نزدیک بالاتفاق ضمان لازم ہوتا ہے۔ تیسری صورت میں بالاتفاق ضمان لازم نہیں ہوتا ہے۔

اور چوتھی صورت میں امام کے نزدیک مطلقاً ضمان لازم نہیں ہوتا جبکہ صاحبین کے نزدیک مطلقاً ضمان لازم ہوتا ہے۔

پس اگر جہاز والے نے ان مذکورہ صورتوں میں سے کسی ایسی صورت (جس کی حقیقت ضمانت ہے) میں بیمہ کیا، تب تو یہ بیمہ جائز ہے، اور اگر ایسی صورت میں بیمہ کیا جس میں جہاز والے کے ذمہ ضمان نہیں ہوتا اس کا بیمہ کرنا جائز نہیں ہے، اور جس صورت میں ضمان کے وجوب اور عدم وجوب میں اختلاف ہے، اس میں چونکہ ضمان کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے اس لیے اگر جہاز والے نے اس صورت میں بیمہ کر لیا تو یہ بھی جائز ہوگا۔(۱)

کاغذات کا بیمہ

اس کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ نے لکھا ہے:

> ''اس کا رواج کچھ قدیم ہے، اسی لیے علامہ ابن عابدین شامی جو متأخرین میں افضل الفقہاء مانے گیے ہیں، انہوں نے اس کا ذکر

(۱) محقق ومدلل جدید مسائل: ۲/۴۴۶-۴۴۵

کتاب الجہاد، باب المستامن میں بنام ''سوکرہ'' کیا ہے، مگر اس کی جو صورت لکھی ہے وہ موجودہ بیمہ سُندات وکاغذات سے کسی قدر مختلف ہے، اور علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے، مگر انہیں کی تحریر سے بیمہ سُندات وکاغذات کی مروجہ صورت کا جواز معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس میں نقل کیا ہے: ''إن المودع إذا أخذ الأجرة علی الودیعة یضمنها إذا هلكت '' (شامی) (یعنی جس شخص کو کوئی سامان بغرض حفاظت دیا جائے اگر وہ اس کی حفاظت کا معاوضہ لیتا ہے ضائع ہوجانے کی صورت میں اس پر ضمان واجب ہوگا) ظاہر ہے کہ محکمہ ڈاک وغیرہ جو سندات وکاغذات وغیر سربمہر کر کے حفاظت کے وعدہ پر لیتا ہے اور اس کی حفاظت کی فیس بھی لیتا ہے، تو ضائع ہوجانے کی صورت میں مذکورہ روایت کی بناء پر ضائع شدہ کاغذات کا ضمان اس پر لازم آئے گا''۔(۱)

محقق ومدلل مسائل جدید مسائل میں لکھا ہے:

''محکمہ ڈاک وغیرہ میں جو سندی کاغذات اور رجسٹری رقم وغیرہ کا بیمہ کرایا جاتا ہے، وہ شرعاً جائز اور مباح ہے اس لیے کہ محکمہ ان کاغذات اور فوٹوں کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہوتا ہے اور وہ اپنی ضمانت میں وہ اشیاء قبضہ میں لیتا ہے اور اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز اور مباح ہے''۔(۲)

ذمہ داریوں کا انشورنس

ذمہ داریوں کے انشورنس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ تعلیم، شادی بیاہ، وغیرہ کی خاطر بچوں کے نام سے ان کے ذمہ دار مثلاً ماں باپ وغیرہ ایک متعینہ مدت کے لیے رقم

---

(۱) رسالہ بیمہ زندگی، مدرجہ جواہر الفقہ: ۲، ۱۸۲، ۱۸۳

(۲) محقق ومدلل جدید مسائل: ۱/ ۳۹۳

جمع کرتے ہیں اور اس پر کمپنی تعلیم یا شادی وغیرہ کی ذمہ داری لیتی ہے، اور اس متعینہ مدت کے بعد کمپنی اپنی اس ذمہ داری کو پورا کردیتی ہے، اور اگر جمع کرنے والوں نے درمیان میں جمع کرنا چھوڑ دیا تو کمپنی جمع شدہ رقم واپس نہیں کرتی۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں سود بھی ہے اور قمار بھی، اس لیے یہ صورت قطعی حرام وناجائز ہے، سود اس لیے کہ اس میں مدت پوری کرنے کے بعد مقررہ رقم ملتی ہے، جو جمع شدہ رقم سے زائد ہوتی ہے اور لوگ اسی کے لالچ میں ذمہ داریوں کا بیمہ کراتے ہیں، اور قمار اس لیے کہ اس میں رقم مدت مقررہ تک جمع کی تو زائد ملتی ہے اور اگر خدانخواستہ مدت مقررہ تک رقم جمع نہ کی گئی تو جو جمع کی ہے وہ بھی سوخت ہوجاتی ہے، لہذا یہ صورت بھی ناجائز وحرام ہے۔

چند اہم عصری مسائل میں لکھا ہے:

''بیمہ کی یہ شکل بھی ناجائز وحرام ہے؛ کیوں کہ اس شکل میں یہ امر موہوم ہے کہ حادثہ ہوگا یا نہیں؟ اور اگر حادثہ ہوگا تو متاثرہ شخص دعوی کرے گا یا نہیں؟ اس میں یہ مذکورہ احتمالات موجود ہیں، اس لیے اس میں غرر پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ قمار بھی ہے؛ کیوں کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے معلق علی الخطر اور موہوم ہے، نیز ملنے کی صورت میں رقم اضافہ کے ساتھ ملتی ہے؛ اس لیے اس میں سود کا عنصر بھی پایا جاتا ہے؛ لہٰذا یہ عام حالات میں جائز نہیں، حرام ہے''۔

اور اسی کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوریؒ نے اشیاء کے بیمہ اور صحت کے بیمہ میں جواز کا فتوی تو نہیں دیا؛ البتہ کمپنی کی جانب سے تعاون قرار دے کر جواز کا رجحان ظاہر فرمایا ہے''۔

''حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب نے مغربی ممالک کے لیے جہاں بسا

اوقات اشیاء کا بیمہ یا صحت بیمہ نہ کرانے سے انسان زبردست مشکل اور پریشانی سے دوچار ہوجاتا ہے اور بغیر اس کے زندگی بہت دشوار ہوگئی ہے ان کے جواز کا فتوی نہ دے کر نہ صرف جواز کی رائے ظاہر کی ہے''۔(۱)

میڈیکل انشورنس

ذمہ داریوں کے انشورنس ہی کے ضمن میں ''میڈیکل انشورنس'' اسکیم بھی آتی ہے جو آج کے دور میں وسیع پیمانے پر پھیل رہی ہے، بالخصوص اس لیے کہ آج کے دور میں بیماریوں کی کثرت وتنوع اور ان کی پیچیدہ صورت حال لوگوں کے لیے زیادہ پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ علاج معالجہ کی نئی نئی صورتوں اور طریقوں اور تشخیص امراض کے جدید آلات ومشینوں نے علاج کو بے حد مہنگا کردیا ہے، اور متوسط طبقے کے لیے اس کا تحمل تقریباً ناقابل تصور ہوتا جارہا ہے، اس صورت حال نے میڈیکل انشورنس اسکیم کو فروغ دینے میں بڑی مدد کی ہے۔

میڈیکل انشورنس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایک سال کی مدت کے لیے طے شدہ ایک رقم پالیسی ہولڈر کو جمع کرنا پڑتا ہے، جس کی وجہ سے انشورنس کمپنی اس سال کے درمیان لاحق ہونے والے بیماری کے علاج کی ذمہ داری لیتی ہے، اور اس کے لیے ایک بڑی رقم دیتی ہے جو معاملہ کے وقت ہی طے کردی جاتی ہے اور اگر وہ شخص اس سال بیمار نہ ہوا تو اس کی جمع شدہ رقم اس کو واپس نہیں کی جاتی ہے۔

اس انشورنس کا حکم بھی واضح ہے اور اوپر بیان کردہ تفصیل کی روشنی میں اس کا جواب یہی ہے کہ یہ حرام وناجائز ہے، کیوں کہ اس میں سود وقمار کی ساری لعنتیں موجود ہیں؛ کیوں کہ اس میں ایک امکانی بلکہ متوہم بیماری پر معاملہ کیا جاتا ہے، جو اگر پیش آجائے تو پالیسی ہولڈر لاکھوں حاصل کرلے گا اور اگر نہ پیش آئے تو جو رقم جمع کی تھی، وہ

---

(۱) چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۳۲-۳۳۴

بھی سوخت ہوگئی، ظاہر ہے کہ یہ خالص قمار ہے اور جو رقم جمع شدہ رقم پر زیادہ ملے گی وہ سود بھی ہے، اس طرح یہ معاملہ سود وقمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بلاشبہ حرام ہے۔

بعض علماء نے اس پر کما حقہ غور نہ کرنے کی وجہ سے اس کے جواز کی طرف اپنے رجحان کا اظہار کیا ہے، اور اس کو تعاون کی ایک شکل قرار دیا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ تعاون کی یہ شکل سود وقمار ہونے کے باوجود جائز کس طرح ہوسکتی ہے؟

البتہ وہ ممالک جہاں میڈیکل انشورنس قانوناً لاگو ہے اور وہاں کے شہریوں یا واردین و صادرین کے لیے لازم کر دیا گیا ہے، وہاں مجبوری کی وجہ سے میڈیکل انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی، اس لیے نہیں کہ یہ جائز ہے بلکہ اس لیے کہ وہ مجبور ہیں اور اس سے بچنا بس میں نہیں، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں:

۱) ایک تو یہ کہ یہ جواز صرف ان کے لیے ہوگا جو مجبور ہیں، اور مجبور یا تو وہ لوگ ہیں جو ان ممالک کے اصل باشندے ہیں یا وہاں ان لوگوں نے بود وباش اختیار کر لی ہے، یا وہ جو کسی شدید حاجت وضرورت کے لیے وہاں جاتے ہیں، اور جو لوگ محض وسیر وتفریح کے لیے ایسے ممالک میں جاتے ہیں وہ اس جواز کے دائرے میں نہیں آتے، لہٰذا ان کو یا تو وہاں جانا نہیں چاہیے یا انشورنس نہیں کرانا چاہیے۔

۲) دوسری بات یہ ہے کہ اگر مجبوری کے تحت ایسے ممالک میں انشورنس کرائے تو لازم ہے کہ اپنی جمع شدہ رقم سے زائد جو کچھ کمپنی کی طرف سے ملے، وہ بلانیتِ ثواب صدقہ کر دے۔ ھذا ما عندی، واللہ اعلم۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اس حوالہ سے رقم طراز ہیں:

''جن ملکوں میں میڈیکل انشورنس کو تمام لوگوں یا کسی خاص پیشہ سے جڑے ہوئے لوگوں کے لیے لازم قرار دیا گیا ہو، ظاہر ہے کہ ان کے لیے انشورنس کرانا قانونی مجبوری کے تحت جائز ہوگا، اب اگر وہ صاحبِ استطاعت ہوں اور خود اپنا علاج کرا سکتے ہوں، ان کے لیے تو انشورنس

کلیم کی صورت میں اتنی ہی رقم جائز ہوگی، جو انہوں نے خود جمع کی تھی، باقی رقم سے استفادہ کرنا جائز نہیں ہوگا اور ضروری ہوگا کہ اسے بلا نیت ثواب صدقہ کردیں اور اگر وہ خود اپنا علاج کرانے سے قاصر ہوں، نہ نقد رقم ہو نہ کوئی ایسا سامان ہو جسے بیچ کر علاج کراسکے، کوئی اور شخص بھی علاج کی ذمہ داری قبول کرنے اور اس میں تعاون کرنے کو تیار نہ ہو تو ایسی انتہائی مجبوری کی صورت میں اس زائد رقم سے بھی علاج کے لیے استفادہ کرنا جائز ہوگا''۔

خلاصہ: (۱) میڈیکل انشورنس (صحت کا بیمہ) کرانا شرعاً ناجائز اور حرام ہے؛ کیونکہ یہ قمار اور سود پر مشتمل ہے، اور یہ دونوں بڑے سنگین گناہ ہیں جن کی حرمت نصِ قطعی سے ثابت ہے۔

(۲) اگر کسی نے لاعلمی میں صحت کا بیمہ کرالیا ہو تو اس پر توبہ واستغفار لازم ہے، اور جمع شدہ رقم سے زیادہ مالیت کے علاج سے مستفید ہونا جائز نہیں؛ کیونکہ یہ سود ہے۔

(۳) میڈیکل انشورنس کا تعلق سرکاری ادارہ سے ہو یا نجی ادارہ سے دونوں صورتوں میں ناجائز ہے، عدم جواز کی علت (سود، قمار) دونوں صورتوں میں موجود ہیں۔

(۴) سرکاری انشورنس ادارہ جو علاج کی ضرورت پر مطلوبہ یا مقررہ رقم دیتا ہے، یہ ایک مخصوص رقم انشورنس ادارہ میں جمع کرنے کے ساتھ مشروط ہے؛ لہٰذا اس کو سرکار کی طرف سے امداد اور تعاون کا درجہ نہیں دیا جاسکتا؛ بلکہ یہ سود ہے جو حرام ہے۔

مغربی ممالک میں صحت کا بیمہ (میڈیکل انشورنس)

اب مغربی ملکوں میں (مغربی ملک سے مراد امریکی طرز کے ممالک ہیں برطانیہ میں عام طور سے علاج بہت آسان ہے اور سستا ہوجاتا ہے لیکن امریکہ وغیرہ میں) صورتِ حال ایسی ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی معمولی سی بیماری میں بھی ہسپتال میں داخل ہونا

پڑا تو اس کا دیوالیہ نکلنے کے لیے اس کا ایک مرتبہ ہسپتال میں داخل ہونا ہی کافی ہے، تو بیماری تو اپنی جگہ پر آئی لیکن ساتھ اتنا بڑا عذاب لے کر آئی ہے کہ ہسپتال کا بل بالکل نا قابلِ تحمل ہوتا ہے، ڈاکٹروں کی فیس نا قابل تحمل ہوتی ہے۔

اب اگرچہ قانونی پابندی نہیں ہے کہ آپ صحت کا بیمہ کرائیں لیکن اس کے بغیر گزارہ بہت مشکل ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اگر برف کی وجہ سے کوئی آدمی گر گیا تو یہ اس کے لیے بڑی زبردست مشکل ہے۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے تو لاکھوں ڈالر دینے پڑتے ہیں۔ اب ایک بیچارہ شخص جو بڑی مشکل سے مہینہ میں ہزار ڈیڑھ ہزار ڈالر کماتا ہے اس کے اوپر اچانک لاکھوں ڈالر کا خرچہ آ جائے تو وہ کہاں سے ادا کرے گا اور بعض اوقات اس میں کوئی جانی بوجھی غلطی بھی نہیں ہوتی۔ رات بھر برف پڑی صبح اس نے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اٹھانے میں آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوگئی اور اس پر سے کوئی شخص پھسل گیا اور اس کے نتیجہ میں لاکھوں ڈالر کا خرچہ آ پڑا۔

اسی طرح مسجدوں میں بھی یہی ہو رہا ہے کہ مسجدوں کے کناروں میں برف جم گئی اور کوئی شخص آ کر اس میں گر گیا، اور اس نے دعویٰ کر دیا تو مسجد پر لاکھوں ڈالر کی مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے، تو یہ وہ مواقع ہیں جہاں بیمہ اگرچہ قانوناً تو لازم نہیں ہے لیکن اس کے بغیر زندگی بڑی دشوار ہوگئی ہے۔(۱)

میڈیکل انشورنس کا متبادل

اس کی جائز متبادل صورت یہ ہے کہ اجتماعی نظام قائم مقام کیا جائے، جہاں امارت شرعیہ قائم ہو، اور امیر شریعت کے تحت بیت المال کا نظام چل رہا ہو وہاں بیت المال کے نظام کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کیا جائے، زکوۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی رقم بیت المال میں جمع کی جائیں، بلکہ اصحابِ خیر حضرات عطیات کی رقم سے اس طرح کے علاج کے لیے علاحدہ سے بیت المال میں فنڈ قائم کرائیں اور اس فنڈ کے ذریعہ غریبوں کی مدد

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۳/ ۳۱۷

کی جائے، جیسا کہ امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ کے بیت المال سے حسبِ گنجائش مریضوں کی مدد کی جاتی ہے، اور جہاں امارت شرعیہ قائم نہ ہو اور اس کے تحت بیت المال کا نظام نہ چل رہا ہو وہاں پر مسلمان باہمی اتحاد واتفاق سے اجتماعی نظام قائم کریں اور غریبوں کے علاج کے لیے فنڈ قائم کر کے صدقات واجبہ وصدقات نافلہ اور عطیات کی رقوم اکٹھا کر کے غریبوں کی مدد کریں، اس اجتماعی نظام میں علماء کی شمولیت بھی ضروری ہے، تا کہ ہر رقم اس کے مصرف پر صرف ہو سکے، اور غیر شرعی مصارف سے اجتناب کیا جا سکے۔(۱)

اکیڈمی کا فیصلہ:

میڈیکل انشورنس، انشورنس کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح بلاشبہ مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہے لہٰذا عام حالات میں میڈیکل انشورنس ناجائز ہے اور اس حکم میں سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اگر قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس لازمی ہو تو اس کی گنجائش ہے، لیکن جمع کردہ رقم سے زائد جو علاج میں خرچ ہو صاحبِ استطاعت کے لیے اس کے بقدر بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

موجودہ مروج انشورنس کا متبال اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ممکن ہے اور آسان صورت یہ ہے کہ مسلمان ایسے ادارے ونظام قائم کریں جن کا مقصد علاج ومعالجہ کے ضرورتمندوں کی ان کی ضرورت کے مطابق مدد کرنا ہو۔(۲)

گروپ انشورنس

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ''گروپ انشورنس'' کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ ''گروپ انشورنس'' کے قواعد وضوابط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس اسکیم میں ہر ملازم کی

(۱) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ۳۲۲

(۲) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص ۲۲۲

تنخواہ سے جبری طور پر کٹوتی وصول کی جاتی ہے، اگر چہ محکمہ والوں کے لیے ایسا کرنا درست نہیں؛ لیکن جن ملازمین کی تنخواہ سے یہ جبراً رقم وصول کی گئی اگر انہیں یہ رقم واپس نہ ملے تو محکمہ والوں کی طرف شرعاً ''غصب'' ہوگا اور اگر کسی حادثے کی صورت میں کوئی بڑی رقم اصل رقم سے زائد دی گئی تو یہ پراویڈیٹ فنڈ کی زیادتی کی طرح سود شمار نہ ہوگی، کیوں کہ دین ضعیف پر زیادتی ہے، مرحوم کے وارثان کے لیے اسے وصول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ جو رقم اصل کٹوتی سے زائد وصول ہوئی ہے، اسے صرف غریبوں پر خرچ کیا جائے خواہ رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔(۱)

اگر کوئی انشورنس پالیسی شروع کر چکا ہو

اگر کوئی شخص انشورنس پالیسی کی کچھ قسطیں ادا کر چکا ہو یا فینانس پر گاڑی لے کر کچھ اسٹالمینٹس ادا کر چکا ہو، اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ استغفار کرتے ہوئے باقی قسطیں ادا کردے، تاکہ اس کا ادا کردہ پیسہ ضائع نہ ہو، جب بھی اسے انشورنس کا پیسہ سود کے ساتھ ملے گا تو اپنی جمع کردہ سے زائد رقم بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردے، چونکہ شرعی قاعدہ ہے: الضرورات تبیح المحظورات ۔(ضرورتیں ممنوعات کو مباح کرتی ہیں) اگر باقی قسطیں ادا کرے بغیر ادا کیے ہوئے پیسے اسے مل سکتے ہیں تو قسطیں ادا کرنا چھوڑ دینا چاہیے۔(۲)

اگر بیمہ کرانا قانوناً ضروری ہو تو؟ (تھرڈ پارٹی انشورنس)

بیمہ اگر چہ اصلاً تو ناجائز ہے لیکن بعض شعبہ ہائے زندگی میں بیمہ قانوناً لازم ہوگیا ہے، اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا، مثلاً گاڑی ہے، موٹر سائیکل ہے یا کار ہے، اس کا تھرڈ پارٹی انشورنس کرائے بغیر آپ موٹر سائیکل یا کار سڑک پر نہیں لاسکتے اور اگر کسی وقت آپ کی کار کا تھرڈ پارٹی انشورنس نہیں ہوا یعنی مسئولیات والا بیمہ نہیں ہوا تو پولیس

---

(۱) فتاویٰ عثمانی: ۳۳۶/۳

(۲) حوالہ سابق: ۷۶

والا چالان کر کے آپ کی کار ضبط کر لے گا، یہ پاکستان میں بھی اور ساری دنیا میں یہ قانوناً لازمی ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا نہیں ہے کہ تھرڈ پارٹی انشورنس لازمی نہ ہو، تو یہ انشورنس قانوناً لازمی ہے، تو اب جہاں ہمیں قانون نے مجبور کر دیا تو اگرچہ کار یا موٹر سائیکل چلانا کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے کہ آدمی وہ نہ کرے تو مر ہی جائے لہٰذا وہ ضرورت اور اضطرار کی حد میں داخل نہیں ہوتا لیکن حاجت ضرور ہے اور اس کے بغیر حرجِ شدید ہے۔(۱)

- فتاوی دار العلوم میں لکھا ہے:

"گاڑی چلانے کے سلسلے میں ہندوستان کا داخلی ملکی قانون یہ ہے کہ بغیر انشورنس کے گاڑی کو روڈ پر چلانا جرم ہوتا ہے؛ اس لیے مجبوراً اس طرح کا انشورنس کرا لینے کی اجازت ہوگی اور ایسا انشورنس کرانے میں حادثہ کے پیش آجانے کی شکل میں گاڑی کا نقصان ہو جانے کی وجہ سے اگر معاوضہ ملے تو اس شخص کے لیے صرف جمع کردہ رقم کے بقدر کا استعمال کرنا جائز ہوگا، زائد رقم کے استعمال کی اجازت نہ ہوگی"(۲)

- جدید فقہی مباحث میں ہے:

"......غرض یہ کہ تھرڈ پارٹی موٹر انشورنس موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت اور جائز نوعیت کا معاملہ ہے اگرچہ اس کے نظام میں فاسد اجزاء بھی شامل ہو گئے ہیں، جس کا گناہ ان لوگوں کے سر ہے جو اس نظام کو چلاتے ہیں"(۳)

- فتاوی دار العلوم زکریا میں ہے:

---

(۱) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۳۱۶/۳

(۲) چند اہم عصری مسائل: ۳۳۲/۱

(۳) جدید فقہی مباحث: ۲۹۶/۲

''اس معاملہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں سود کا پہلو نہیں ہے اس وجہ سے کہ انشورنس کمپنی رقم ادا نہیں کرتی؛ بلکہ دوسرے کی گاڑی ٹھیک کرا دیتی ہے تو یہ خدمت کا معاوضہ ہے، ہاں! اس میں غرر موجود ہے اس طور پر کہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کار کا ایکسیڈنٹ نہ ہو تو ایک طرف ادائیگی یقینی ہے اور دوسری طرف یقینی نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غرر یسیر ہے جو مفضی الی النزاع نہیں ہے، اور فقہاء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں غرر یسیر برداشت ہے، مفسدِ عقد نہیں ہے'' (۱)

اس حوالہ سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب رقم طراز ہیں:

- اگر گاڑی اور گھروں کے لیے حکومت کی جانب سے انشورنس کو لازم قرار دیا گیا ہو تو انشورنس کرانے کی گنجائش ہوگی اور اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو پالیسی لینے کے بعد سے اب تک جتنی رقم اس نے جمع کی ہے وہ تو اس کے لیے جائز ہوگی، اور بقیہ رقم کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا واجب ہوگا، نیز اس کے لیے یہ بھی گنجائش ہے کہ اس رقم کو محفوظ کر کے انشورنس کی آئندہ قسطیں اس رقم میں سے ادا کرتا جائے۔

جو رقم اس نے جمع کی تھی، اتنی رقم اس کے لیے اس لیے جائز ہوگی کہ وہ خود اس کی جمع کی ہوئی حلال رقم ہے، زائد رقم کو صدقہ کر دینا اس لیے واجب ہے کہ مال حرام اگر مالک کو لوٹایا نہ جاسکتا ہو، تو اس کا حکم یہی ہے کہ اسے صدقہ کر دیا جائے اجر و ثواب کی نیت اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا صدقة من غلول'' (ترمذی) اور بچی ہوئی رقم محفوظ کر کے اس سے قسطیں ادا کرنا اس لیے درست ہے کہ یہ مال حرام صاحب مال کی طرف واپس لوٹانا ہے اور مالِ حرام کا فقہاء نے یہی حکم لکھا ہے''۔

---

(۱) فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/۴۵۹

❁ اگر گاڑی کا انشورنس کرایا جائے اور یہ انشورنس اس شخص سے متعلق ہو، جسے ایکسیڈنٹ سے نقصان پہنچے تو چوں کہ ایکسیڈنٹ میں بڑی رقمیں ادا کرنی پڑتی ہیں، جو بعض اوقات متوسط آمدنی کے لوگوں کے لیے دشوار ہوتی ہیں؟ اس لیے اگر کوئی شخص ایسے واقعہ سے دو چار ہو اور قانون کے تحت جو جرمانہ اس پر عائد ہوتا ہو، وہ اس کے ادا کرنے کی گنجائش نہیں رکھتا ہو، تو اس کے لیے انشورنس کی اس رقم سے استفادہ کرنا اور کمپنی سے متأثرہ شخص کو ہرجانہ دلانے کی گنجائش ہے؛ البتہ جو لوگ صاحب استطاعت ہوں اور وہ جرمانہ ادا کر سکتے ہوں، ان کے لیے کمپنی کی رقم سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔(۱)

بعض جگہ صورتحال ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ اگر چہ قانوناً انشورنس لازمی نہیں لیکن انشورنس کے بغیر زندگی انتہائی دشوار ہوگئی ہے جیسا کہ آج مغربی ملکوں میں صحت کا بیمہ چلا ہے، یہ مسئولیات کے بیمہ کی ایک قسم ہے، یعنی آپ بیمار ہوگئے اور آپ کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑ گیا تو اس صورت حال میں ہسپتال کا بل انشورنس کمپنی ادا کرتی ہے۔ اس کے لیے آپ پریمیم (premium) دیتے ہیں، مثلاً ہر مہینہ سو روپے دیتے ہیں اور بیمہ کمپنی اس کے بدلے میں بیماری کی صورت میں علاج کا انتظام کرتی ہے اور سارا خرچہ برداشت کرتی ہے۔(۲)

انشورنس میں سود لیے بغیر شرکت کا حکم

ایک سوال اس سلسلہ میں یہ کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص انشورنس کے معاملے میں سود سے بچ رہا ہے، اور صرف اپنی اصل رقم کی واپسی چاہتا ہو تو کیا یہ معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

اس بارے میں ایک تو اس پر غور کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص اس معاملہ میں سود لینے

---

(۱) مستفاد: مسلمانانِ کناڈا کے بعض مسائل، ص: ۹۱-۹۲

(۲) اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۳/۳۱۷

سے محترز رہا یعنی بچا رہا تو وہ اس برائی و مفسدہ سے بچ تو گیا، لیکن جب اس کو یہ معلوم ہے کہ اس کا اس معاملہ میں لگایا ہوا روپیہ، سودی کاروبار میں لگایا جاتا ہے، تو یہ سودی کاروبار میں تعاون ہوا، اور یہ بھی ناجائز ہے؛ کیوں کہ اسلام میں حرام کام کا تعاون بھی حرام ہے، درمختار ہے:

"ویکرہ تحریما بیع السلاح من أهل الفتنة، إن علم لأنه اعانة علی المعصیة، و بیع ما یتخذ منه کالحدید و نحوه یکره لأهل الحرب لا لأهل البغی لعدم تفرغهم لعمله سلاحًا" (۱)

اور اوپر وہ حدیث گزر چکی ہے جو میں سود لینے، سود دینے اور اس پر گواہ بننے اور اس کا حساب لکھنے کو ایک ہی درجہ کا گناہ قرار دیا گیا ہے، جب گواہ بننا اور حساب لکھنا بھی تعاون ہے جو حرام میں داخل ہو جاتا ہے، تو جانتے بوجھتے، اپنا روپیہ ایسے لوگوں کے حوالہ کرنا جو اس کو سود پر لگاتے ہوں، کیوں کر تعاون حرام نہ ہوگا؟ اس لیے سود لیے بغیر بھی اس معاملہ میں شرکت ناجائز ہوگی۔

اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنا ہے کہ اس معاملہ میں قمار بازی بھی ہے، اگر سود نہ لیا جائے تو ایک گناہ ختم ہوا، مگر قمار بازی بھی خود ایک مستقل گناہ ہے، اس کا کیا ہوگا؟ بخاری کی ایک حدیث میں ہے: "من قال لصاحبه تعال أقامرك فلیتصدق" (جس نے اپنے ساتھی سے یہ کہا کہ چل ہم قمار بازی کریں گے، تو اس کو چاہیے کہ صدقہ کرے۔ (۲)

جب کسی سے صرف یہ کہنا کہ چلو، جوا کھلیں، موجبِ تصدق ہے، تو خود قمار بازی کا کیا حال ہوگا؟ لہٰذا سود لیے بغیر بھی اس میں شرکت سود کی وجہ سے ناجائز ہوگی، ایک تو اس لیے کہ اس میں شرکت سودی کاروبار کے تعاون کا ذریعہ ہے اور دوسرے اس لیے کہ

---

(۱) درمختار: ۲۶۸/۴

(۲) بخاری: ۴۴۸۲، مسلم: ۳۱۰۷

اس میں قمار بازی کا گناہ ہے۔(۱)

ٹیکس سے بچنے کے لیے انشورنس کرانا

اگر جیون بیمہ کرانے سے واقعۃً ٹیکس کی بچت ہوتی ہے تو اس کے جواز کی گنجائش ہے، مگر وہ رقم استعمال کرنا کسی بھی حال میں جائز نہ ہوگا، اس کو بلانیتِ ثواب فقراء میں تقسیم کردیا جائے۔(۲)

انشورنس کی رقم سے ٹیکس کی ادائیگی

جواہر الفقہ کے حوالہ سے چند اہم عصری مسائل میں لکھا ہے:

''اگر حکومت نے غیر شرعی ٹیکس عائد کردیا ہو اور بیمہ کرانے والا ادارہ سرکار کے ہاتھ میں ہو، پرائیویٹ کمپنی کے ذمہ نہ ہو تو پھر سرکاری ٹیکس کی ادائیگی بیمہ میں ملنے والی اضافہ رقم سے کرسکتے ہیں، خواہ اس رقم کے حصول کا ذریعہ ربا کے عنوان میں آتا ہو'' (جواہر الفقہ: ۲/ ۲۸۷)

اور امداد المفتیین کے حوالہ سے لکھا ہے:

''اگر غیر شرعی ٹیکس حکومت کو ادا کرچکا ہے تو سرکاری بینک یا دوسرے سرکاری محکمات سے ملنے والے سود کی رقم سے ٹیکس میں ادا کردہ رقم کے بہ قدر لے سکتے ہیں، لینے والے کے حق میں وہ سود نہ ہوگا'' (امداد المفتیین: ۲/ ۸۵۱)۔(۳)

حادثہ کے متاثرین کا انشورنس کمپنی سے معاوضہ لینا کیسا ہے؟

گاڑی ڈرائیور کے چلانے سے چلتی اور حرکت کرتی ہے، بذاتِ خود اس کے اندر چلنے کی صلاحیت نہیں ہے، جیسا کہ جانوروں میں ہوتا ہے؛ اس لیے گاڑی کی حرکت

---

(۱) نفائس الفقہ: ۱/ ۲۱۵، ۲۲۵

(۲) محقق ومدلل جدید مسائل: ۱/ ۳۹۳

(۳) چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۲۳۹، نیز دیکھیے: محقق ومدلل جدید مسائل: ۱/ ۳۹۳

اور اس سے پیش آنے والے حوادث کی نسبت ڈرائیور کی طرف ہوگی؛ لہٰذا کار حادثہ کی وجہ سے اگر کوئی شخص مرجاتا ہے یا اس کو زخم لاحق ہوتا ہے تو شرعاً ڈرائیور کو خطا قتل کرنے یا زخمی کرنے کا ملزم قرار دیا جائے گا "تکملہ فتح الملھم" میں ہے:

والظاهر ان سائق السيارة ضامن لما اتلفته من القُدام او من الخلف، ووجه الفرق بينها وبين الدابة على قول الحنفية ان الدابة متحركة بارادتها فلاتنسب نتحتها الى راكبها بخلاف السيارة؛ فإنها لاتتحرك بارادتها، تُنسب جميع حركاتها إلى سائقها فيضمن جميع ذلك (۱)

لہٰذا حادثوں میں ہلاک ہونے والوں کے ورثاء یا اس میں زخم خوردہ لوگ معاوضہ کا مطالبہ کرسکتے ہیں؛ لیکن قتل خطا میں معاوضہ و دیت کی ادائیگی شرعاً تنہا قاتل پر لازم نہیں ہوتی؛ بلکہ عاقلہ پر ہوتی ہے، اور شرعی اعتبار سے ملزم کے عاقلہ وہ لوگ ہوں گے جن کے ساتھ اس کا تناصر وتعاون کا تعلق ہو مثلاً ہم پیشہ افراد، اہل قبیلہ برادری کے لوگ:

"والعاقلة اهل الديوان ان كان القاتل من الديوان يؤخذ من عطاياهم فى ثلاث سنين ومن لم يكن من اهل الديوان فعاقلته قبيلته؛ لان نصرته بهم، وهى المعتبرة فى التعاقل"(۲)

لیکن غیر اسلامی ممالک میں قوانین اسلامیہ نافذ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر عمل بہت مشکل ہے، اس لیے اس طرح کے ممالک میں توجیہ ہوسکتی ہے کہ انشورنس کمپنی کو ملزم کے عاقلہ کے قائم مقام سمجھا جائے، اس کو عاقلہ بنانے کے لیے جو عقد ناجائز کیا گیا وہ دونوں کا اپنا عمل ہے جس کے وہ خود ذمہ دار ہیں، لیکن جب عرفاً و قانوناً وہ عاقلہ کے قائم

---

(۱) تکملة فتح الملهم: ۲/ ۳۱۰، کتاب الحدود

(۲) الهدايه: ۷/ ۶۴۵

مقام بن گئی تو اس سے وصول کرنے کی بھی گنجائش ہے، کفار چونکہ مخاطب بالفروع نہیں ہوتے اس لیے انشورنس کمپنی کے اموال کے اکثر حصہ کا عقودِ فاسدہ کے ذریعہ حاصل ہونے کی بنیاد پر حرام ہونا، اس سلسلے میں مانع نہ بنے گا۔(۱)

انشورنس کی رقم مالک کی وفات کے بعد

انشورنس سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کی حیثیت کیا ہوگی؟ تو اگر اس نے انشورنس کے لیے کسی کو نامزد نہ کیا ہو تو اس کی حیثیت اس کی موت کے بعد ترکہ کی ہوگی اور تمام ورثہ کا اس سے متعلق ہوگا، اور اگر اس نے کسی شخص کو نامزد کیا ہو تو اس کی حیثیت وصیت کی ہوگی اور اس پر وصیت کے احکام جاری ہوں گے۔

انکم ٹیکس سے بچانے کے لیے LIC بیمہ نکلوانا؟

حکومت انکم ٹیکس چوں کہ جبراً وصول کرتی ہے، لہذا انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے جیون بیمہ کی گنجائش ہوگی؛ البتہ بیمہ کی وجہ سے جو زائد رقم حاصل ہوگی اس کو بلا نیت ثواب غریبوں کے درمیان صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔(۲)

مفتی حبیب الرحمن صاحب فرماتے ہیں:

> ”اگر کوئی ٹیکس کم کرانے اور جائز آمدنی کو بچانے کے لیے بیمہ کراتا ہے جب کہ گورنمنٹ بیمہ کرانے پر ٹیکس کم لیتی ہو تو وہ بیمہ کرا سکتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ جو رقم زائد ملے گی اسے غریبوں میں اور محتاجوں میں تقسیم کر دے گا، ایسے ہی اگر سرکاری ملازم کے لیے بیمہ کرانا لازمی ہو اور اس کے بغیر اس کی ملازمت برقرار نہ رہ سکتی ہو تو اس کو بیمہ کرنا جائز ہے، البتہ جمع کی ہوئی رقم سے زائد جو رقم ملے اس کے جوا اور سود ہونے

---

(۱) چند اہم عصری مسائل: ۲/ ۲۸۳

(۲) کتاب النوازل: ۱۱/ ۴۸۱

کی وجہ سے غریبوں اور مسکینوں پر بلا نیت ثواب صدقہ کر دے''۔(۱)

مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب قدس سرہ بھی اپنی جائز کمائی کو بچانے کے لیے انھی شرائط کے ساتھ انشورنس کرانے کی اجازت دیتے ہیں۔(۲)

مولونا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں:

''اگر انشورنس کی وجہ سے انکم ٹیکس سے گورنمنٹ چھوٹ دیتی ہے ہوتو انکم ٹیکس سے بچنے کی نیت سے انشورنس کرایا جاسکتا ہے، البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جتنی رقم خود اس نے جمع کی ہے، اتنی تو اس کے لیے حلال ہے اور کمپنی جو اضافی رقم دے وہ اس کے لیے جائز نہیں، اس کو بلا نیت صدقہ غرباء یا رفاہی کاموں میں خرچ کر دینا چاہیے''۔(۳)

ایل آئی سی میں ایجنٹ بننا

ایل آئی سی کمپنی میں سودی کاروبار ہوتا ہے، اس کا ایجنٹ بننا گویا سودی کاروبار کا تعاون ہوگا، لہٰذا ایل آئی سی کمپنی کا ایجنٹ بننا، اور اس کو ذریعہ معاش بنانا، اور اس پر کمیشن لینا، یہ سب از روئے شرع ناجائز اور حرام ہے۔(۴)

بونس کا نام دیکر بیمہ زندگی کرانا

بیمہ میں سود کی رقم خواہ کسی نام سے دی جائے وہ سود ہے، نام بدلنے سے سود کا حکم نہیں بدلے گا، اور زندگی کا بیمہ بدستور ناجائز اور حرام رہے گا۔(۵)

---

(۱) مسائل سود: ۲۴۲، بحوالہ سابق

(۲) فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۳۰۳

(۳) جدید فقہی مسائل: ۱/ ۲۹۲

(۴) مستفاد: فتاویٰ قاسمیہ: ۲۰/ ۴۲۴، ۴۳۰، محقق ومدلل جدید مسائل ۲/ ۴۴۲، فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۶۴

(۵) کتاب النوازل: ۱۱/ ۴۹۳

حج کمیٹی کا حجاجِ کرام کا بیمہ کمپنی سے بیمہ کرانا

حج کمیٹی حجاج کرام کا ایک سالہ بیمہ کمپنی سے کراتی ہے، جو دولاکھ روپیہ کا ہوتا ہے، محفوظ واپسی پر کچھ نہ دیکر کسی حادثہ میں دورانِ حج فوت ہونے پر دولاکھ روپیے ورثہ کو بیمہ فنڈ سے دیتی ہے، تو ایسی صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ رقم ورثہ کو لینا جائز ہے؟ اور اس رقم کو مرحوم حاجی کے نام سے مسجد یا مدرسہ میں لگانا درست ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ جو معاملہ بیمہ کمپنی سے ہو رہا ہے، اس میں حاجی کا کوئی دخل نہیں، اس کی ساری ذمہ داری حج کمیٹی پر ہے اور نہ کوئی حاجی قصداً بیمہ کمپنی کو کوئی رقم دیتا ہے، اس سے جو رقم لی جاتی ہے وہ کرائے اور ضروری دفتری اخراجات کے لیے ہوتی ہے، لہٰذا اس ناجائز معاملہ کا ذمہ دار حاجی نہ ہوگا اور حادثہ کی صورت میں حج کمیٹی کی طرف سے جو رقم دی جاتی ہے وہ کمیٹی کی طرف سے تبرع واحسان سمجھا جائے گا، اور اس کا لینا جائز ہوگا، ہاں اگر بیمہ اختیاری ہو لازمی نہ ہو تو پھر حاجی خود معاملہ کرنے والا ہوگا اور اس کے لیے یہ عمل جائز نہ ہوگا۔(۱)

کمپنی کا ازخود اپنے ملازمین کے لیے انشورنس کرانا

بڑی کمپنیاں اپنے ملازمین کو انشورنس فراہم کرتی ہیں؛ لیکن اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کمپنی اپنے ملازمین کی جانب سے کسی اور انشورنس کمپنی سے معاملہ کرتی ہے، اور انشورنس کمپنی کو دی جانے والی رقم کا کچھ حصہ بعض اوقات ملازمین سے بھی لیا جاتا ہے تو کیا اب اس انشورنس سے استفادہ کرنا درست ہے؟

تو اس حوالہ سے مفتی سلمان منصور پوری صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: اپنی مرضی سے لائف انشورنس کرانا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر کوئی کمپنی ملازمین کی مرضی کے بغیر لازمی طور پر انشورنس کرائے اور یہ طے کرے کہ ضرورت کے وقت کمپنی

---

(۱) کتاب النوازل: ۱۱/۴۹۱، نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ رحیمیہ: ۵/۳۱۲

اس ملازم کا مالی تعاون کرے گی، تو انجام کار اس انشورنس سے استفادہ کی گنجائش ہونی چاہیے، گویا یہ بھی اجرت کے حصہ میں شامل ہے، اور قانون وضابطہ مقرر ہونے کی وجہ سے جہالت ایسی نہیں ہے جو مفضی الی النزاع ہو، تاہم اس معاملہ میں دیگر علماء ومفتیان سے رجوع کرلیا جائے۔(۱)

اس سلسلہ میں دار العلوم دیو بند کا فتویٰ بھی جواز کا ہے، تحریر ملاحظہ ہو:

جب آپ خود کوئی رقم انشورنس کمپنی کو نہیں دیتے اور نہ ہی اپنی کمپنی سے انشورنس کرانے کا کوئی معاملہ کرتے ہیں؛ بلکہ آپ کی کمپنی ازخود لائف انشورنس کمپنی میں آپ کی طرف سے رقم جمع کردیتی ہے جس کا فائدہ بعد میں آپ کی فیملی کو حاصل ہوگا تو آپ کی فیملی کے لیے اس رقم کا لینا درست ہوگا۔(۲)

اگر کوئی کمپنی یا ادارہ اپنے ملازمین وممبران کے صحت کا بیمہ اپنے تئیں ازخود کرلے اور بیماری کی صورت میں علاج کی ذمہ داری لے لے، ملازم اور ممبر نے انشورنس کا معاملہ نہ کیا ہو تو یہ ناجائز بیمہ کی شکل نہیں ہے؛ بلکہ کمپنی کی طرف سے اسے تعاون اور عطیہ سمجھا جائے گا؛ لہٰذا اس کی فراہم کردہ سہولت سے استفادہ کرنا حلال ہوگا؛ کیوں کہ ملازم نے خود کوئی معاملہ ومعاہدہ نہیں کیا، ہاں! اگر صحت کے بیمہ کے عنوان سے کمپنی اپنے ملازمین سے ان کی مرضی سے کچھ پیسے کاٹ لیتی ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ طبی سہولیات فراہم کرتی ہے تو پھر اپنی جمع کردہ رقم سے زائد سہولیات سے فائدہ اٹھانا شرعاً ناجائز ہوگا؛ کیوں کہ یہ شکل میڈیکل انشورنس کی ناجائز صورت میں داخل ہے۔(۳)

فتاویٰ دار العلوم زکریا میں ہے:

”موجودہ دور میں جبکہ انشورنس کے بغیر ملازمتوں کا ملنا اور اگر ملازمت

---

(۱) حوالہ سابق

(۲) چند اہم عصری مسائل: ۲/ ۲۸۲

(۳) تفصیل کے لیے دیکھیے: چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۳۴

ہے تو اس کا باقی رہنا ناممکن سا ہوگیا ہے، اسی طرح آئے دن فسادات کی وجہ سے مسلمانوں کا جو مالی نقصان ہوتا ہے، نیز حکومت کے قانون کے مطابق ملازمتوں میں زندگی کا بیمہ لازم کردیا گیا ہے جس کے بغیر یا تو ملازمت کا استحقاق نہیں ہوتا یا اگر ہو تو بقاء ودوام نہیں رہتا، اس لیے مجبوری کی صورت میں اس قسم کے انشورنس کی اجازت ہوگی، چنانچہ بعض اہل علم نے اپنے فتاوی میں اس کی تصریح فرمائی ہے، ہاں! دل سے اس کو بُرا سمجھتے ہوئے توبہ اور استغفار بھی کرتا رہے۔

پھر انشورنس کی وہ صورت جس میں از خود رقم جمع کرائی ہے اس پر جو زائد رقم حاصل ہو اس کو اپنے استعمال میں لانا درست نہیں؛ بلکہ ثواب کی نیت کے بغیر فقراء پر صدقہ کردیا جائے، ہاں! انشورنس کی وہ صورت جس میں کمپنی تنخواہ سے ایک حصہ ملازم کے اختیار کے بغیر کاٹ لیتی ہے اور پھر اس سے زائد رقم ادا کرتی ہے یہ سود نہیں ہے اس رقم کا استعمال جائز اور درست ہے" (۱)

بیمہ کا متبادل

یہ ثابت ہوجانے کے بعد کہ تجارتی بیمہ جائز نہیں ہے خواہ اس کی کوئی صورت ہو اب اس کا متبادل کیا ہو؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بیمہ کا متبادل ایک تو تعاونی بیمہ ہے جسے انگریزی میں (Mutual Insurance) کہتے ہیں، جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا، اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں، پھر سال کے ختم پر جو رقم بچ جائے اسے شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کردی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ میں بطور چندہ دوبارہ رکھدی جاتی ہے۔

---

(۱) فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۵۵

اس کے علاوہ اب عالم اسلام کے کئی ملکوں میں ''شرکات التکافل'' کے نام سے کچھ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں، جنہیں تجارتی بیمے کے طور پر قائم کیا گیا ہے ان کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر بیمہ دار کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوتا ہے، کمپنی اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں اس کا نفع اپنے شیئر ہولڈرز میں تقسیم بھی کرتی ہے اور کمپنی ہی کے ایک ریزرو فنڈ (Reserve fund) سے بیمہ داروں کے نقصانات کی تلافی بھی کرتی ہے۔(۱)

بیمہ کے صحیح متبادل کے حوالہ سے مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں:

۱) بیمہ پالیسیوں کی حاصل شدہ رقوم کو مضاربت (مشترک کاروبار) کے شرعی اصول کے مطابق تجارت میں لگایا جائے عام تجارتی کمپنیوں کی طرح تجارتی منافع شرکاء (پالیسی خریداروں) میں تقسیم کیا جائے، نقصان سے بچنے کے لیے عام لمیٹیڈ کمپنیوں کی طرح کڑی نگرانی اور پوری نگہداشت رکھی جائے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے۔

مگر یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک سود خوری کی خود غرضانہ اور غیر منصفانہ عادت کو گناہ عظیم نہ سمجھا جائے گا کہ دوسرے کا چاہے سارا سرمایہ ضائع ہوجائے ہمارا اپنا رأس المال (اصل سرمایہ) مع نفع کے اس سے وصول ضرور ہوجانا چاہیے، یہی وہ منحوس چیز ہے جس کے سبب نص قرآنی کے مطابق سود کا مال اگرچہ گنتی میں بڑھتا نظر آتا ہے مگر معاشی فوائد کے اعتبار سے وہ برابر گھٹتا اور مٹتا جاتا ہے اور انجام کار عام تباہی کا سبب بن جاتا ہے اور یہ گنتی کے اعتبار سے بڑھوتری بھی پوری قوم سے سمٹ کر چند افراد یا خاندانوں میں محدود ہوجاتی ہے ان کے علاوہ پوری قوم کے افلاس سے تر ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے جب تک اس ملک وملت کو ملیامیٹ کرنے والی عادت بد یعنی سود خوری کی بیخ کنی مکمل طور پر نہ ہو کوئی اصلاحی قدم اور فلاحی اسکیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔

---

(۱) بینک کا سود حلال ہے: ۱۲۱

۲) بیمہ کے کاروبار کو ''امداد باہمی'' کا کاروبار بنانے کے لیے خریدنے والے اپنی رضامندی سے اس معاہدہ کے پابند ہوں کہ اس کاروبار کے منافع کا ایک معتد بہ (کافی مقدار) حصہ مثلاً نصف یا تہائی یا چوتھائی ایک ''ریزروفنڈ'' (محفوظ چندہ) کی صورت میں وقف اور محفوظ کرتے رہیں گے جو حوادث میں مبتلا ہونے والے افراد کی امداد میں خاص اصول وضوابط کے تحت خرچ کیا جایا کرے گا۔

۳) بصورت حوادث یہ امداد صرف ان حضرات کے لیے مخصوص ہوگی جو اس کمپنی کے حصہ دار (پالیسی ہولڈر) اور اس معاہدہ کے پابند ہوں گے۔ اوقاف میں ایسی تخصیصات میں کوئی شرعاً مضائقہ نہیں وقف علی الاولاد اس کی نظیر موجود ہے۔

۴) اصل رقم مع تجارتی منافع کے ہر پالیسی کے خریدار کو پوری پوری ملے گی اور وہی اس کی ملک اور حقیقت سمجھی جائے گی، امداد باہمی کا ریزروفنڈ وقف ہوگا۔ جس کا فائدہ حادثہ پیش آجانے کی صورت میں وقف کرنے والے کو بھی پہونچ سکے گا۔ اپنے وقف سے خود بھی فائدہ اٹھانا اصول وقف کے منافی نہیں مثلاً کوئی شخص رفاہ عام کے لیے ہسپتال وقف کرے اور بوقت ضرورت خود بھی اس سے فائدہ اٹھائے یا قبرستان وقف کرے پھر خود اس کو اور اس کے اقرباء کو اس میں دفن کیا جائے۔

۵) حوادث پر امداد کے لیے مناسب قوانین بنالیے جائیں جو صورتیں عام طور پر ''حوادث'' کہی اور سمجھی جاتی ہے ان میں اس شخص کے پس ماندگان کی امداد کے لیے متعد بہ رقم مقرر کردی جائے اور جو صورتیں عادۃً ''حوادث'' میں شمار نہیں کی جاتیں مثلاً کسی بیماری کے ذریعہ موت واقع ہوجانا اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ مثلاً متوسط تندرستی والے افراد کے لیے ساٹھ سال کی عمر طبعی قرار دے کر اس سے پہلے موت واقع ہوجانے میں بھی کچھ مختصر سی امداد پس ماندہ گان کو دی جائے، متوسط تندرستی کو جانچنے کے لیے جو طریقہ ڈاکٹری معائنہ کا بیمہ کمپنیوں میں جاری ہے، وہی اختیار کیا جاسکتا ہے، بیمار یا ضعیف آدمی کے

لیے اسی پیمانہ سے عمر طبعی کا ایک اندازہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(۶) چند قسطیں ادا کرنے کے بعد ادائیگی بند کر دینے کی صورت میں ادا کی ہوئی رقم کو ضبط کر لینا ظلم صریح اور حرام ہے اس سے اجتناب کیا جائے ہاں کمپنی کو ایسے غیر ذمہ دار لوگوں کے ضرر سے بچنے کے معاہدہ میں ایک شرط رکھی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی شخص حصہ دار (پالیسی خریدار) بننے کے بعد اگر اپنا حصہ واپس لینا چاہے اور اپنی اس شرکت کو ختم کرنا چاہے تو پانچ سال، یا سات سال یا دس سال سے پہلے رقم واپس نہ ملے گی اور ایسے شخص کے تجارتی منافع کی شرح بھی کم سے کم رکھی جاسکتی ہے بلکہ یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ کل معہودہ رقم کے نصف ہونے تک کوئی نفع نہیں دیا جائے گا نصف کے بعد ایک خاص شرح نفع کی متعین کر دی جائے مثلاً روپیہ میں ایک آنہ یا دو آنہ۔

یہ سب امور منتظمہ کمپنی کی صواب دید سے شریعت کی روشنی میں طے ہو سکتے ہیں ان کا اثر اصل معاملہ کے جواز و عدم جواز پر نہیں پڑتا۔

یہ ایک سرسری، مختصر اور اجمالی خاکہ ہے اگر کوئی جماعت اس دینی کام کے انجام دینے کے لیے تیار ہو تو اس پر مزید غور و فکر کے بعد اس کو زیادہ سے زیادہ نافع بنانے اور نقصانات سے محفوظ رکھنے کی شرعی تدبیریں سوچی جاسکتی ہیں اور سال دو سال تجربہ کر کے ان میں بھی شرعی احکام و اصول کے تحت تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔

آخر بینکنگ اور بیمہ کا موجودہ نظام بھی تو سال دو سال میں ہی قابل عمل نہیں بن گیا ایک صدی سے زیادہ اس پر مسلسل غور و فکر اور تجربات اور ان کی روشنی میں رد و بدل ہوتا رہا تب جا کر اس منضبط شکل میں یہ کاروبار آیا جس پر اطمینان کیا جاسکتا ہے۔

اگر صحیح جذبہ کے ساتھ اس اسکیم کا تجربہ کیا جائے اور ان تجربات کے تحت شرعی قواعد کی روشنی میں اصلاحات کا سلسلہ جاری رہے تو یقیناً چند سال میں ''بلا سود'' بینکاری اور بیمہ کا نظام شرعی اصول پر پورے استحکام کے ساتھ بروئے کار آسکتا ہے۔

اس نظام مضاربت کے تحت بینکاری کا ایک لازمی اثر اور غایت درجہ مفید نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ ملک کی دولت سمٹ کر چند افراد یا خاندانوں میں محدود ہوکر نہیں رہ جائے گی بلکہ اس تجارتی منافع کی شرح اور تقسیم سے پوری قوم کو معتد بہ (قابل قدر) فائدہ حاصل ہوگا اور حقیقی معنی میں قومی سرمایہ روز افزوں اور اس کے نتیجہ میں پوری قوم کا معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوتا رہے گا۔(۱)

اسلامی انشورنس (تکافل)

تکافل ایک اسلامی انشورنس کا نظام ہے، جو باہمی تعاون وتناصر اور تبرع کے اصول پر مبنی ہے، جہاں تمام شرکاء رسک کو شیئر کرتے ہیں اور اس طرح کے باہمی تعاون وتناصر کے طریقہ سے شرکاء مقررہ اصول وضوابط کے تحت ممکنہ مالی اثرات سے محفوظ ہوجاتے ہیں۔(۲)

اسلامی انشورنس یا تکافل کا آغاز 1979 میں سوڈان سے ہوا، تکافل کی اساس قرآن مجید کی آیت شریفہ

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

ہے۔

ترجمہ: اوتم لوگ نیکی اور تقویٰ کے اعمال میں ایک دوسرے کا ساتھ دو اور معاصی وبدخواہی کے معاملات میں ساتھ نہ دو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ صنعتی ترقی اور مشینی وسائل نے انسان کو سہولت تو بہت پہنچائی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسی نسبت سے خطرات میں بھی اضافہ کیا ہے، انسان اپنے ہاتھ سے جو کام کرتا ہے اس کی رفتار اس کے قابو میں ہوتی ہے۔ مشین کے ذریعہ جو کام انجام پاتا ہے اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی، مثلاً ایک شخص تیز دوڑ رہا ہو اور آگے کوئی کھائی نظر آجائے تو وہ چشم زدن میں اپنے آپ کو روک سکتا ہے لیکن اگر وہ تیز رفتار موٹر

---

(۱) فتاویٰ بینات: ۴/۱۹۷

(۲) تکافل کی شرعی حیثیت ۴۳

چلا رہا ہو اور اچانک ایک فرلانگ کے فاصلہ پر کھائی نظر آئی تو اتنی جلدی وہ اپنی گاڑی کو کنٹرول نہیں کرسکتا، یہ محض ایک مثال ہے، ورنہ تو زندگی کے تمام شعبوں میں انسانی عمل اور مشینی عمل کا یہ فرق بالکل واضح ہے، خطرات جس قدر بڑھتے ہیں اسی قدر ان کے سد باب کی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

انشورنس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جو خطرات افراد واشخاص کے لیے قابل برداشت نہ ہوں، ان کو اس قدر تقسیم کردیا جائے کہ وہ لوگوں کے لیے قابل برداشت ہوجائے مثلاً کسی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوجائے اور ڈرائیور کو دس لاکھ روپے ہرجانے ادا کرنے کو کہا جائے تو شاید وہ اسے زندگی بھر میں ادا نہ کرسکے؛ لیکن اگر ایک لاکھ افراد ڈرائیونگ کے پیشے سے جڑے ہوئے ہوں اور ایک معاہدہ کے تحت ایسے موقع پر ہر ڈرائیور ادا کردے تو اتنی رقم کا ادا کرنا کسی کے لیے بھی بار خاطر نہ ہوگا، انشورنس کا اصل مقصد یہی ہے۔

انشورنس کا بنیادی مقصد اور اسلام

غور کیا جائے تو اپنے بنیادی مقصد کے اعتبار سے انشورنس اسلام کے ''نظام تکافل'' کے عین مطابق ہے اور کتاب وسنت میں اس کی مختلف نظیریں موجود ہیں، بعض کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔

۱) اسلام میں کسی شخص کے متعلق جتنے واجبات ہیں، ان میں سب سے گرانقدر ''دیت'' (خون بہا) ہے، شریعت میں دیت کا اصول یہ ہے کہ اس کی ادائیگی تنہا مجرم پر نہیں ہوگی، بلکہ اس کے عاقلہ رشتہ دار ملکر اسے ادا کریں گے، بظاہر اس کی دو مصلحتیں ہیں: ایک یہ کہ ایک بھاری ہرجانہ کی ادائیگی عام افراد کے بس سے باہر ہوتی ہے تو اس کے لیے تعاون کا ایک راستہ موجود ہے، دوسرے: جب دیت ادا کرنے میں تمام لوگ شریک ہوں گے تو سب لوگ مل کر جرم کو روکنے کی کوشش بھی کریں گے، دیت صرف قتل عمد پر ہی واجب نہیں بلکہ قتل خطا پر بھی

واجب ہوتی ہے، اس طرح ایک متوقع خطرہ کی تلافی کو بہت سے ایسے افراد پر تقسیم کر دیا گیا ہے کہ اس کی ادائیگی نا قابل تحمل باقی نہ رہے، انشورنس کا بھی بنیادی منشا یہی ہے، حضرت عمرؓ نے اس میں مزید وسعت برتتے ہوئے رشتہ داروں کے بجائے اس کے لیے ''اہل ارزاق'' اور ''اہل دیون'' کے دو گروپ بنا دیے اہل دیون سرکاری اور فوجی ملازم تھے اور اہل ارزاق وہ فقراء تھے جن کو ان کی غربت کی وجہ سے وظیفہ دیا جاتا تھا، چنانچہ احناف نے اسی سے اخذ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک پیشہ کے لوگ باہم ایک دوسرے کے عاقلہ ہوں گے۔

لو کان الیوم قوم تناصر ہم بالحرن فعاقلتہم اہل الحرفة (١)

اس میں مزید سہولت : کیونکہ ایک پیشہ کے لوگ ایک طرح کے خطرے سے دوچار ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ زیادہ خوش دلی کے ساتھ اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔

٢) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے قبیلہ اشعر کی تحسین کرتے ہوئے ان کی اس خوبی کا ذکر فرمایا کہ سفر ہو یا حضر، جب ان کا کھانا کم پڑ جاتا ہے تو سب لوگ اپنی غذائی اشیاء کو اکٹھا کر لیتے ہیں اور تمام لوگوں کی ضرورت اجتماعی طریقہ پر پوری کی جاتی ہے، روایت کے الفاظ اس طرح ہیں :

ان الأشعريين إذا رملوا فی الغزو، أوقل طعام عيالهم فی المدينة، جمعوا ماكان عندهم فی ثوب واحد، ثم اقتسموه بينهم فی إناء واحد بالسوية فهم منی و أنا منهم (٢)

اشعری لوگوں کا سفر میں جب توشہ ختم ہو جاتا ہے یا مدینہ میں انھیں کھانے کی تنگی ہوتی ہے تو وہ سب کے پاس کا غلہ ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں، پھر اسے ایک پیالے سے برابر تقسیم کر لیتے ہیں، وہ مجھ

---

(١) ہدایہ: ٣٦٠/٤

(٢) صحیح البخاری کتاب الشرکة باب فی الطعام النہد و العروض، حدیث نمبر: ٢٣٥٤

سے ہیں، میں ان سے ہوں۔

اس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقۂ کار کی تعریف کی وہ یہی اجتماعی کفالت کا طریقہ ہے۔

(۳) مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں ایک ''سریہ'' کسی مہم پر گیا ہوا تھا، ایک مرحلہ ایسا آیا کہ جس میں غذائی اشیاء نہایت قلیل مقدار میں باقی رہ گئیں، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر تمام لوگوں کے پاس موجود خوردنی اشیاء جمع کیں اور ان کے ذریعہ اجتماعی طور پر لوگوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا، یہاں تک کہ بعد میں ان حضرات کو ایک بڑی مچھلی مل گئی، جس کو اس زمانہ میں ''سمک عنبر'' سے تعبیر کیا جاتا تھا، کافی دنوں تک مجاہدین اسی سے اپنی غذائی ضرورت پوری کرتے رہے روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

فأمر ابوعبيدة بازواد ذلک الجيش، فجمع ذلک كله، فكان مزودی تمر، فكان يقوتنا كل يوم قليلا قليلا حتى فنی (۱)

اس واقعہ میں اجتماعی کفالت کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور یہی انشورنس کا بھی بنیادی مقصد ہے۔

یہ مختلف احادیث اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ شریعت اسلامی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ پریشان حال شخص کو تنہا چھوڑ دیا جائے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے سماج اپنا کردار ادا نہ کرے، بلکہ اسلام انفرادی ملکیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے موقعوں پر اجتماعی کفالت کی بھی دعوت دیتا ہے تاکہ غیر معمولی حالات کا مل جل کر مقابلہ کیا جائے۔

❁ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی ملاحظہ ہو:

''بیمہ کی ایک امدادی تعاونی شکل ہوتی ہے جس کو عربی میں ''التامین

---

(۱) صحیح البخاری کتاب غزوۃ سیف البحر، حدیث نمبر: ۴۱۰۲

التبادلی'' کہتے ہیں، اس میں تجارت مقصود نہیں ہوتی؛ بلکہ ممبران کی امداد مقصود ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ باہمی طور پر ایک فنڈ قائم کرتے ہیں اس فنڈ کے ممبران میں سے اگر کسی کو حادثہ پیش آجائے تو اس حادثہ کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس فنڈ سے متاثرہ ممبر کی امداد کی جائے گی، یہ صورت بالاتفاق جائز ہے، اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ اس اعانت کا فائدہ کسے پہنچے گا؟ اس لیے اس میں ایک گونہ غرر ہے، مگر یہ غرر مضر نہیں، کیونکہ یہ ازقبیل تبرع واحسان ہے اور عقود تبرع میں غرر مضر یا مفسد نہیں ہوتا ہاں جو عقود معاوضہ ہوں ان میں غرر ناجائز اور حرام ہوتا ہے، بیمہ کی ناجائز شکلوں کو مذکورہ امدادی تعاونی فنڈ پر قیاس کرکے جواز کا قائل ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ امدادی فنڈ میں جس طرح غرر کو برداشت کرلیا گیا ہے، اسی طرح املاک وصحت کے بیمہ میں بھی برداشت کرنا چاہیے درست نہیں؛ کیوں کہ ابھی اوپر یہ بات آچکی ہے کہ بیمہ ایک عقد معاوضہ ہے اور عقد معاوضہ میں غرر ہو تو وہ شرعاً صحیح نہیں، اور امدادی فنڈ کی بنیاد تعاون وامداد پر مبنی ہوتی ہے، اس میں معاوضہ مقصود نہیں ہوتا اس لیے اس میں غرر مفسد نہیں ہوگا''۔(۱)

تکافل (اسلامی انشورنس) کے بنیادی اصول

اسلامی اصولوں پر جو انشورنس کمپنی قائم ہوگی، اس کی بنیاد ان اصولوں پر ہوگی:

۱) جو لوگ کمپنی کے ممبر بن گیے وہ اپنے اوپر ایک مقررہ مقدار ادا کرنے کو لازم کرلیں گے، مالکیہ کے مسلک کے مطابق انسان اپنے اوپر جس چیز کا التزام کرلے، وہ اس کے ذمہ لازم ہوجاتی ہے، موجودہ عہد کے ان فقہاء نے جو اسلامی معاشیات میں بھی مہارت رکھتے ہیں اسی رائے پر فتویٰ دیا ہے۔

---

(۱) چند اہم عصری مسائل: ۱/ ۳۳۴

۲) اگر انشورنس کمپنی اس اساس پر قائم ہو کہ وہ اپنے ممبران کے نقصانات کی تلافی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو کچھ نفع بھی دیں تو کمپنی کے لیے ضروری ہوگا کہ دو الگ اکاؤنٹ رکھیں، ایک اکاؤنٹ تعاون سے متعلق رقوم کا ہو اور دوسرا اکاؤنٹ سرمایہ کاری کا ہو، سرمایہ کاری والے اکاؤنٹ میں ممبران کی جو رقم جمع ہو، اس کا نفع ان کو دیا جائے اور تبرع والے اکاؤنٹ کی رقم نقصانات کی تلافی میں خرچ کی جائے۔

۳) جو رقم تبرع کے اکاؤنٹ میں جمع ہو، اگر وہ سال بھر ممبران کے مقررہ نقصانات کو پوری کرنے کے بعد بچ جائے تو وہ یا تو ممبران کو واپس کردی جائے گی یا ان کی اجازت سے آئندہ کی ضروریات کے لیے اسی اکاؤنٹ میں باقی رکھی جائے گی۔

۴) یہ ادارہ ربا اور قمار نیز ہر طرح کے غیر شرعی امور سے خالی رہے گا، اگرچہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کو اس کی ادا کی ہوئی تبرع کی رقم سے زیادہ مل جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنے تبرعات تو جمع کرے؛ لیکن اس کو اس کے مقابلے میں کچھ نہ ملے؛ کیونکہ اس کو وہ حادثہ ہی پیش نہیں آیا، جس کی وجہ سے وہ تعاون کا مستحق ہوتا، لیکن یہ ربا اور قمار کے دائرے میں اس لیے نہیں آئے گا کہ ان دونوں کا تعلق عقد معاوضہ سے ہے نہ کہ تبرعات سے اور یہ صورت تبرع کے قبیل سے ہے، اس میں ایسا نہیں ہے کہ بچی ہوئی رقم کے مالک وہ لوگ بن جائیں، جنہوں نے کمپنی قائم کی ہے، اسی طرح اس میں جہالت وغرر بھی پایا جاتا ہے مگر یہ معاوضات میں باعثِ فساد ہوتا ہے، تبرعات میں نہیں۔

۵) ممبران جو رقم سرمایہ کاری کے لیے لگائیں گے اس میں ان کی شرکت نفع ونقصان کی اساس پر ہوگی؛ کیونکہ شریعت میں سرمایہ کاری کا بنیادی اصول یہی ہے کہ سرمایہ کار اور محنت کار دونوں کو نفع ہونے کی صورت میں مقررہ تناسب کے مطابق نفع حاصل کرے اور اگر نقصان ہو تو اس کو سرمایہ کار برداشت کرے، یعنی سرمایہ کار سرمایہ کار

کے نقصان کو گوارا کرے، اور محنت کار اپنی محنت کے نقصان کو گوارا کرے۔(۱)

فینانس لیزنگ (Finance Leasing)

فنانس لیزنگ (Finance Leasing) کا اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ کمپنی کو اگر جامد اثاثوں کی ضرورت ہو تو کمپنی بینک (Bank) سے قرض لے کر خود مشیری نہیں خریدتی ہے، بلکہ اس کے بجائے وہ بینک یا مالیاتی ادارے سے یہ کہتی ہے کہ ہمیں مشیری کی ضرورت ہے، تم یہ مشیری خرید کر ہمیں کرایہ پر دے دو، بینک اس مشیری کو خرید کر کمپنی کو کرایہ پر دے دیتا ہے، اس دوران اس مشیری کا مالک بینک یا مالیاتی ادارہ ہی رہتا ہے، اور کمپنی اس کو کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتی ہے، اس کرایہ داری کا اصل مقصود کرایہ داری کا معاملہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد تمویل (Investment) ہوتی ہے، اور کمپنی دیکھتی ہے کہ اگر اس روپیہ کو دس سال کے لیے قرض دیا جاتا تو کمپنی کو کتنا سود (Interest) ملتا ہے، اس کے بعد بینک (Bank) ایک مخصوص مدت کے لیے کرایہ اس تناسب سے طے کرتا ہے کہ اصل رقم اور اس پر جتنا سود ملنا تھا وہ سب حاصل ہو جائے، جب یہ مدت گزر جاتی ہے اور کرایہ کی صورت میں مشیری کی قیمت بمع شرح سود ادا ہو جاتی ہے، تو اب یہ مشیری خود بخود کمپنی کی ملکیت میں آجاتی ہے، اس طریقہ کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے بعض صورتوں میں ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے، یا ٹیکس میں کمی ہو جاتی ہے، اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرض کی وصولیابی کے لیے اجارہ کا طریقہ بنسبت دیگر اقراض کے زیادہ قابل اعتماد ہے، کیوں کہ اس میں مشیری بینک یا مالیاتی ادارے کی ملکیت ہوتی ہے، اگر بالفرض بینک کو اپنی رقم واپس نہ ملے تو بینک اس مشیری کو فروخت کر کے اپنا سرمایہ واپس لے سکتا ہے، کیوں کہ مشیری اسی کی ملکیت میں ہوتی ہے۔ فینانس لیزنگ (Finance Leasing) کا مقصود تو سرمایہ (Capital) کی فراہمی ہے اسی وجہ سے اس کو طریقہ

(۱) جدید مالیاتی ادارے ۱۰۵-۱۰۶

ہائے تمویل (Financing) تمویل کا (Aideal) طریقہ نہیں ہے، اس لیے کہ تمویل اصل میں وہ ہوتی ہے جس میں کوئی چیز ملک میں آ جائے اور اس مذکورہ بالا طریقۂ کار میں مشینری ہنوز بینک یا مالیاتی ادارے کی ملک میں ہوتی ہے، اس لیے اس کو حقیقی طریقہ ہائے تمویل میں شمار نہیں کیا جا سکتا، مذکوہ بالا اجارہ کے طریقہ میں شرعی اعتبار سے اجارہ کی حقیقت نہیں پائی جاتی، کیوں کہ اجارہ کی حقیقت میں ایک یہ بات بھی داخل ہے کہ موجر (Lessor) جو مشینری وغیرہ اجارہ پر دے رہا ہے، وہ اس کا مالک اور ذمہ دار ہو اور مشینری اسی کے ضمان (Risk) میں داخل ہو، مگر تمویلی اجارے (Finance Lease) میں آج کل عملاً ایسا نہیں ہوتا، کیوں کہ موجر (Lessor) اس مشینری کی کوئی ضمانت قبول نہیں کرتا، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے مشینری کا نقصان ہو جائے تو وہ مستاجر (Lessee) کا نقصان سمجھا جاتا ہے، اور اگر کسی حادثہ میں مشینری ضائع ہو جائے تو بھی مستاجر اس کا کرایہ ادا کرتا رہتا ہے، اس مشینری سے موجر کا صرف اتنا تعلق ہوتا ہے کہ اگر مستاجر اس مشینری کی ادئیگی نہ کرے تو پھر موجر مشینری کو فروخت کر کے اپنا قرضہ وصول کر لیتا ہے، اس لیے آج کل مختلف مالیاتی ادارے اور بینک حقیقی اجارہ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ اس کا اصل مقصد سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے، مگر ٹیکس (Tax) میں بچت کے لیے سود کا نام دے دیا جاتا ہے، اس لیے مذکورہ بالا طریقۂ کار سے اجارہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

اس کا جائز طریقہ یہ ہے کہ مشینری واقعی موجر کے ملک میں ہو، اور وہ اس کی ذمہ داری قبول کرے اور اس مشینری کو اپنے ضمان (Risk) میں رکھے، پھر کرایہ مقرر کرتے وقت اس بات کو بھی مدنظر رکھا جائے کہ مشینری کی قیمت بمع کچھ نفع کے وصول ہو جائے، لیکن یہ واضح رہے کہ معاہدے میں یہ شرط نہ لگائی جائے کہ مدتِ اجارہ مکمل ہونے پر مشینری خود بخود مستاجر (Lessee) کی ملکیت میں آ جائے گی، کیوں کہ اس طرح عقد کرنے سے ''صفقۃ فی صفقۃ'' کی صورت بن جاتی ہے، البتہ اس کی صورت یہ

ہوسکتی ہے کہ مدتِ اجارہ ختم ہونے پر ایک دوسرا جدید عقد کیا جائے جس میں موجر (Lessor) مستاجر (Lessee) کو مشینری معمولی سی رقم لے کر فروخت کردے یا ہبہ کردے۔

فینانس لیزنگ (Finance Leasing) کا ایک متبادل جائز طریقہ ''مرابحہ، موجلہ'' بھی ہوسکتا ہے، جس کی شرعی طور پر صورت یہ ہوسکتی ہے کہ بینک یا لیزنگ کمپنی مشینری کو خرید کر اپنے قبضہ اور ضمان (Risk) میں لے لے، پھر کسی دوسرے شخص کو معین نفع کے ساتھ فروخت کردے، اور ادھار کی مدت بھی طے کرلے تو یہ صورت شرعاً جائز ہوگی، ادھار دینے کی وجہ سے اصل قیمت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً ایک مشینری کی قیمت ایک لاکھ روپے ہے ادھار کی وجہ سے اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے کردی گئی، تو اس طرح نقد کے مقابلہ میں ادھار پر قیمت میں اضافہ کرنا بالاتفاق جائز ہے، اس طریقۂ کار کو شرعی ''مرابحہ'' کہا جاتا ہے، لیکن آج کل بینکوں میں جو ''مرابحہ'' کیا جاتا ہے اس میں شرعی اعتبار سے کئی خرابیاں ہیں، اس لیے اس کو شرعی ''مرابحہ'' نہیں کہا جاسکتا۔

آپریشن لیزنگ (Operation Leasing)

یہ وہ اجارہ ہے جس کا عام طور پر رواج ہے، جیسے مثال کے طور پر مکان یا دوکان وغیرہ کو کرایہ پر دینا وغیرہ، اس کے اندر حقیقت میں فریقین کے درمیان موجر (Lessor) اور مستاجر (Lessee) کا تعلق ہوتا ہے، اس میں عقد کرتے وقت فریقین کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ جس چیز کو کرایہ پر دیا جارہا ہے اس کی اصل قیمت کتنی ہے، کرایہ میں اصل قیمت اور نفع کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، بلکہ جس چیز کو کرایہ پر دیا جارہا ہے اس کا کرایہ بازاری نرخ (Market Velue) کے اعتبار سے مقرر کیا جاتا ہے، جیسا کہ کوئی شخص مکان یا دوکان کو کرایہ پر دے دے، یا کوئی اور چیز کرایہ پر دی جائے ان چیزوں میں مکان یا دوکان کا کرایہ بازاری نرخ (Market Velue)

کے اعتبار سے مقرر کیا جاتا ہے، آپریٹنگ لیز (Operatin Lease) شرعاً اس وقت جائز ہوگی جب کہ اس میں شرعی اعتبار سے شرائطِ اجارہ پائی جائیں۔

سیکیورٹی ڈیپازٹ

بینک اور مالیاتی ادارے جب کسی کے ساتھ گاڑی یا مشینری یا کسی اور چیز کا اجارہ کرتے ہیں تو اپنے گاہک سے کچھ رقم بطور سیکیورٹی لیتے ہیں اور یہ سیکیورٹی ڈیپازٹ بینک کے پاس رہتی ہے، اگر گاہک بینک کو ادئیگی نہ کرے یا نادہندہ (Default) کرجائے تو پھر بینک کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اس رقم سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرے، بینک سیکیورٹی ڈیپازٹ کی رقم کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا، بلکہ یہ بینک کے مجموعی پول میں شامل ہوجاتی ہے، جس سے بینک کو آمدنی بھی حاصل ہوتی ہے، تو شرعی طور پر اس کی کیا توجیہ کی جاسکے گی؟ اور یہ صورت شرعاً کس طرح جائز ہوگی؟

شرعی اعتبار سے اس کی یہ توجیہ کی جائے گی کہ اجارہ میں جو رقم بطور سیکیورٹی لی جارہی ہے، درحقیقت یہ ایڈوانس ہے اور ایڈوانس کا حکم یہ ہے کہ وہ مؤجر (Lessor) کے پاس امانت ہوتا ہے، البتہ جب مستاجر کی صراحتاً اجازت سے یا عرف کی وجہ اسے استعمال کرلیا جائے تو اس پر قرض کے احکامات جاری ہوتے ہیں، اس لیے یہ ایڈوانس کی رقم بینک کے پاس ابتدءً امانت کے طور پر ہے، اور جب بینک اسے استعمال کرے گا تو یہ رقم مؤجر (Lessor) کے ذمہ مستاجر (Lessee) قرض ہوجائے گی۔

جیسا کہ شرح المجلۃ میں ہے:

أما لو كانت الوديعة دراهم و دنانير أو شيئاً من المكيل أو الموزون أو أنفق شيئاً في حاجته حتى صار ضامنا لما أنفق لا يصير ضامنا لما بقي و ان جاء بمثل ما أنفق فخلط صار ضامنا للكل البعض بالانفاق و البعض بالخلط۔

ترجمہ: اگر ودیعت دراہم اور دنانیر میں ہوں یا مکیلی یا موزونی اشیاء میں

سے کچھ ہو اور اس میں کچھ حصہ مودع (جس کے پاس امانت رکھوائی جائے) نے خرچ کر لیا تو وہ خرچ کیے جانے والے مال کا ضامن ہوگا، اور اگر مودع (جس کے پاس امانت رکھوائی گئی ہے) نے خرچ کیے جانے والے مال کو واپس لوٹا دیا اور بقیہ مال کے ساتھ ملا دیا تو پھر پورے مال کا ضامن ہوگا۔ بعض کا اس وجہ سے کہ اس نے کچھ خرچ کیا ہے، اور بقیہ بعض کا اس وجہ سے کہ اس کے ساتھ اس نے دوسرے مال کو ملا دیا ہے۔

اسلامی اور فائنانشل لیز کے درمیان بنیادی فرق

(Basic Differnce Between Islamic and Financial Lease)

اسلامک لیز اور فائنانشل لیز کے درمیان کچھ بنیادی فروق ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

پہلا فرق:

فائنانشل لیز میں جس دن موجر (Lessor) رقم کی ادائیگی کرتا ہے، اسی دن سے کرایہ شروع ہو جاتا ہے، جبکہ اسلامک لیز میں اس وقت کرایہ شروع ہوتا ہے جب کرایہ پر دیا جانے والا سامان (Lease Assets) مستاجر (Lessee) کے قبضے میں آجائے۔

دوسرا فرق:

فائنانشل لیز (Financial Lease) کے اندر قیمت کی ادئیگی یا تو (Supplier) کو کی جاتی ہے یا مستاجر (Lessee) کو یہ قیمت دے دی جاتی ہے کہ وہ لیزنگ کمپنی کے اعتماد (Behalf) پر وہ چیز خرید کر اجارہ پر لے لے، اس میں الگ الگ ایگریمنٹ نہیں ہوتے، اسلامک لیز کے اندر بھی مذکورہ دونوں طریقوں سے ادائیگی ہو سکتی ہے، البتہ اگر مستاجر (Lessee) کو قیمت دی گئی تو اس وقت الگ الگ ایگریمنٹ بنیں گے۔

۱۔ لیز ایگریمنٹ(Lease Agreement)

۲۔ ایجنسی ایگریمنٹ(Agency Agreement)

ایجنسی ایگریمنٹ پہلے ہوگا جس میں یہ درج ہوگا کہ مستاجر یہ چیز لیزنگ کمپنی کے ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے خرید رہا ہے۔

اور لیزنگ ایگریمنٹ بعد میں ہوگا جس میں یہ درج ہوگا کہ لیزنگ کمپنی یہ مشینری مستاجر کو لیز پر دے رہی ہے، اس کا کرایہ، مدت وغیرہ کا ذکر ہوگا اور دیگر تمام شرائط بیان کی جائیں گی جو اسلامی اجارہ کے اندر بیان کرنا ضروری ہیں۔

تیسرا فرق:

اسلامی لیز ایگریمنٹ میں ایجنسی ایگریمنٹ کے تحت مستاجر جتنے عرصے تک ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرے گا، اس وقت تک سارا ضمان (Risk) لیزنگ کمپنی کا رہے گا، لہٰذا اس دوران اگر کسی آفت کی وجہ سے سامان ہلاک یا ضائع ہوگیا تو وہ نقصان لیزنگ کمپنی کا معاہدہ ہوگا جبکہ فائنانشل لیز میں تمام رسک مستاجر (Lessee) کا ہوتا ہے۔

مروجہ انشورنس اور تکافل میں فرق

اس طرح مروجہ انشورنس اور اسلامی انشورنس کے درمیان بنیادی فرق ہے جس کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

انشورنس	تکافل
(ا) مروجہ انشورنس عقد معاوضہ ہے جس میں کمپنی کے شیر ہولڈر نفع حاصل کرنے کے لیے اپنی رقم لگاتے ہیں اور کمپنی کے ممبروں کو پیش آئے نقصانات کی تلافی کے بعد جو کچھ رقم بچ جاتی ہے وہ ان کی ملکیت بن جاتی ہے۔	(ا) اسلامی انشورنس عقد تبرع ہے، اس میں تعاون کی نیت سے رقم دی جاتی ہے نہ کہ نفع کی نیت سے۔

(۲) مروجہ انشورنس میں کمپنی کے شیر ہولڈرس اور کمپنی کے ممبروں کا الگ الگ اکاؤنٹ نہیں ہوتا بلکہ تمام رقمیں ایک ہی جگہ جمع ہوتی ہیں۔	(۲) اسلامی انشورنس کمپنی میں کمپنی کے ممبروں کی اعانتی رقم کا الگ اکاؤنٹ ہوگا جو نقصانات کی بھرپائی میں استعمال ہوگا اور سرمایہ کاری کے لیے جمع ہونے والی رقم کا اکاؤنٹ الگ ہوگا جس کا نفع شرکاء کو حاصل ہوگا۔
(۳) مروجہ انشورنس کمپنی میں جمع شدہ رقم میں سے جو بچ جائے گی، اس سے پالیسی حاصل کرنے والے ممبروں کا کوئی تعلق نہیں ہوگا؛ بلکہ شیر ہولڈر یعنی کمپنی کے مالکان اس کے مالک ہوں گے۔	(۳) اسلامی انشورنس کمپنی میں تبرع کے طور پر جو رقم دی گئی ہے اگر اس میں سے بچ جائے تو یا تو ممبروں کو واپس لوٹا دی جائے گی یا تبرع کے فنڈ میں آئندہ کے لیے اسے محفوظ کرلیا جائے گا یہ بچی ہوئی رقم کمپنی قائم کرنے والوں کی ملکیت نہیں بنے گی۔
(۴) مروجہ انشورنس کمپنی کی نگرانی کے لیے نہ کوئی شریعہ بورڈ ہوتا ہے اور نہ اس میں اسلام کے حلال وحرام سے متعلق احکام پیش نظر رکھے جاتے ہیں؛ چنانچہ اس میں ربا، قمار اور غرر کا پایا جانا بالکل واضح ہے۔	(۴) اسلامی انشورنس کمپنی میں اس بات کی رعایت ہوگی کہ تمام کام شریعت کے دائرہ میں ہو اور اس کی نگرانی کے لیے ایک شرعیہ بورڈ بھی ہوگا۔
روایتی انشورنس	**اسلامی انشورنس**
(۵) یہ ایک خالص مالیاتی معاہدہ ہے جس میں غیر یقینی کیفیت وحالات غالب ہوتے ہیں۔	(۵) اسلامی انشورنس باہمی تعاون وافادیت کے مقصد سے شریک ارکان کی رقومات سے قائم کیا جاتا ہے جس کی بنیاد اسلامی شریعت کے مالیاتی اصول ہوتے ہیں۔

(٦) انشورنس کمپنی معاہدہ میں خود کو بطور ایک فریق شامل کرتی ہے۔	(٦) اسلامی انشورنس ادارہ صارف کے وکیل (ایجنٹ) کے طور پر پریمیم کی رقوم وصول کرتا اور مضاربہ اصولوں پر مبنی کاروبار میں مشغول کرتا ہے، صارف اپنے رقم بقدر تناسب پر کاروبار میں حصص کا مالک بنتا ہے۔
(۷) صارف انشورنس کے مستقبل کے وعدہ پر ادا کردہ پریمیم رقومات کے بقدر مال کا حق رکھتا ہے۔	(۷) امداد باہمی کا کھاتہ ان رقومات کا مالک ہوتا ہے۔
(۸) ہمہ قسم کے اخرجات کے منہا ہونے کے بعد تمام پریمیم رقومات ادارہ کی ملکیت مانے جاتے ہیں۔	(۸) اخرجات کے منہا کردیئے جانے کے بعد ما باقی رقومات شریک ممبروں کے حق ملکیت کے تناسب سے باہم تقسیم کردیئے جاتے ہیں۔
(۹) فنڈ کے مصروف کردہ رقومات پر وصول شدہ منافع ادارہ کا حق تصور کیا جاتا ہے۔	(۹) پریمیم رقومات کے مضاربہ اصولوں کی متابعت میں مشغول ہونے سے وصول شدہ نفع مضارب کے حق کی دائیگی کے بعد شرکاء ارکان میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔
(۱۰) انشورنس ادارہ اور صارف دو علیحدہ علیحدہ اکائیاں تصور کی جاتی ہیں جن میں صارف، انشورنس کا طالب اور ادارہ اس کا مہیا کرنے والا ہوتے ہیں۔	(۱۰) انشورنس مہیا کرنے والا اور اس کا طالب ایک ہی ہوتے ہیں، فنڈ کے شرکاء نقصان لاحق ہونے کی صورت میں باہم ایک دوسرے کے تحفظ فراہم کرنے کا

		تیقن دیتے ہیں، شرکاء اپنے پریمیم کے وسائل اور غیر یقینی کیفیت کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں۔
(۱۱) تخیلاتی و حقیقی خدشات میں ادارہ تحفظ فراہم کرتا ہے۔		(۱۱) صرف حقیقی خسارہ کی صورت میں ادارہ تحفظ فراہم کرتا ہے۔
(۱۲) روایتی انشورنس کمپنی کے بند کردیئے جانے کی صورت میں کھاتے میں موجود رقم کو کمپنی خود حاصل کرلیتی ہے۔		(۱۲) اسلامی انشورنس ادارہ میں اختتام پر موجود رقم فلاحی مصارف میں لگادیا جاتا ہے۔(۱)

(۱) اسلام کا نظام اقتصادیات ومالیات: ۷۵، ۷۶

رہن کی مروّجہ شکلیں

عام لوگوں میں سود کی جو قسمیں پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی آدمی کسی غریب یا ضرورت مند کو کچھ رقم بطور قرض دیتا ہے اور رہن میں اس کا گھر یا زمین وغیرہ رکھ لیتا ہے، پھر اس میں یا تو خود رہتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے یا کسی کو کرایہ پر دے کر اس کا کرایہ خود کھاتا ہے، رہن ان اہم مسائل میں سے ہے، جس کا معاملہ جواز کی حد تک اگر کیا جائے تو جائز ہے؛ لیکن اگر جواز کی حد سے تجاوز کیا جائے تو رہن کا معاملہ صریح سود ہو جاتا ہے؛ چوں کہ اس میں جائز اور ناجائز دونوں پہلو ہوتے ہیں، اس لیے عام طور پر لوگ دھوکہ کھاتے ہیں اور ناجائز صورتوں کو بھی جائز یا جائز کے قریب سمجھتے ہیں۔

اس طرح کے کاروبار میں صرف عام لوگ ہی نہیں؛ بلکہ پڑھے لکھے اور دینی مزاج رکھنے والے حضرات تک ملوث پائے جاتے ہیں، ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۷۰ رفیصد لوگ مال مرہون سے فائدہ اٹھانے کو مباح اور اپنا حق سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ راہن اور مرتہن کوئی بھی اس کو قبیح اور غیر شرعی نہیں سمجھتا؛ حالاں کہ یہ معاملہ عین سود ہے اور حرام ہے اور اس کے ذریعہ حاصل کی گئی پیداوار اور آمدنی ناجائز اور نادرست ہے۔

اسی لیے ذیل میں رہن کی تعریف، حکم، جائز وناجائز شکلوں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ کچھ متفرق مسائل ذکر کیے جا رہے ہیں۔

رہن کی لغوی تعریف

رہن عربی زبان کا لفظ ہے، اردو زبان میں ''گروی'' مستعمل ہے، رہن کا لغوی ثبوت اور دوام کے ہے، کہا جاتا ہے''ماء رہن''یعنی ایسا پانی جو ہمیشہ ٹھہرا ہوا رہے، نیز کہا جاتا ہے:''نعمۃ ثابتۃ دائمۃ''یعنی ہمیشہ رہنے والی نعمت، اسی طرح رہن کا دوسرا معنی ''حبس الشی ء''یعنی مطلق روک رکھنا ہے:

"الرهن في اللغة: الثبوت والدوام، يقال ماء راهن، أي: راكد ودائم ونعمة راهنة، أي: ثابتة دائمة، الرهن لغة: حبس الشيء"(۱)

رہن کی اصطلاحی تعریف

فقہائے کرام نے رہن کی تعریف یہ کی ہے کہ''رہن''دین (قرض) کے بدلے مال کی قبیل کی کسی چیز کو روکے رکھنا، (جب دئے ہوئے مال کا وصول کرنا مشکل ہوجائے) تاکہ اپنا قرض اسی رہن کے ذریعہ واپس لے سکے۔

وشرعا هو حبس شيء مالي بحق يمكن استيفاءه، أي: أخذه منه كالدين"(۲)

راہن، مرتہن اور شیٔ مرہون کی اصطلاح

رہن: قرض کے عوض بطور اعتماد کے کسی کے پاس سامان گروی رکھے جانے والے معاملے کو''رہن''کا معاملہ کہا جاتا ہے۔

راہن: سامان گروی رکھنے والے کو''راہن''کہا جاتا ہے۔

مرتہن: جس نے قرض دیا ہے، یعنی جس کے پاس سامان رہن یا گروی رکھا گیا ہے اسے''مرتہن''کہا جاتا ہے۔

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲۳/ ۵۷

(۲) درمختار، کتاب الرہن

شیٔ مرہون: جو چیز رہن رکھی گئی ہے اسے ''شیٔ مرہون'' کہا جاتا ہے۔
شیٔ مرہون بہ: جس حق کے عوض رہن رکھا جارہا ہے اسے ''شیٔ مرہون بہ'' کہتے ہیں۔

رہن کا حکم شرعی

شریعت میں انسانوں کی ضرورت کے لیے رہن کے معاملے کو جائز اور مباح قرار دیا گیا ہے، نیز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر اب تک امت رہن کے معاملے کو باتفاق ایک مشروع معاملہ سمجھتی رہی ہے، رہن جائز ہے واجب نہیں۔

مسئلہ: رہن کا معاملہ اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب مال مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہوگیا ہو، اگر قبضہ نہیں ہوا تو راہن کو اجازت ہے کہ معاملے کو فسخ کردے:

''قبل القبض لكونه غير تام، وغير لازم قبل القبض فإذا قبض لزم۔۔۔ فلا رجوع بعده''(۱)

مسئلہ: اگر مرتہن کے قبضے میں مال مرہون ضائع ہوگیا تو مرتہن مال مرہون سے کم قیمت کا ضامن ہوگا، مال مرہون سے زیادہ کا نہیں، اگر دین مال مرہون کے برابر قیمت کا ہے تو اسی سے اس کی ادائیگی ہوگئی اور اگر دین زیادہ ہے تو مرہون کی قیمت سے مجری کیا جائے گا اور باقی جو بچے گا راہن سے اس کا مطالبہ کیا جائے گا:

''وهو مضمون بالأقل من قيمته ومن الدين، فلو هلك وهما سواء صار المرتهن مستوفيا لدينه وإن قيمته أكثر فالزائد أمانة۔۔۔ الخ''(۲)

ناجائز مروّجہ شکلیں

❁ اس وقت رہن کی مروجہ شکلیں جس میں ایک شخص بطور قرض کچھ متعینہ رقم دیتا ہے اور اس کے بدلے میں اس کے مکان میں پیسوں کی بعینہ واپسی تک بغیر کرایہ کے رہتا ہے۔

---

(۱) مجمع الأنہر، کتاب الرہن (۲) مجمع الأنہر، کتاب الرہن

اس طرح قرض دے کر مکان کو بغیر کرایہ کے استعمال کرنا یہ صورت نا جائز ہے، سود میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرض پر کسی بھی طرح کا نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور اسے سود قرار دیا۔

فقہاء نے لکھا ہے:

”لا یحل له أن ینتفع بشئی منه بوجه من الوجوه و ان أذن له الراهن، لأنه اذن له فی الربا“(۱)

- اگر رہن رکھنے والا قرض دینے والے کو مال رہن سے نفع اٹھانے کی اجازت بھی دے جب بھی وہ حرام ہے، کیوں کہ یہ سود کی اجازت ہے، اس لیے قرض دینے والے کو گھر میں رہنے کا کرایہ ادا کرنا ہوگا، بغیر کرایہ کے گھر سے منتفع ہونا اس کا درست نہیں۔(۲)
- اسی طرح بعض حضرات برائے نام گھر کا کرایہ ادا کرتے ہیں، مثلاً 5000 کرایہ ہو تو 500 روپے 1000 روپے ادا کرتے ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ 5000 کا کرایہ 1000 روپے محض قرض کی وجہ سے کم ہوئے ہیں تو یہ بھی سود ہے، حرام چیز میں حیلہ کرنا ہے یہ بھی نا جائز ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اس حوالے سے فرماتے ہیں کہ: اس رہن کی مدت میں زمین کے منافع سے قرض خواہ اس قدر فائدہ اٹھا چکا ہو جو اس کے قرضے کے برابر زیادہ ہو تو قرض دار کے لیے اپنی زمین سے فائدہ اٹھانا بلاشبہ حلال ہے اور مرتہن پر واجب ہے کہ قرض سے زائد انتفاع کا کرایہ راہن کو دے (۳) فتاویٰ مفتی محمود میں ہے: مرہونہ زمین سے کسی کے لیے بھی نفع لینا جائز نہیں؛ لیکن اگر مرتہن نے نفع حاصل کیا تو یہ تمام نفع

---

(۱) رد المحتار: ۵/۱۳۰

(۲) کتاب الفتاویٰ: ۵/۳۸۷

(۳) فتاویٰ عثمانی: ۳/۴۲۳

قرض کی وصولی میں شمار ہوگا یعنی منافع کی مقدار راہن سے قرض ساقط ہوجائے گا۔(۱)

ایک شخص بطور قرض کسی شخص کو متعینہ رقم دیتا ہے اور اس کے عوض بطور رہن گھر یا زمین لیتا ہے اور اس میں رہائش اختیار کرتا ہے یا اسی شرط کے ساتھ قرض دیتا ہے کہ وہ اس کے گھر یا زمین سے فائدہ اٹھائے تو یہ صورت ناجائز ہے، کیوں کہ قرض دے کر شئی مرہون سے فائدہ اٹھانا ربا میں داخل ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔

لیس للمرتهن الانتفاع بالرهن لأن حق المرتهن الحبس إلى أن یستوفی دینه دون الانتفاع (۲)

کل قرض جر نفعا جرام فکره للمرتهن، سکنیٰ المرهونة بإذن الراهن (۳)

جائز صورت

جائز صورت رہن کی یہی ہے رہن میں رکھے گھر کا استعمال نہ کرے محض اعتماد بحال رکھنے کے لیے بطور امانت گھر کے کاغذات یا اس کی چابی وغیرہ رکھے۔ اگر گھر کو استعمال کرنا ہو تو (۱) مکمل کرایہ ادا کرے، (۲) یا پھر ماہانہ کرایہ قرضے میں سے منہا کرتے رہیں، (۳) یا پھر جتنا قرض دیا ہے اس مال کے بقدر اس گھر میں شریک ہوجائے، قرض لینے والا شخص گھر کے کچھ حصہ کو بیچ کر اس کو شریک کرلیں، پھر روپیہ ادا کرکے مکمل مکان حاصل کرلے یا جتنے روپے کی ضرورت ہے اتنا گھر اتنا سونا سامان فروخت کردیا جائے اور بھی جائز شکلیں ہوسکتی ہیں لیکن عام طور پر لوگ تیار نہیں ہوتے اور وہی یہودی ذہنیت کہ پیسہ بھی مل جائے اور کرایہ بھی نہ لگے، قرض اللہ کے لیے نہیں بلکہ سود حاصل کرنے گھر سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہی قرض دیا ہے اسی کو سود کہتے ہیں جو کہ حرام ہے، اللہ سے جنگ کا اعلان ہے۔

---

(۱) فتاویٰ مفتی محمود:۹/۴۱۱ (۲) مجمع الأنہر:۲/۵۸۷

(۳) در مختار:۷/۵۷۸، مستفاد: فتاویٰ قاسمیہ:۲۲/۸۲،۸۸

شئی مرہون سے نفع اٹھانے کا حیلہ

بعض لوگوں نے مرہون (گروی رکھے ہوئے سامان یا زمین) سے نفع اٹھانے کا یہ حیلہ نکالا ہے کہ مثلاً اسی روپیہ کے بدلے میں ایک زمین رہن (گروی) رکھی اور راہن (یعنی جس نے قرض لیا ہے اس) سے یہ شرط ٹھہرالی کہ یہ زمین ہم کو ایک روپیہ سالانہ کرایہ پر دے دو اور یہ کرایہ زرِ رہن (یعنی اسی قرض سے) کٹتا رہے گا، یہاں تک کہ اسی برس میں روپیہ ادا ہو جائے گا، اور زمین چھوڑ دی جائے گی اور اس سے پہلے چھوڑنا چاہیں تو اسی حساب سے جس قدر روپیہ باقی رہے گا وہ لے کر چھوڑ دیں گے، چونکہ ایک روپیہ سالانہ کرایہ زمین کا محض اس قرضے کے دباؤ سے ہے اور اوپر یہ قاعدہ معلوم ہو چکا ہے کہ جو رعایت قرض کی وجہ سے ہو وہ حرام ہے اس لیے یہ معاملہ حرام اور اس سے نفع اٹھانا خبیث ہے، جو نفع اٹھایا اس کو صدقہ کر دینا چاہئے۔(۱)

البتہ بیع الامانۃ کے طور پر فائدہ اٹھانے کی صورت یہ نکل سکتی ہے، یعنی جتنے روپے میں زمین کو رہن رکھا اتنے ہی روپے میں زبانی طور پر عقد کر لیا جائے کہ اتنے روپے میں مرتہن کے ہاتھ اس طور پر فروخت کر دے، کہ جب بھی زمین والا اتنے روپیہ مہیا کر کے مرتہن کو پیش کرے گا، تو دوبارہ اتنے روپے میں مالک کے ہاتھ فروخت کر دے گا۔

و صورته أن يقول البائع المشترى بعت منك هذا العين بدين
ذلك على أنى متى قضيت الدين فهو لى أو يقول البائع بعتك
هذا بكذا على أنى منى دفعت لك الثمن تدفع العين الىّ (۲)

فتاوی قاسمیہ میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ قرض کی واپسی تک اس کی زمین کو رہن میں لے کر اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے، ہاں البتہ زمین کا کرایہ متعین کر دیا جائے اور وہ کرایہ قرض کے روپیہ میں سے کٹتا جائے تو یہ جائز ہے یا الگ سے اس کا کرایہ متعین

---

(۱) صفائی معاملات:۲۶

(۲) البحر الرائق: ۵۴۶/۷

کرلیا جائے، چاہے اس کی مقدار کم زیادہ کچھ بھی ہو، تب بھی جائز ہے۔ ایسی صورت میں رہن کا معاملہ ختم ہوجائے گا اور اجارہ کا معاملہ ہوجائے گا۔(۱)

اس حوالے سے مفتی سلمان منصور پوری صاحب فرماتے ہیں کہ جواز کی شکل یہ ہے کہ پہلے مطلقاً بلا شرط بیع کرے اس کے بعد آپس میں یہ طے کرلیں کہ اگر میں اتنے پیسے لوٹادوں، تو میری چیز مجھے واپس کردیں تو دیانۃً معاہدہ صحیح ہوجائے گا۔ (اس کو بیع بالوفاء بھی کہتے ہیں)۔

و الصحیح أن العقد الذی جری بینهما ان کان بلفظ البیع لا یکون رهنا ثم ینظر : ان ذکرا شرط الفسخ فی البیع فسد البیع، و ان لم یذکرا ذلك و تلفظا بلفظة البیع بشرط الوفاء أو تلفظا بالبیع الجائز۔ الخ (۲)

رہن سبب ملک نہیں

رہن صرف ایک وثیقہ اور ذریعۂ اعتماد ہے جس سے مرتہن مرہونہ چیز کا مالک نہیں بن سکتا اس کا مالک راہن ہی رہے گا، جب چاہے مرتہن کو قرض ادا کرکے مرہونہ شئ واپس لے سکتا ہے، تاہم مالک قرض کی ادائیگی کے بغیر مرہونہ کی واپسی کا حق نہیں رکھتا۔(۳)

مرتہن کا بلا اجازت مرہونہ سے انتفاع

اگر مرتہن نے مالک کی اجازت کے بغیر مرہونہ سے فائدہ حاصل کیا تو مالک کو اس سے تاوان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ مفتی بہ قول کی رو سے جب مالک کی اجازت کے باوجود مرتہن کے لیے انتفاع لینا مرخص نہیں ہے تو اجازت کے بغیر یہ مالک کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے، اس لیے مالک اس سے ضمان کے مطالبہ کا حق محفوظ رکھتا ہے۔(۴)

(۱) فتاویٰ قاسمیہ:۲۲/۸۳ (۲) فتاویٰ قاضی خان:۲/۱۶۵، کتاب النوازل:۱۷/۱۴۵
(۳) فتاویٰ حقانیہ:۶/۲۲۸ (۴) فتاویٰ حقانیہ:۶/۲۲۹

راہن کی اجازت کے بعد انتفاع

زمین کے مالکوں میں جو ایک عام عادت ہے کہ زمین یا مکان رہن رکھ کر اس سے نفع اٹھاتے ہیں، یہ ہرگز جائز نہیں، اور بعض کتابوں کی عبارت سے جو شبہ پڑ گیا ہے (کہ راہن یعنی گروی رکھنے والے کی اجازت سے نفع اٹھانا جائز ہے، یہ غلط ہے) اس عبارت کا مقصود نفع کا حلال ہونا نہیں ہے کیونکہ یہ قاعدہ ''کل قرض جر نفعا فھو ربوا'' کے خلاف ہے جس کو تمام فقہاء قبول کر کے یہ قاعدہ مقرر کیے ہیں۔

بلکہ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ راہن کی اجازت کے بغیر مرتہن اس سے نفع اٹھائے تو اس پر غاصب ہونے کی وجہ سے ضمان لازم آتا ہے، اور اجازت دینے سے ضمان لازم نہیں آئے گا اور ضمان لازم نہ آنے سے حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

اور اگر کسی عبارت میں حلت یا اباحت کا لفظ پایا جائے تو وہ اس صورت میں ہے کہ معاملہ کے وقت اس شئ سے نہ نفع اٹھانے کی شرط ٹھہری ہو، نہ وہاں اس کا رواج ہو، نہ قرض کا دباؤ ہو، اتفاقاً بطورِ احسان وخیر خواہی کے نفع اٹھانے کی اجازت ہو جائے ایسی حالت میں نفع اٹھانا درست ہے، لیکن اس صورت میں وہ شئ رہن سے خارج ہو جائے گی اور عاریت (مانگی ہوئی چیز بن جائے گی) حتی کہ استعمال کرتے کرتے وہ سامان ہلاک ہو جائے یا خراب ہو جائے تو ضمان لازم نہ آئے گا، اور قرض میں نہ کٹے گا، اس کو خوب سمجھ لینا چاہئے، بعض لکھے پڑھے لوگ اس آفت میں مبتلا ہیں۔(۱)

مالِ رہن کو فروخت کرنا

بعضے لوگ خدمت خلق کے نقطۂ نظر سے کچھ سامان رکھ کر بلا سودی قرض دیتے ہیں، لوگ سامان (رہن میں) رکھ کر برسوں نہیں آتے، انتظار کے بعد وقت کے گزرنے کے بعد بھی نہیں آتے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے بعد سامان فروخت کر کے اس سے قرضہ وصول کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس حوالہ سے مولانا خالد

(۱) صفائی معاملات ص ۱۴، سود جوا رشوت قرض کے شرعی احکام ص: ۲۴، ۲۵

سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ آپ قرض دیتے وقت ان سے لکھا لیا کریں کہ اگر میں نے مقررہ تاریخ پر قرض ادا نہیں کیا تو ادارہ کو حق ہوگا کہ وہ میرا رہن رکھا ہوا سامان فروخت کر کے اپنا قرض وصول کرلے، ایسی صورت میں آپ کے لیے یہ بات جائز ہوگی کہ سامان رہن فروخت کردیں اور قرض وصول کرلیں اور باقی رقم محفوظ کردیں جب وہ آئے تو اسے ادا کردیں، رہن رکھنے والا مقروض ہی سامان کا اصل مالک ہوتا ہے، اس لیے جب اس کی اجازت نہ ہو سامان فروخت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

"ولیس للمرتهن ان يبيعه إلا برضاء الراهن لأنه ملكه وما رضي ببيعه"(۱)

البتہ بینک جب بطور رہن کوئی چیز وصول کرتا ہے تو اس کے معاہدہ میں عام طور پر لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اگر راہن دین ادا نہیں کرے گا تو بینک شئ مرہون کو فروخت کر کے اپنا حق وصول کرنے کا مجاز ہوگا اور اس پر راہن کے دستخط لیے جاتے ہیں، لہٰذا اس دستخط کی وجہ سے گویا راہن نے بینک کو وکیل بالبیع بنادیا اور وکیل بالبیع کا فروخت کرنا جائز اور درست ہے۔

"وإذا وكل الراهن المرتهن أو العدل أو غيرهما ببيع الرهن عند حلول الدين فالوكالة جائزة؛ لأنه توكيل ببيع ماله"(۲)

مرتہن کا راہن کے راشن کارڈ سے انتفاع

ایک صاحب کو پیسوں کی ضرورت تھی، انہوں نے سو روپے کے بدلہ اپنا راشن کارڈ، بنا رکھا ہے جس کے پاس کارڈ رکھا ہے وہ اس سے راشن لاکر استعمال کرتا ہے، حالانکہ مدت ہونے پر کارڈ اور پیسے جس کے تھے، اس کو واپس ملتے ہیں، تو اس شخص کا راشن لاکر کھانا درست ہے یا نہیں؟ اگر پیسے والا مدت پوری ہونے پر کارڈ واپس کردے

---

(۱) الهدایه علی هامش فتح القدير: ۵۳۸/۵، کتاب الفتاویٰ: ۳۸۷/۵

(۲) الهدایۃ: ۵۳۸/۴

اور پیسے نہ لے اور یہ کہہ دے کہ میں نے ان پیسوں کے بدلہ راشن لیا ہے تو ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کا راشن کارڈ سے راشن لاکر استعمال کرنا مطلقاً جائز نہیں؛ اس لیے کہ مرتہن کے لیے شیئ مرہون سے نفع اٹھانا شرعاً ربا میں داخل ہے، خواہ راہن نے انتفاع کی اجازت دی ہو یا نہ دی ہو۔

یکرہ للمرتهن أن ینتفع بالرهن و ان أذن له الراهن :قال فی المنح: لأنه أذن له فی الربا۔ الخ (۱)

تاہم راشن کارڈ سے اس نے جتنے پیسوں کا نفع اٹھایا ہے اتنا قرض تو خود بخود ساقط ہوجائے گا اور بقیہ حصہ اس کے معاف کرنے سے معاف ہوگا۔

گروی موٹرسائیکل استعمال کرکے اس کا کرایہ قرض میں محسوب کرنے کا حکم

بعض لوگ کسی سے قرض لیتے ہیں (مثلاً بیس ہزار روپے) اور اس کے عوض میں ایک اسکوٹر گروی رکھا دیتے ہیں اور اجازت بھی دیدتے ہیں کہ جب تک وہ رقم ادا نہ ہوجائے اس کی اسکوٹر استعمال کی جاسکتی ہے، تو یہ بھی شئ مرہون سے فائدہ اٹھانا ہے جو کہ جائز نہیں ہے، البتہ اگر استعمال کا کرایہ بازاری نرخ کے مطابق مقرر کرکے اسے قرض میں محسوب کیا جائے تو جائز ہے۔ (۲)

رہن سے متعلق اکیڈمی کا فیصلہ

شریعت میں رہن کا مقصد قرض کی وصولیابی کو یقین بنانا ہے، لہٰذا قرض دہندہ کے لیے مال مرہون سے استفادہ کرنا جائز نہیں یہ غریبوں کا استحصال اور سودخوری کا ایک ذریعہ ہے۔

---

(۱) شرح المجلة لخالد الأتاسی۔۔درمختار:۱۰/ ۸۳

(۲) فتاویٰ عثمانی:۳/ ۴۲۳

اگر قرض دہندہ مال مرہون سے فائدہ اٹھائے تو انتفاع کے بقدر رقم قرض منہا ہوجائے گی، یہاں تک کہ اگر قرض کی پوری رقم کے بقدر انتفاع کر چکا ہو تو مال مرہون بغیر کسی مطالبہ کے مقروض کو واپس کرنا واجب ہوگا۔

کسی بھی جائداد۔ دکان، مکان کو کرایہ پر لین دین کے لیے ضمانت کے نام سے لی جانے والی رقم شرعاً قرض کے حکم میں ہے۔

قرض کی بنا پر کرایہ میں مروجہ اجرت کے مقابلے میں غیر معمولی کمی (غبن فاحش) "کل قرض جر نفعا فھو ربا" کے تحت ناجائز ہے۔

اگر کوئی شخص سخت ضرورت مند ہو، اس کو نہ قرض حسنہ ملے اور نہ ہی رہن پر قرض ملے اور وہ نقد رقم حاصل کرنے کے لیے اپنی کوئی چیز کسی کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، جبکہ اس کا ارادہ ہو کہ بعد میں اس کو دوبارہ خرید لے گا تو اس کی گنجائش ہے البتہ واپس خریداری کا ذکر اس معاملے کے کرنے کے درمیان نہ کیا جائے بلکہ اس سے الگ باہمی معاہدہ ہوجائے کہ خریدار اسے اسی قیمت پر دوبارہ بائع کو فروخت کردے گا تو ایسا کرنا درست ہے۔(۱)

رہن اور اجارے میں فرق

بہت سے لوگ زمین یا گھر گروی (رہن کے طور پر) لیتے ہیں اور پھر اسے اجارہ کے معاملہ سے بدل دیتے ہیں، یعنی مرتہن راہن کے ساتھ یہ معاملہ کرلیتا ہے کہ جیسے پچاس ہزار روپے کے عوض تین کمروں کا مکان یا دکان گروی رکھا، اس طرح سے کہ دوسو روپے یا ہزار روپے اس مین سے کرایہ کے طور پر ہر ماہ کٹوادے گا تو کیا یہ معاملہ درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کرایے پر کوئی چیز دینے میں آزادی ہوتی ہے، جتنا چاہے کرایہ پر مکان دینے والا کرایہ طے کرے، لیکن صورت مسئولہ مین عام طور پر راہن کی

(۱) نیے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۲۰۲، ۲۰۳

مجبوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور مرتہن اپنی مرضی کا معاوضہ طے کرتا ہے، اس طرح کے معاملے میں عام طور پر ناجائز فائدہ اٹھانا پایا جاتا ہے اور جبر کے ساتھ مرتہن کا رہن سے بلاعوض معروفہ نفع حاصل کرنا سود ہے جو کہ ناجائز ہے۔

اگر کسی شخص کو قرض دے کر مکان گروی رکھ لیا تو اس گھر میں رہنا یا کسی اور استعمال میں لانا اس وقت تک جائز نہیں ہوگا جب تک بازار کے ریٹ کے مطابق اس کا پورا کرایہ والا معاملہ نہ کیا جائے، اور اس کرائے کے معاملہ کو رہن کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے؛ بلکہ یہ معاملہ الگ سے کیا جائے، یعنی شروع سے ہی اس کا آزادانہ معاملہ کیا جائے، یعنی وہ گھر یا مکان پچاس ہزار روپے کے عوض نہیں؛ بلکہ کرایے پر لینا طے ہو اور جب ایسا ہو تو اسے رہن کا معاملہ نہ کہا جائے، بلکہ اجارے کا معاملہ کہا جائے۔(۱)

مضاربت فاسدہ میں منافع حلال نہیں ہوتے

کسی سے رقم لے کر تجارت کرنا اور منافع میں اس کو حصہ دینا، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ یہ بات طے کر لی جائے گی کہ تجارت میں جتنا نفع ہوگا، اس کے اتنے فیصد رقم والے کو ملے گا اور اتنے فیصد کام کرنے والے کو اور اگر خدانخواستہ خسارہ ہوا تو یہ خسارہ بھی رقم والے کو برداشت کرنا پڑے گا یہ صورت جائز اور صحیح ہے:

”ومن شرطها أن يكون الربح بينهما مشاعا بحيث لا يستحق أحدهما منه دراهم مسماة“(۲)

”وما هلك من مال المضاربة، فهو من الربح دون رأس المال، فان زاد الهالك على الربح فلا ضمان على المضارب لأنه أمين“(۳)

---

(۱) شامی، کتاب الرہن

(۲) الجوهرة النيرة:۱/۲۷۵

(۳) هداية:۳/۲۶۷

دوسری صورت یہ ہے کہ تجارت نفع ہو یا نقصان اور نفع کم یا زیادہ ہر صورت میں رقم والے کو ایک مقررہ مقدار میں منافع ملتا رہے، یہ صورت جائز نہیں، یہ سود کے قبیل سے ہے اور یہ اموال مال حرام ہیں اور قابل رد ہیں، کام کرنے والے کو اجرتِ مثلیہ دیا جائے، باقی نفع رب المال مال لگانے والے کو دے دیا جائے۔(۱)

(۱) آپ کے مسائل اوران کا حل: ۷؍۱۲۵

کرنسی،نوٹ اقسام واحکام

ثمن کی دوقسمیں ہیں (۱) ثمن خلقی (۲) ثمن اصطلاحی

ثمن خلقی: جسے نقدین سے تعبیر کیا جاتا ہے صرف دو ہیں سونا اور چاندی۔

ثمن اصطلاحی: نقدین کے علاوہ کوئی بھی چیز جسے ثمن کی حیثیت دی گئی ہو۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ ثمن خلقی ہمیشہ ثمن ہی رہتا ہے اس کی ثمنیت کبھی ختم نہیں ہوتی، جبکہ ثمن عرفی لوگوں کی اصطلاح اور عرف پر مبنی ہے کہ جب تک لوگوں میں اس کا رواج اور چلن ہو اس کا حکم ثمن جیسا کہ رہتا ہے لیکن جب لوگ اس سے معاملہ کرنا ترک کردیں تو اس کی حیثیت عرض (سامان) کی سی بن جاتی ہے۔جیسا کہ درمختار میں ہے:

"وأما الفلوس فان رائجة فکثمن و الا فکسلع" فلوس جب تک رائج ہوں تو وہ ثمن کی طرح ہے ورنہ سامان کی طرح۔(۱)

پھر ثمن اصطلاحی کی دوقسمیں ہیں (۱) اصطلاحی خاص (۲) اصطلاحی عام

اصطلاحی خاص: یہ ہے کہ دو آدمی آپس میں کسی چیز کو ثمن مان کر بیع کرے۔

اصطلاحی عام: یہ ہے کہ حکومت یا ریاست اسے ثمن قرار دیکر لین دین کی عام اجازت دے مثلاً آج کل کی کرنسیاں۔

نوٹ کی حقیقت

نوٹ کی پشت پر اب سونا نہیں رہا ہے، کرنسی چاہے دھات کی ہو یا کاغذی نوٹ

---

(۱) شامی:۵/۲۷۰،ایچ ایم سعید کراچی

کی بذات خود اس کے ذریعہ انسان اپنی بھوک نہیں مٹا سکتا اور نہ ہی اپنے بدن کو چھپا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی تکلیف دور کی جاسکتی ہے، اس نوٹ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اس کے ذریعہ بازار سے کچھ چیزیں خریدی جاسکتی ہیں۔(۱)

کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ کرنسی نوٹ پہلے موجود نہیں تھا بعد میں وجود میں آیا ہے، اس لیے متقدمین فقہاء ومحققین کی کتابوں میں اس کا تذکرہ صراحت کے ساتھ نہیں ملتا ہے متأخرین فقہاء ومحققین کی اس بارے میں مختلف نظریات ہیں۔

پہلا موقف یہ ہے کہ نوٹ بذاتِ خود کوئی سامان یا مال نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت محض سند اور وثیقہ کی ہے، کیونکہ نوٹ تو محض دو پیسہ کا کاغذ ہے، اس میں ہزار پانچ سو کی مالیت کس طرح آسکتی ہے، علماء ہند میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ متوفی (۱۳۹۶ھ) اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ متوفی (۱۳۶۲ھ) اور مفتی محمد شفیع عثمانی متوفی (۱۳۹۶ھ) کی بھی یہی رائے ہے۔

دوسرا موقف اس کے بالکل برعکس ہے کہ نوٹ کی حیثیت محض مال اور سامان کی ہے، کیونکہ لین دین اور سارے معاملات نفس کاغذ ہی سے متعلق ہوتے ہیں اور کاغذ مال متقوم ہے، جس کی قدر و قیمت عرف ورواج کی وجہ سے بڑھ گئی ہے جیسے ہیرے جواہرات کہ انتہائی قیمتی ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت مال اور سامان کی ہوتی ہے، سونے چاندی کے احکام اس پر جاری نہیں ہوسکتے، یہی حیثیت کاغذی نوٹوں کی ہے۔

تیسرا موقف یہ ہے کہ کاغذی نوٹ دراصل نقدین (درہم ودینار) کے قائم مقام ہے؛ نہ تو ان کی حیثیت محض سند وحوالہ کی ہے، نہ ہی یہ سامان کے حکم میں ہے اور نہ ہی ان میں ثمنیت پائی جاتی ہے، لیکن چونکہ عرف ورواج کی وجہ سے یہ کاغذی نوٹ اصل ثمن ''سونا چاندی'' کے قائم مقام اور اس کا بدل ہیں؛ لہٰذا جو احکام اصل کے ہوں گے وہی

---

(۱) مستفاد: انعام الباری: ۶/۳۴۶، فقہی مقالات: ۱/۳۸

اس کے قائم بدل کے ہوں گے، یہی نظریہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی کا ہے۔

اوراب یہ بین الاقوامی عرف ثمن بن چکا ہے اور شریعت میں عرف عام کا اعتبار کیا گیا ہے، چنانچہ اس لیے یہ رائے زیادہ اہم ہے کہ موجودہ کرنسی نوٹ کو درہم ودینار کی جگہ ثمن قرار دیا جائے، کیونکہ کرنسی نوٹ اپنی ذات میں کوئی قیمت رکھتا ہی نہیں، لیکن اس کی حیثیت دین کے دستاویز اور سند کی بھی نہیں کہ اس کو جاری کرنے والا بینک اس کے بدلے چاندی یا سونا دے، کرنسی پر ادائیگی کا وعدہ ضرور لکھا ہوتا ہے مگر وہ روپیوں میں یعنی اگر کوئی شخص ایک سوروپے کا نوٹ رزروبینک میں لے جاکر ادائیگی کا مطالبہ کرے تو بینک والے سوروپے کے بدلے اس کو سونوٹ یا سوسکے نکال کر دے گا، اس لیے کہ بینک سونے چاندی کی شکل میں نوٹ کی قیمت ادا کرنے کا قانوناً ذمہ دار نہیں ہے، برخلاف ان نوٹوں کے کہ ہلاک ہونے کے بعد بھی حکومت اس کا بدل مہیا کرتی ہے۔

اس پس منظر میں نوٹ پر تحریر شدہ وعدہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ رہی یہ بات کہ کرنسی نوٹ کو ثمن قرار دینا کہ عرف عام اور قانون دونوں نے مل کر اس میں مالی قوت پیدا کردی؛ اس لیے اس کی حیثیت ثمن کی ہے، اگرچہ وہ فی نفسہ کاغذ کے بے قیمت پرزے ہیں، لیکن اس کے باوجود مال کے سب سے اعلیٰ قسم میں داخل ہے؛ اس لیے مال کی تعریف اس پر صادق آتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

”المال ماتميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة“(۱)

اور یہ آج انسان کی ضرورت کو پورا کرتی ہے، اس لیے کرنسی نوٹ کو عرف عام کی وجہ سے قانوناً ثمن قرار دیا گیا ہے فقہ اکیڈمی کا فیصلہ بھی اس بات پر ہوا کہ کرنسی نوٹ وسند حوالہ نہیں ہے، بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی وقانونی کی ہے۔(۲)

---

(۱)　شامی: ۵۰۱/۴، کراچی

(۲)　اسلام اور جدید اقتصادی مسائل: ۳۹۹۔۴۰۰

کرنسی نوٹ کا رواج

یہ نوٹ کیسے رائج ہوا؟ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ شروع میں مغربی ملکوں میں اس کا رواج ہوا اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لوگ اپنا سونا چاندی جو ان کے پاس بچا ہوا تھا اس کو لے جا کر کسی سنار کے پاس بطورِ امانت رکھ دیتے تھے اور وہ سنار ان کو ایک رسید لکھ کر دیتا تھا کہ فلاں شخص کے اتنے دینار یا اتنے درہم یا اتنی چاندی کے سکے یا اتنے سونے کے سکے میرے پاس محفوظ ہیں، اب اس کو جب ضرورت پڑتی وہ رسید دکھاتا اور اپنی ضرورت کے بقدر سونا نکلوا لیتا۔

ہوتے ہوتے یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ مثلاً ایک شخص بازار گیا اور کچھ سامان خریدنا چاہا تو طریقہ یہ تھا کہ مشتری پہلے سنار کے پاس جائے وہاں سے اپنا سونا لے کر آئے اور پھر سامان خریدے اور بائع پھر وہی سونا لیجا کر سنار کے پاس رکھواتا۔

لیکن اب مشتری نے یہ کہنا شروع کیا کہ بجائے اس کے کہ میں جا کر سنار سے سونا لیکر آؤں اور تمہیں دوں اور تم پھر وہی سونا لے جا کر تم اسی سنار کے پاس رکھو اس طول وعمل سے بچنے کے لیے ایسا کرتے ہیں کہ تم مجھ سے یہ رسید لے لو، میں اس کو تمہارے نام لکھ دیتا ہوں اور دستخط کر دیتا ہوں کہ اس کا حقدار فلاں تاجر ہے۔

بائع نے کہا ٹھیک ہے اور اس نے اسے قبول کر لیا اور دونوں آنے جانے کی طوالت سے بچ گیے اور رسید بطورِ ثمن کے استعمال ہو گئی۔

سناروں کو جب یہ پتا چلا کہ ہماری رسیدیں بطور آلہ تبادلہ کے استعمال ہو رہی ہیں اور انہوں نے دیکھا کہ بازار میں ہماری رسیدوں کا چلن ہو گیا ہے تو پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ سنار صرف اتنی رسیدیں جاری کرتے تھے جتنا ان کے پاس سونا ہوتا تھا، لیکن جب سناروں نے دیکھا کہ اب لوگ ہمارے پاس سونا لینے نہیں آتے اور اپنی رسیدوں کے ساتھ معاملات نمٹاتے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ ایسا کیوں نہ کریں کہ کچھ رسیدیں اپنی طرف سے جاری کر دیں کیونکہ اگر بالفرض ان کے پاس ایک کروڑ روپے کا سونا ہے اور

انہوں نے ایک کروڑ کی رسیدیں جاری کی ہیں تو مہینے میں بیس لاکھ افراد بمشکل سونا نکلوانے آتے ہوں گے باقی اسی لاکھ رسیدوں کا سونا ہمارے پاس فالتو پڑا رہتا ہے لوگ سونا نکلوانے کے بجائے رسیدوں سے ہی اپنے معاملات نمٹاتے ہیں، انہوں نے ایسی رسیدیں جاری کرنی شروع کر دیں جن کی پشت پر سونا نہیں تھا، یعنی ان کے پاس ایک کروڑ کا سونا تھا اور انہوں نے ڈیڑھ کروڑ کی رسیدیں جاری کر دیں، اب ان ڈیڑھ کروڑ کی رسیدوں سے باقاعدہ کاروبار ہونے لگا، خرید وفروخت ہونے لگا۔

بعد میں انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور یہ کہا کہ جو لوگ ان سے قرضہ مانگنے آتے ہیں ان کو قرض میں سونا دینے کے بجائے رسیدیں دے دیتے اور کہتے کہ بھائی تمہارا مقصد اس سے حاصل ہو جائے گا، جو چیزیں خریدنا چاہتے ہو اس سے خرید لو، اس طرح معاشرہ میں ان رسیدوں کا رواج وضع ہو گیا اور اسی کا نام نوٹ ہے۔

شروع میں انفرادی طور پر تجار یہ کام کرتے تھے، بعد میں ساروں نے بینک کی شکل اختیار کر لی، یہ بنک بن گئے، اور بینکوں نے نوٹ جاری کرنے شروع کر دیے، بعد میں حکومت نے دیکھا کہ بہت سارے بینک یہ نوٹ جاری کرتے ہیں اور پھر وہ نوٹ آلہ تبادلہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو حکومت نے یہ قانون بنا دیا کہ بینکوں کو یہ نوٹ جاری کرنے کا حق نہیں ہے، لہٰذا صرف حکومت کا بینک نوٹ جاری سکتا ہے۔

شروع میں یہ تھا کہ اگر کسی کے ذمہ کوئی قرضہ ہے یا کسی کو پیسے دینے ہیں اور وہ پیسوں کے بجائے اس کو نوٹ دے تو وہ لینے پر مجبور نہیں تھا یعنی فرض کریں کہ کسی نے تاجر سے جا کر سامان خریدا اور اس کے ذمہ پیسے واجب ہو گئے، اب اگر وہ اس کو پیسوں کے بجائے رسید دینا چاہے تو تاجر کو یہ حق تھا کہ وہ یہ کہے کہ میں یہ رسید نہیں لیتا، مجھے اصل سونا لا کر دو، لیکن بعد میں ایک وقت ایسا آیا کہ حکومت کی طرف سے قانون بن گیا کہ یہ نوٹ لیگل ٹینڈر رہیں یعنی زرقانی ہیں، اب کوئی شخص ان کو لینے سے انکار نہیں کر سکتا، اب اس کو لینا ہی پڑے گا۔

ابتدا میں بینکوں پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ جتنے نوٹ جاری کرتے ہیں ان کے پاس اتنا سونا ہونا ضروری ہے، لیکن بعد میں یہ قانون ختم کردیا گیا اور یہ کہا گیا کہ پورا سونا ہونا ضروری نہیں لیکن ایک خاص تناسب سے سونا ہونا چاہیے یعنی جتنے نوٹ جاری کیے ہیں ان کا مثلاً دو تہائی سونا ہونا چاہیے، بعد میں دو تہائی کو کم کرکے ایک تہائی کردیا، ایک چوتھائی کردیا، نسبتیں بدلتی چلی گئیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ ساری دنیا کے ملکوں کے پاس سونا کم ہوگیا صرف امریکہ ایک ایسا ملک تھا جس کے پاس سونا وافر مقدار میں موجود تھا۔

اب جن ممالک کے پاس سونا کم تھا اور نوٹ زیادہ جاری ہوگئے تھے انہوں نے یہ سوچا کہ ہمارے پاس اتنا سونا تو نہیں ہے کہ ہم ہر حامل نوٹ کو جو بھی آئے اس کو سونا ادا کریں! اس واسطے انہوں نے آپس میں یہ طے کرلیا کہ اگر ہم کسی وقت یہ سونا ادا نہ کرسکے تو سونے کے بدلے ہم امریکی ڈالر ادا کردیں گے اور امریکہ یہ کہتا تھا کہ چونکہ میرے پاس سونا وافر مقدار میں موجود ہے لہٰذا میں اپنی ذمہ داری قبول کرتا ہوں کہ میرے پاس جو بھی ڈالر لے کر آئے گا میں اس کے بدلے سونا دوں گا، تو صورت ایسی تھی کہ دنیا کے سارے ممالک نوٹ کی پشت پر ڈالر رکھتے تھے، اور ڈالر کی پشت پر سونا تھا، تو جب ڈالر کی پشت پر سونا ہوا تو بالواسطہ ان دونوں کی پشت پر سونا ہوا، پہلے بلاواسطہ ہوا کرتا تھا اب بالواسطہ ہوگیا، جیسے مثلاً انگلینڈ میں کسی نے اسٹرلنگ پاونڈ لے جا کر بینک کو دیا کہ ہمیں اس کے بدلے میں سونا دو، اب بینک اسٹرلنگ پاؤنڈ کے بدلے سونا تو نہ دیتا لیکن یہ کہتا کہ چاہو تو ڈالر لے لو اور ڈالر لے کر جب امریکہ کے بینک کے پاس جاؤ گے تو وہ سونا دیدے گا، تو اس طرح بالواسطہ پشت پر سونا ہوا۔

۱۹۷۱ء میں ایسا ہوا کہ امریکہ میں سونے کا شدید بحران آیا، لوگوں نے محسوس کیا کہ سونے کی کچھ کمی ہورہی ہے تو امریکہ کے بینکوں کے پاس ہجوم لگ گیا جس کو دیکھو ڈالر لے کر جارہا ہے کہ مجھے سونا دو، ہزاروں اور لاکھوں افراد بیک وقت جا کر امریکی بینکوں

کے پاس اکھٹے ہو گئے اور کہنے لگے کہ ڈالر کے بدلے سونا دو۔

امریکہ نے محسوس کیا تو اس طرح تو سونے کے ذخائر ختم ہو جائیں گے اور میں قلاش ہو جاؤں گا، جو سونا میرے پاس ہے وہ جاتا رہے گا، چنانچہ ۱۹۷۱ء میں سونے کے بحران کے موقعہ پر امریکہ نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ میں بھی سونا نہیں دیتا جو چاہو کر لو۔ اب ڈالر کے بدلے سونا نہیں دوں گا، البتہ جس کے پاس ڈالر ہے وہ اس کے ذریعہ بازار سے جو چیز چاہے خریدے، سونا خریدے، چاندی خریدے جو چاہے خریدے لیکن میں سونا دینے کا پابند نہیں ہوں۔

تو ۱۹۷۱ء وہ سن ہے جس میں نوٹ کی پشت پر سے سونا بالکل ختم ہو گیا۔ اب اس کی پشت پر نہ بالواسطہ اور نہ بلاواسطہ سونا ہے۔(۱)

خلاصہ: یہ کہ کرنسی نوٹ کا وجود زمانہ قدیم میں نہیں تھا؛ کیونکہ پہلے لوگ اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے کرتے تھے، بعد میں کرنسی وجود میں آئی ہے، شروع میں مغربی ملکوں میں اس کا رواج ہوا اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ لوگ اپنا سونا چاندی جو ان کے پاس ہوتا تھا اس کو لے جا کر کسی سنار کے پاس بطورِ امانت رکھ دیتے تھے اور وہ سنار ان کو رسید وثیقہ لکھ کر دے دیتا کہ فلاں شخص کا اتنا سونا اور چاندی میرے پاس محفوظ ہے، اس طرح سے لوگوں کا اعتماد سناروں پر ہونے لگا تو لوگوں نے اس رسید کو بیع وشراء میں بطورِ ثمن استعمال کرنا شروع کر دیا، اس طرح سے کاغذی نوٹ کا وجود ہوا۔

اس زمانہ میں پوری دنیا کے اندر یہی نوٹ اصل سکہ کی جگہ چلتے ہیں اور تمام معاملات میں یہی نوٹ اصل سکہ کی طرح رائج ہے۔

نوٹ مثلی ہے یا قیمی؟

خلقی ثمن سونا چاندی کو فقہاء نے مثلی مانا ہے، سوال یہ ہے کہ نوٹ مثلی ہے یا قیمتی؟ یعنی ایک شخص کے نوٹ دوسرے شخص کے ذمہ واجب الادا ہوں تو وہ ان نوٹوں کو انہیں

(۱) انعام الباری: ۶/ ۳۳۴-۳۳۶

جیسا ادا کریں یا اس کی قوتِ خرید کا اعتبار ہوگا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس امر کی تعیین کریں کہ مثلی اور قیمتی کے کیا حدود ہیں؟ مثلی کی تعریف فقہاء نے ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ اشیاء جن کی مقدار ناپ تول کے ذریعہ معلوم کی جائے۔

معلوم ہوا کہ موجودہ نوٹ مثلی ہی ہے، گو فقہاء کی زبان میں کیلی یا وزنی نہیں، لیکن عددی متفاوت ہیں، لیکن ایک ہی وقت میں دونوٹ مثلاً پانچ روپے کے دونوٹ کی مالیت ایک ہی ہوتی ہے اوران کی قدر میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا، جیسا کہ فقہاء نے دراہم ودنانیر کو بھی فلوس کی طرح مثلی شمار کیا ہے۔

وأما مصنوع لایختلف کالدراهم والدنانیر والفلوس وکل ذلك مثلی (۱)

اور اسی طرح بنائی ہوئی چیزیں جیسے دراہم ودنانیر اور پیسہ مختلف نہیں اور وہ تمام مثلی ہیں۔(۲)

ایک ملک کی کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ

فقہی قاعدہ کے مطابق قدر یا جنس کے مختلف ہونے کی صورت میں تفاضل جائز ہوتا ہے اور ادھار ناجائز، تو ایک ملک کی کرنسیوں کے تبادلہ میں بھی تفاضل بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

لیکن موجودہ دور میں سونا چاندی ذریعہ تبادلہ نہیں رہا، اور کاغذی نوٹوں کے ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے، حکومت کے قوانین بھی کاغذی نوٹوں کو مکمل طور پر ثمن (زر اصطلاحی وقانونی) کی حیثیت دیتے ہیں اور بحیثیت ثمن نوٹوں کو قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں غرضیکہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت عرف اور رواج میں زر قانونی کی ہوگئی ہے۔

---

(۱) طحطاوی علی الدر: ۱۰۲/۴

(۲) حوالہ سابق ص: ۴۰۱

لہٰذا موجودہ دور کی علامتی کرنسی نوٹ کے تبادلہ کے مسئلہ میں امام مالکؒ اور امام محمدؒ کا قول اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ سکے ثمن اصطلاحی بن کر رائج ہو چکے ہیں تو جب تک تمام لوگ اس کی ثمنیت کو باطل قرار نہ دیں، اس وقت تک صرف متعاقدین (بائع اور مشتری) کے باطل کرنے سے اس کی ثمنیت باطل نہ ہوگی۔ جب ثمنیت باطل نہیں ہوئی تو وہ متعین کرنے سے متعین نہیں ہوں گے، لہٰذا ایک سکے کا دوسکوں سے تبادلہ جائز نہ ہوگا۔ خواہ متعاقدین (بائع اور مشتری) نے انہیں اپنی حد تک معین ہی کیوں نہ کرلیا ہو۔

مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری فرماتے ہیں کہ کرنسی کے احکام ذووجہین ہیں یہ من وجہٍ ثمن ہے اور من وجہ سامان ہے حکومت کے اعتباریت پر ثمن ہے لہٰذا ان میں ثمنیت کا بھی اعتبار ہوگا اور چونکہ خلقۃً ثمن نہیں ہے اس لیے سامان ہونے کا بھی اعتبار ہوگا دونوں پہلوؤں کا لحاظ کرتے ہوئے احکام مرتب ہوں گے۔(١)

اس حوالہ سے فتاوی حقانیہ میں لکھا ہے کہ

"آج کل دنیا میں رائج الوقت کرنسی نوٹوں کی حیثیت ثمن عرفی کی ہے جن کو ہم فلوس نافقہ کہہ سکتے ہیں ۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فلوسِ نافقہ کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے، اس لیے ان کے ہاں ایک ہی ملک کی کرنسی کا تبادلہ باہمی کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ لیکن امام محمد علیہ الرحمۃ کے نزدیک جائز نہیں، اس لیے کہ آج کل پوری دنیا میں کاغذی کرنسی کا رواج ہے سونا چاندی بالکل مبیعہ ہوکر رہ گئی ہے، اگر اس کے تبادلہ میں تفاضل کی اجازت دیدی گئی تو سود کا دروازہ کھل جائے گا، لہٰذا امام محمد علیہ الرحمۃ کے قول کے مطابق کرنسی نوٹوں

(١) تحفۃ الالمعی: ٤/ ١٥٥۔١٥٧

کے تبادلہ میں تفاضل کو ناجائز قرار دینا چاہئے''۔(۱)

چنانچہ ایک ملک کے نوٹوں کا آپس میں تبادلہ تفاضل کے ساتھ جائز نہیں ہے برابر سرابر ہونا ضروری ہے، پھر یہ برابری تعداد اور گنتی کے لحاظ سے نہیں دیکھی جائے گی بلکہ نوٹوں کی ظاہری قیمت کے اعتبار سے دیکھی جائے گی، اس لیے کہ پچاس روپے کی ایک نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے پانچ نوٹوں کے بدلہ جائز ہوگا، اور یہ بھی اس وقت ہے جب کہ مجلس عقد میں فریقین میں سے کوئی ایک بدلین (مبیع اور ثمن) میں سے ایک پر قبضہ کرلے، اور اگر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی مجلس عقد میں نوٹوں پر قبضہ نہیں کیا اور قبضہ سے پہلے الگ ہوگئے تو بیع درست نہیں ہوگی، کیونکہ فلوس متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے جب تک کہ قبضہ نہ کیا جائے اور جب کسی نے قبضہ نہ کیا تو ادھار کی بیع ادھار کے بدلہ ہوئی جو ''بیع الکالی بالکالی'' ہے اور حدیث میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ نہی عن بیع الکالی بالکالی (۲)

ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادھار کی بیع ادھار کے بدلے کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح ایک ملک کی وہ کرنسی جو مختلف الاجناس ہیں مثلاً ایک طرف گلٹ کے روپئے، اور دوسری طرف کاغذ کے نوٹ، یہ گو مختلف الاجناس ہیں لیکن ان میں بھی تفاضل کے ساتھ تبادلہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ یہ امثال مساویہ ہیں، گلت کا سکہ رواج اور چلن دونوں حیثیت سے کاغذی نوٹ کے مساوی ہے؛ اس لیے اس میں بھی تفاضل جائز نہ ہوگا۔

کیونکہ فلوس میں تفاضل جائز قرار دینے کی صورت میں سود کا دروازہ کھل جائے گا اور ہر سودی کاروبار اور لین دین کو اس مسئلہ کی آڑ بنا کر اسے جائز کر دیا جائے گا، مثلاً اگر

---

(۱) فتاویٰ حقانیہ:٦/٢٠٩

(۲) مشکوۃ:١/٢٤٨

قرض دینے والا اپنے قرض کے بدلے سود لینا چاہے گا تو وہ اس طرح سے بآسانی لے سکے گا کہ قرضدار کو اپنی کرنسی نوٹ زیادہ قیمت میں فروخت کرے گا اور اپنے قرض کے بدلے سود حاصل کرے گا۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب وغیرہ علماء کرام کی رائے یہی ہے اور اسلامی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ اور مفتی شفیع صاحبؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ (۱)

غالب گمان یہ ہے کہ وہ تمام فقہاء جنہوں نے ایک سکے کو دو سکوں سے تبادلہ کو جائز قرار دیے ہیں، ہمارے موجودہ دور میں باحیات ہوتے اور کرنسی کی تبدیلی کا مشاہدہ کرتے تو وہ ضرور اس معاملہ کی حرمت کا فتویٰ دیتے، جس کی تائید بعض متقدمین فقہاء کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ (۲)

مختلف ممالک کی کرنسیوں کا تبادلہ

دو ملک کی کرنسیاں دو مختلف اجناس ہیں، اس لیے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے اور یہی فقہ اکیڈمی انڈیا کا فیصلہ ہے۔

لیکن یہاں بھی دونوں جانب سے ادھار جائز نہ ہوگا؛ بلکہ ایک جانب سے مجلس میں قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے مثلاً ہندوستانی کرنسی کا تبادلہ سعودی ریال سے کی جائے تو کرنسی پر یا ریال پر مجلس عقد میں قبضہ ضروری ہوگا (۳) البتہ احتیاط یہ ہے کہ دونوں عوضوں پر مجلس ہی میں قبضہ ہو جائے یہی اکیڈمی کا بھی فیصلہ ہے۔ (۴)

---

(۱) امداد المفتیین: ۱/۶۱۶

(۲) مستفاد: اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۱۵۶-۱۶۳ ج ۳، فقہی مقالات ص: ۳۱-۳۸ ج ۱، نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۴۲

(۳) حوالہ سابق

(۴) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کا فیصلہ ص: ۱۶۹

خلاصۂ کلام (۱) ایک ملک کی کرنسی کا آپس میں تبادلہ تفاضل کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار؛ بلکہ برابری ضروری ہے، البتہ اگر برابری کے ساتھ صرف ایک جانب سے ادھار ہوتو جائز ہے جانبین سے ہوتو ناجائز ہے۔

(۲) مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف الجنس ہیں اس لیے اس میں تفاضل کے ساتھ ادھار بھی جائز ہوگا بشرطیکہ ادھار ایک جانب سے ہو دونوں جانب سے نہ ہو ورنہ جائز نہ ہوگا۔ اور دونوں جانب ادھار نہ ہونا یہ زیادہ محتاط ہے۔

پرانے کرنسی نوٹ نئے نوٹوں کے ساتھ کم قیمت پر تبدیل کرنا

پرانے کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے لیے طریقۂ کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص پھٹے پرانے نوٹ نئے نوٹوں سے تبدیل کرنا چاہتا ہے تو بینک اس سے کچھ کٹوتی کرتا ہے مثلاً سو ۱۰۰ روپے کے پھٹے پرانے نوٹ کے بدلے میں نئے نوٹ پانچ یا دس روپے کم ملتے ہیں تو کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

تو اس کے لیے جاننا چاہیے کہ مروجہ کرنسی کی حیثیت فلوس نافقہ کی ہے اس میں صفت ثمنیت عرف کی وجہ سے آئی ہے، فلوس نافقہ کی باہمی تفاضل کے ساتھ بیچنے میں احناف کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابویوسف رحمہ اللہ کے ہاں ان کی باہمی بیع تفاضل کے ساتھ جائز ہے جبکہ امام محمد رحمہ اللہ کا قول مفتی بہ ہے، مگر پھٹے پرانے نوٹوں کا بینک کے ساتھ تبادلے میں کافی پیچیدگیاں ہیں، لہٰذا ان پیچیدگیوں کی وجہ سے شیخین کے فتویٰ کی بنا پر پھٹے پرانے نوٹوں کو نئے نوٹوں کے ساتھ کمی بیشی پر تبدیلی کرنا جائز ہے۔

كما قال العلامة مرغيناني رحمہ اللہ: ويجوز بيع الفلس بالفلسين بأعيانها عند ابى حنيفة وأبى يوسف رحمہ اللہ و قال محمد لا يجوز (۱)

مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی اس حوالہ سے فرماتے ہیں:

---

(۱) الهداية على صور البناية: ۱۰/ ۴۱۷، فتاوی حقانیہ: ٦/ ۲۱۵، ۲۱٦

''اگر ملکی کرنسی پھٹ جانے کی وجہ سے مارکیٹ میں اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ جائے اور اس روپے سے کوئی دوسری چیز خریدی نہ جاسکتی ہو، کوئی تاجر لینے کے لیے تیار نہ ہو تو اگر بآسانی بینک میں دے کرنئی اور صحیح کرنسی حاصل کی جاسکتی ہے تو کم قیمت میں فروخت کرنا جائز نہ ہوگا، لیکن اگر آسانی کے ساتھ بینک سے صحیح کرنسی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے بلکہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے تو گویا کہ علاقہ میں اسکی حیثیت عرفیہ گھٹ گئی ہے اور چونکہ یہ ثمن عرفی ہے اس کی ثمنیت کا مدار عرف پر ہے تو جس قدر اس کی حیثیت گھٹ جائے گی اسی قدر کم پیسے میں اس کو فروخت کرنا جائز ہوگا، مگر اس میں شرط یہ ہے کہ معاملہ اور لین دین دست بدست ہو اس لیے کہ اس کی حیثیت عرفیہ گھٹ جانے کی وجہ سے اگرچہ مختلف القدر ہو گیا ہے لیکن فی الجملہ کسی حد تک یعنی سرکاری سطح پر ثمنیت باقی ہونے کی وجہ سے اتحاد جنسیت باقی ہے، نیز فتاویٰ محمودیہ کے حاشیہ میں حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب دامت برکاتہم کی عبارت بھی اسی حکم کی تائید کرتی ہے''۔(۱)

لیکن مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری فرماتے ہیں

''پھٹے ہوئے نوٹوں اور اچھے نوٹوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، جتنے پھٹے ہوئے نوٹ ہوں اتنے ہی اچھے نوٹ اس کے بدلہ میں ہونے ضروری ہیں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجلس میں لین دین ہو جائے، ادھار معاملہ نہ ہو۔

ہدایہ آخرین میں ہے:

وإن كان الغالب عليهما (الدراهم و الدنانير) الغش فليسا في

(۱) ایضاح النوادر: ۱۲۸۔۱۲۹

حکم الدراهم و الدنانير ۔۔الی قوله ۔۔فان بيعت بجنسها متفاضلاً جاز صرفاً للجنس الى خلاف الجنس فهى فى حكم شيئين فضة و صفر و لكنه صرف حتى يشترط القبض ۔۔۔الی ۔۔۔قال رضی الله عنه و مشائخنا لم يفتوا بجواز ذلك فى العدالى و الغطارفة لأنها أعزّ الأموال فى ديارنا فلو أبيح التفاضل فيه ينفتح باب الربوا (هدايه آخرين، ص:۹۳،کتاب الصرف)

عصر حاضر کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ اب نوٹ ثمن حقیقی کے مشابہ ہے۔
فتاوی محمودیہ میں ہے: یہ اس وقت کا حکم ہے جب چاندی کا روپیہ عام طور پر ملتا تھا اب روپیہ عام طور پر زیادہ مقدار میں نہیں ملتا، سب جگہ نوٹ ہی چالو ہے، لہٰذا اب نوٹ ہی بہ منزلہ سکہ کے ہے اور اس کے ذریعہ سے زکوۃ بھی ادا ہو جاتی ہے''۔فقط (فتاوی محمودیہ ۳:۵۹ کتاب الزکوۃ حاشیہ:۱)

''اہم فقہی فیصلے'' میں لکھا ہے: (۱) کرنسی نوٹ سند وحوالہ نہیں بلکہ ثمن ہے اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زر اصطلاحی و قانونی کی ہے۔

(۲) عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر ثمن خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے اس لیے کہ کرنسی نوٹ بھی احکام میں ثمن حقیقی کے مشابہ ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی بیشی کے نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار (اہم فقہی فیصلے ۱۷، دوسرا فقہی سمینار، ناشر اسلامک فقہ اکیڈمی) فقط واللہ اعلم بالصواب۔۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۱۵ھ۔(۱)

---

(۱) فتاوی رحیمیہ:۵/۳۱۸

کرنسی نوٹ کا نصابِ زکوۃ

گذشتہ گفتگو سے نوٹ کی شرعی حیثیت معلوم ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارے زمانے میں صرف یہی ذریعہ تبادلہ رہ گیا ہے۔نوٹ کو ثمن عرفی جاننے اور مال کا اطلاق اس پر صحیح قرار دینے کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے کہ پھر اس کا نصاب زکوۃ کیا ہے؟ کرنسی نوٹ کی قیمت چاندی کے نصاب تک پہونچ رہی ہوتو زکوۃ واجب ہوگی خواہ ایک ہزار نوٹوں سے وہ نصاب مکمل ہوجاتا ہو رہی یہ بات کہ سونے کے بجائے چاندی کو کیوں معیار بنایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سونے کے مقابلہ میں چاندی میں انفع للفقراء کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔یہی اسلامی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ ہے۔(۱)

کرنسی نوٹ سے قرض کی ادائیگی

نوٹ کو ثمن عرفی ماننے کے بعد دیون (مؤخر مطالبے مثلاً قرض مہر، پنشن اور ادھار خریداری کی رقم وغیرہ) کی ادائیگی کے وقت اسی مقدار کو ملحوظ رکھا جائے گا جو لیا گیا تھا، اس میں نہ کمی کی جائے گی نہ زیادتی، خواہ نوٹ کی قدر کم ہی کیوں نہ ہوجائے، بہر حال اگر نوٹوں سے قرض کا معاملہ کیا جائے تو جتنی مدت کے بعد بھی اس کی ادائیگی ہوگی بعینہ اسی مقدار کے نوٹ واپس کرنا ضروری ہے، ایک روپیہ کا اضافہ بھی جائز نہیں ہے، ورنہ یہ سود ہوجائے گا۔مثلاً کسی نے اگر دس سال قبل سو روپئے قرض لیے تھے اور قرض کی ادائیگی آج کررہا ہے تو سو روپئے واپس کرے گا زیادہ لینا دینا سود ہوگا۔(۲)

کرنسی نوٹ اور دراہم ودنانیر کے احکام میں فرق

کرنسی نوٹ اگرچہ ہمارے زمانے میں اسی طرح کا ثمن بن چکا ہے جس طرح کہ پہلے درہم ودنانیر تھے؛ لیکن اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے بالکل مماثل نہیں ہیں:

۱) سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ نوٹ کو ثمنیت عرف عام کی وجہ سے حاصل ہوتی

---

(۱) ملاحظہ ہو: نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۱۴۳

(۲) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل: ۴۰۲، ۴۰۳

ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر عرف تبدیل ہو جائے یا حکومت اس کو غیر معتبر قرار دے تو یہ کاغذ کا بے قیمت پرزہ رہ جائے گا، اس کی ساری ثمنیت ختم ہو جائے گی، اس کے برخلاف درہم ودنانیر کی ثمنیت خلقی ہے، اس کی ثمنیت عرف عام کے تابع نہیں ہے، اگر عرف عام میں اس کا رواج موقوف ہو جائے یا حکومت اس کا اعتبار ختم کر دے تو بھی ان کی ذاتی ثمنیت ختم نہیں ہوتی۔

۲) سونا چاندی کی زکاۃ کا نصاب شریعت نے خود مقرر کیا ہے اس لیے کہ اس کا نصاب ذاتی ہے، اس کے برخلاف نوٹ فی نفسہ کوئی قیمت نہیں رکھتے، اس لیے چاندی کے نصاب کے بقدر اگر اس کی قیمت پہونچ جائے تو زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، الغرض نوٹ کی نصابیت سونا چاندی کی نصابیت کے تابع ہے۔

۳) نوٹ کی قیمت اور جنس ممالک کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے امریکہ کا ڈالر عرب کا ریال اور ہندوستان کا روپیہ سب نوٹ ہی ہیں اس لیے یہ سب مختلف الاجناس کے حکم میں ہے اور جب جنس کا اختلاف ہو جائے تو ربا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کوئی شخص ایک امریکی ڈالر کو ہندوستانی ۵۰ روپے کے عوض فروخت کرے تو اس کی گنجائش ہے اور اسے ربا نہیں کہہ سکتے، اور اس کے برخلاف درہم ودینار کی قیمت دنیا کے ہر گوشہ میں یکساں رہتی ہے، ممالک کے اختلاف سے نہ ان کی قیمت میں فرق آتا ہے اور نہ ان کے جنس کی تبدیلی ہوتی ہے، اس لیے کوئی ہندوستانی آدمی امریکہ کے کسی باشندے سے ایک درہم یا دینار کی بیع دو درہم یا دو دینار کے عوض یا وزن کے اعتبار سے کمی بیشی کے ساتھ کرے تو یہ ناجائز ہے اور ربا میں داخل ہے۔

۴) کرنسی نوٹ پر اگر حکومت کی جانب سے وعدۂ زر کی عبارت نہ ہو تو اس کی قیمت نہیں ہے، جبکہ درہم ودینار اس قسم کی عبارت کی محتاج نہیں ہیں۔(۱)

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے جدید فقہی مسائل: ۴/۲۴

نوٹ کے عوض میں سونا چاندی خریدنا

نوٹ (موجودہ کرنسی) دیکر سونا چاندی خریدنے سے متعلق کہ آیا یہ خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ اس حوالہ سے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ﷫ تحریر فرماتے ہیں:

نوٹ سے چاندی خریدنا درست نہیں، اول اس نوٹ کو کسی سے بھنالے، پھر روپے سے چاندی خریدے اور ربوٰ سے بچنے کی وہی مشہور تدبیر کرے کہ کم چاندی کی طرف پیسے ملائے۔

لیکن اس پر حاشیہ لکھتے ہوئے مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی تحریر فرماتے ہیں:

یہ حکیم الامت حضرت والا تھانوی ﷫ کے زمانہ کے اعتبار سے تھا، اب حکم دوسرا ہے، اب حکم یہی ہے کہ کاغذی نوٹ کے عوض میں سونا اور چاندی کا خریدنا بلاشبہ جائز ہے نیز چیک کے ذریعہ سے بھی خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہے، اس میں کم وزیادہ ہر طرح سے خریدنا جائز ہے، ہاں البتہ دونوں جانب ادھار جائز نہیں اور کم از کم ایک جانب سے قبضہ لازم ہے تاکہ بیع الکالی بالکالی لازم نہ آئے۔

فینبغی للعلماء الیوم أن یعیدوا النظر فی فتاواهم السابقة، ویتفکروا فی ما افتی به امثال الشیخ الساعاتی والشیخ الکنوی ﷫ ونجعله رحمه الله الی تغیر الأحوال واشتداد الحاجة، لأن التعامل بها قد شاع فی سائر البلدان بحیث لا توجد فیها العملة المسکوکة إلا إذا نذر قلیلا فالحکم بعدم حداء الزکوة بأوراق العملة وبحرمة شراء الذهب والفضة بها فیه حرج عظیم، والمعهود من الشریعة السمة فی مثله السعة والسهولة، والعمل بالعرف العام المتفاهم بین الناس الخ (۱)

(۱) تکملة فتح الملهم: ۱/ ۵۲۰، امداد الفتاویٰ جدید مطول: ۶/ ۴۲۴

سونے چاندی کی خرید وفروخت نقدی ہو

بعضے لوگ سونا چاندی خریدنے کے لیے جاتے ہیں اور گھر والوں کو پسند کرانے کے لیے گھر لاتے ہیں پھر بعد میں دوسرے دن یا کچھ عرصے کے بعد اس کی رقم بیچنے والے کو دیتا ہے تو یہ خرید وفروخت درست نہیں ہے، جب یہ معاملہ کرنا ہو تو دونوں طرف سے نقد معاملہ کیا جائے، ادھار نہ کیا جائے، اس لیے گھر والوں کو دکھانے کے لیے جو چیز لی گئی تھی اس کو دوکان دار کے پاس لے آئے اس کو نقد دام ادا کر کے وہ چیز لے جائے۔(۱)

مسئلہ: گزشتہ زمانے میں روپیہ چاندی کا ہوتا تھا اور ریزگاری (روپیوں کا کھلا، چھٹن لینا) دوسری دھات سے بنتی تھی اس لیے ان کے درمیان کمی بیشی کے ساتھ بیع جائز تھی، لیکن موجودہ دور میں روپیہ لوہے اور کاغذ سے بنتا ہے اس لیے ریزگاری کے ساتھ تبادلہ کے وقت کمی بیشی ناجائز ہے اور وہ بھی نقد ہونا ہے۔(۲)

مسئلہ: ڈالر میں لیا ہوا قرضہ ڈالر ہی سے ادا کرنا ہوگا۔(۳)

مسئلہ: جتنا سونا وزن کر کے قرض لیا تھا، اتنا ہی واپس کرنا چاہیے قیمت کا اعتبار نہیں۔

مسئلہ: ہندوستانی مسلمانوں کے لیے امریکہ، لندن، اٹلی، چین وغیرہ ممالک جو دار الحرب ہیں، ان کے ان بینکوں سے سود حاصل کرنا جائز ہے جو بینک خود ان ہی ممالک میں موجود ہوں؛ لیکن خود ان ممالک کے باشندوں کو وہاں کے بینکوں سے سود حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔(۴)

کرنسی اور سونے چاندی کے مسائل

بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ قرض دے کر جبراً زائد

---

(۱) مستفاد از آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/۵۸

(۲) حاشیہ فتاوی محمودیہ: ۱۶/۲۴۰، آپ کے مسائل اور انکا حل: ۷/۵۹

(۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/۱۹۰

(۴) فتاوی قاسمیہ: ۲۰/۲۵۶

رقم کا مطالبہ کرنا ہی سود ہے، باقی جو فریقین کی رضامندی، معاملہ یا معاہدہ کی شکل میں جو طے ہو جائے وہ سود نہیں ہے، دین و شریعت کے منافی نہیں ہے؛ بلکہ معاشرہ اور مارکٹ میں نیے نئے ناموں کے ساتھ ایسی ایسی خرید و فروخت کی شکلیں رائج ہوتی جارہی ہے بالخصوص سونے چاندی کی خرید و فروخت میں سود کا بازار ایسا گرم ہوتا جارہا ہے کہ اب ان مروّجہ شکلوں کو سود کا نام دینے سے بھی گریز کیا جارہا ہے، جبکہ یہ ساری مروّجہ شکلیں، اللہ سے اعلان جنگ اور سود میں شامل ہے۔

ذیل میں سونے چاندی کے خرید و فروخت کی چند سودی غیر سودی شکلیں ذکر کی جارہی ہیں:

۱- سونے کی مٹی (۱) کی سونے کے عوض اور چاندی کی چاندی کے عوض میں خرید و فروخت صرف اس وقت جائز ہے جب دونوں طرف سے سونے چاندی کا وزن یکساں ہو اور لین دین بھی ہاتھ در ہاتھ ہو۔

۲- مخالف جنس کے عوض بھی خرید و فروخت ہر طرح سے جائز ہے مثلاً سونے کی مٹی چاندی کے عوض اور چاندی کی مٹی سونے کے عوض اگرچہ دونوں کے وزن میں فرق ہو؛ البتہ ہاتھ در ہاتھ لین دین ضروری ہے۔

۳- روپوں کے عوض میں خواہ وہ کتنے ہی ہوں اس مٹی کی خرید و فروخت جائز ہے۔

۴- سونے کی کمیٹی یعنی ہر ماہ جتنے شرکاء ہیں ایک خاص مقدار میں سونا دیتے ہیں اور ہر ماہ جس کے نام قرعہ نکل آئے سارا سونا اسے دے دیا جاتا ہے یہ صورت صحیح اور جائز ہے۔

۵- بعض لوگ بولی والی کمیٹی ڈالتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قرعہ اندازی

---

(۱) زرگروں کے کام میں سونے اور چاندی کے ذرّے جھڑتے ہیں جو ان کے کام کی جگہ میں بکھر جاتے ہیں اور مٹی میں مل جاتے ہیں، زرگر جگہ کی صفائی کرتے ہیں تو مٹی کو پھینکتے نہیں؛ بلکہ اس کو جمع کر لیتے ہیں، پھر کچھ لوگ اس کو خرید کر اس میں سے سونا چاندی علیحدہ کر لیتے ہیں۔

کرنے کے بجائے کمیٹی کی نیلامی کرتے ہیں اور جوزیادہ بولی لگائے کمیٹی کی رقم یا سونا اس کے حوالے کرتے ہیں، مثلاً کمیٹی کا کل سونا ۱۰ ارتولہ ہے، زید نے سب سے زیادہ بولی لگا کر ۱۱ ارتولہ سونے کے عوض میں ۱۰ ارتولہ سونا لیا، زائد بولی یعنی نفع کا ایک تولہ سونا کمیٹی کے شرکاء میں تقسیم کردیا جاتا ہے یہ صورت کھلے سود کی ہے اور حرام ہے۔

۶- لکی (Lucky) کمیٹی جس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ قرعہ اندازی سے جس کی پہلی کمیٹی نکلے اس کو باقی ادائیگی معاف ہوگی، جوا ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

۷- دوتولے سونا اور ایک تولہ چاندی کو ایک تولہ سونا اور پچاس تولے چاندی کے عوض فروخت کرنا صحیح ہے اور یوں سمجھیں گے کہ دوتولے سونا پچاس تولے چاندی کے عوض میں اور ایک تولہ چاندی ایک تولہ سونے کے عوض میں ہے ایسا ہم اس وقت سمجھیں گے جب خرید وفروخت کرنے والوں نے اپنی زبان سے کچھ اور نہ کہا ہو۔

اور اگر انہوں نے یوں کہا کہ دوتولہ سونا ایک تولے سونے کے عوض میں اور ایک تولہ چاندی پچاس تولے چاندی کے عوض میں، تو اب ان کی تصریح کے ہوتے ہوئے ان کی تصریح کا اعتبار ہوگا اور معاملہ سود کا ہوجائے گا۔

۸- اپنی انگوٹھی کسی کی انگوٹھی سے بدل لی جائے تو دیکھا جائے گا کہ اگر دونوں پر نگ لگا ہے تب تو ہر حال میں یہ تبادلہ جائز ہے، لیکن اگر دونوں (انگوٹھیاں) سادی یعنی بے نگ کی ہوں تو دونوں کے وزن کا برابر ہونا شرط ہے، اگر ذرا بھی کمی بیشی ہوجائے تو سود ہوجائے گا۔

۹- اگر ایک پر نگ ہے اور دوسری سادی ہے تو اگر سادی انگوٹھی میں زیادہ چاندی ہو تو یہ تبادلہ کرنا جائز ہے ورنہ حرام اور سود ہے۔

۱۰- اسی طرح اگر اسی وقت دونوں طرف سے لین دین نہ ہوا ایک نے تو ابھی دے

دی اور دوسرے نے کہا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں فلاں جگہ سے آ کر دوں گا تو یہاں بھی سود ہو گیا۔

۱۱- اگر کوئی ایسی چیز ہے کہ چاندی کے علاوہ اس میں کچھ اور بھی لگا ہے، مثلاً بازو بند کے اندر لاکھ بھری ہوئی ہے یا اس پر نگ جڑے ہیں یا انگوٹھیوں پر نگینے لگے ہیں یا بازو بند میں لاکھ تو نہیں ہے؛ لیکن دھاگوں میں کندھے ہوئے ہیں، ان چیزوں میں سے کسی ایک کو (مثلاً: تین تولے) چاندی کے عوض خریدا تو دیکھیں اس چیز میں کتنے وزن کی چاندی ہے؟ قیمت کی چاندی کے برابر ہے، یا اس سے کم ہے، یا زیادہ ہے؟ اگر قیمت کی چاندی سے اس چیز کی چاندی یقیناً کم ہو، مثلاً دو تولہ ہو تو یہ معاملہ جائز ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں قیمت کی دو تولہ چاندی زیور کی دو تولہ چاندی زیور کی دو تولہ چاندی کے عوض ہو جائے گی اور قیمت کی ایک تولہ چاندی لاکھ یا دھاگوں یا نگینوں کے عوض ہو جائے گی، اور اگر زیور کی چاندی برابر ہو یعنی ۳ر تولے ہو یا زیادہ ہو یعنی چار تولے ہو تو سود ہوگا۔

۱۲- نیا زیور خریدنے کے لیے گاہک اپنا پرانا زیور دکاندار کے پاس لاتا ہے اس زیور کی روپوں میں قیمت علیحدہ طے کی جاتی ہے اور نیا زیور جو گاہک لینا چاہتا ہے اس کی قیمت علیحدہ مقرر کی جاتی ہے ان دو قیمتوں میں جو فرق ہو صرف اس کا لین دین کر لیا جاتا ہے، تبادلہ میں بسا اوقات ایسی صورت بھی پیش آتی ہے کہ مثلاً پرانے سادہ غیر جڑاؤ زیور کا وزن ۵ر تولہ ہے اور قیمت تین لاکھ روپے طے ہوئی؛ کیوں کہ نئے زیور میں مزدوری اور چھیجت بھی شامل کی جاتی ہے اس صورت میں صرف دونوں زیوروں کا تبادلہ نقد روپوں کا کوئی دخل نہیں ہوا، تو یہ طریقہ ناجائز ہے اور سود ہو گیا۔

۱۳- آج کل فاریکس (Forex) اور کامیکس (Comex) کے نام سے کاروبار

کرنے والی نئی کمپنیاں وجود میں آئی ہیں، اس کاروبار کی تفصیلات سامنے آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کاروبار کی وہ تمام تر صورتیں جو عام طور سے اختیار کی جاتی ہیں ناجائز ہیں۔

کاروبار کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص 10,000 ڈالر کمپنی میں جمع کرا کے اس اسکیم کا رکن بن سکتا ہے، کمپنی والے پھر اس کی رہنمائی کرتے ہیں کہ وہ کب اور کونسی کرنسی یا جنس خرید لے کہ جس کو بعد میں فروخت کر کے نفع کی امید کی جاسکتی ہے، ہر کرنسی یا شئ کی خرید کی کم سے کم مقدار مقرر ہوتی ہے جس کو Lot یا کھیپ کہا جاتا ہے۔

کمپنی اپنے مؤکلین اور دنیا کے مختلف تجارتی مراکز میں موجود دلالوں کے درمیان کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام کرتی ہے، ہر سودا جو کمپنی کراتی ہے اس پر وہ 50 یا 60 ڈالر کمیشن لیتی ہے خواہ سودے میں مؤکل کو نفع ہو یا نقصان ہو یا نہ نفع ہو نہ نقصان،۔

پھر جو شئ خریدی اگر خریداری کے دن ہی فروخت کر دی گئی تو کمپنی صرف اپنی کمیشن وصول کرے گی اور اگر فروخت میں کچھ دن لگ گیے تو کمپنی کمیشن کے علاوہ ۵/ یا ۶/ ڈالر یومیہ کے حساب سے سود وصول کرے گی، بعض صورتوں میں موکل کو سود ملتا ہے، ایمپائر ریسورسز (Empire Resources) کمپنی اس کی وضاحت یوں کرتی ہے:

Interest / Premiun are paid or charged basing on the number of cloys for aposition trade

۞ Spot / Casklrading

فاریکس (Forex) اور کامیکس (Comex) کے کاروبار کی مختلف قسمیں ہیں ان میں سے ایک کیش ترلانگ (Cashtroding) ہے۔

کمپنی کی اپنی وضاحت کے مطابق وہ اپنے مؤکل اور دلالوں کے درمیان رابطہ کراتی ہے اور کمیشن پر سودے کرواتی ہے، اس صورت میں سودا کمپنی کے گاہک (مؤکل)

اور تجارتی مرکز میں موجود دلال کے مابین ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ مؤکل پوری رقم کی ادائیگی نہیں کرتا اس لیے کرنسی اور سونے چاندی کی خرید کی صورت میں سودا دو وجہ سے ناجائز ہے:

۱- یہ دَین (ادھار) کی دَین (ادھار) کے عوض بیع ہے، بائع اور خریدار دونوں کی جانب سے ادھار ہے؛ کیوں کہ نہ تو بائع نے خریدار کو خرید کردہ سونے چاندی پر قبضہ دیا اور نہ ہی خریدار نے قیمت کی ادائیگی کی۔

۲- خرید پر جتنے دن گزریں گے خریدار یعنی مؤکل کو یومیہ کے حساب سے سود ادا کرنا پڑے گا۔(۱)

- صرف، ثمن مطلق کو ایک دوسرے کے عوض فروخت کرنے کا نام ہے، یعنی سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، یا ان دو میں سے ایک جنس دوسری جنس کے عوض، اس بیع کا حکم یہ ہے کہ:
- اگر دونوں بدل ایک جنس کے ہیں تو تماثل (مساوی) ہونا ضروری ہے۔
- بیع صرف میں ادھار جائز نہیں خواہ بیع صرف ہم جنس میں ہوں یا مخالف جنس (سونا، چاندی) میں ہو۔
- اسی طرح اس بیع میں اٹکل سے معاملہ کرنا بھی درست نہیں۔
- مجلس ہی میں دونوں پر قبضہ ضروری ہے۔
- ڈھلا ہوا سونا چاندی اور خام سونا چاندی کا حکم یکساں ہے، لہٰذا ڈھلا ہوا سونا (مثلاً زیور) خام سونے (ٹکڑا یا بسکٹ) کے عوض فروخت کیا جائے تو مساوات واجب ہے، اسی طرح مجلس میں تقابض بھی ضروری ہے۔
- سونا چاندی میں دوسری دھات کی ملاوٹ ہو اور وہ مغلوب ہو تو یہ (سونا مع غش)

(۱) مستفاد: سونے چاندی کے زیورات اور ان کے اسلامی احکام- ڈاکٹر مفتی عبد الواحد صاحب (جامعہ دار التقوی)۔

خالص سونے کے حکم میں ہے؛ لہٰذا اس مخلوط سونے کو خالص سونے کے عوض یا ایسے مخلوط سونے کے کچھ حصے کو دوسرے مخلوط حصے کے عوض بیچنا جب ہی درست ہوگا کہ دونوں عوض وزن میں مساوی ہوں، چاہے دونوں عوض میں پائی جانے والی ملاوٹ کی مقدار میں فرق ہو، اور بیع صرف ہونے کے سبب اس میں بھی تقابض فی المجلس ضروری ہوگا۔

- بیع صرف میں جو تقابض شرط ہے وہ حسی ہونا بھی ضروری ہے، بیع کی دیگر اقسام کے برعکس یہاں فقط تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہ ہوگا۔
- بیع صرف میں خیار شرط جائز نہیں۔
- ہم جنس ہونے کی صورت میں کاغذی نوٹوں کا باہم تبادلہ کمی بیشی یا ادھار کے طور پر جائز نہیں، چنانچہ ایک روپیہ دو روپیوں کے عوض یا ایک نقد روپیہ، ادھار دو روپیوں کے عوض بیچنا درست نہیں، ایسا کرنا سود ہوگا۔
- البتہ اگر جنس مختلف ہو جیسے پاکستانی روپیہ سعودی ریال کے عوض بیچا جائے تو کمی بیشی درست ہے، اور ادھار بھی اس شرط کے ساتھ درست ہے کہ دونوں میں سے ایک عاقد اس جنس پر قبضہ کرلے جو اس نے خریدی ہے، بھلے دوسری جنس ادھار ہو، دوسری شرط یہ بھی ہے کہ یہ تبادلہ عقد کے دن کے بھاؤ کے مطابق طے پائے۔
- نوٹ: یہ حکم ہندو پاک کے علماء کی رائے کے مطابق ہے، جو فلوس کے متعلق امام محمدؒ کے قول پر مبنی ہے، مؤلف نے (فقہ البیوع میں) موقفِ ثالث کے تحت اسی کو راجح قرار دیا ہے جب کہ جمہور علماء عرب کا موقف یہ ہے کہ کاغذی نوٹ کا تبادلہ خواہ ہم جنس کرنسی سے ہو یا مختلف کرنسی سے ہو، اس میں تقابض فی المجلس ضروری ہے اور ادھار بھی حرام ہوگا۔ ہاں چیک کی وصولی بھی قبضہ سمجھا جائے گا اور بھنانے یا بینک انٹری میں درکار وقت سے صرف نظر کرلیا جائے گا۔
- سود کے حرام ہونے میں دار الاسلام اور دار الحرب یکساں ہیں۔

- معدنی یا کاغذی ثمن عقودِ صحیحہ میں متعین کرنے سے متعین نہ ہوں گے لہٰذا مشتری نے عقد کے وقت کسی ثمن کی طرف اشارہ کیا ہو اس کے باوجود بھی اس کے لیے جائز ہے کہ دوسرا ثمن ادا کرے۔
- قبضۂ حقیقی یہ ہے کہ مبیع حسی اعتبار سے بائع کے قبضہ (ہاتھ) میں ہو اور قبضہ حکمی سے مراد تخلیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بائع کسی رکاوٹ کے بغیر جب چاہے اس پر حسی قبضہ کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔

تخلیہ تمام مبیعات میں قبضہ کے قائم مقام ہے، خواہ وہ چیز مکیلی ہو، موزونی ہو، عددی ہو یا زمین ہو۔ سوائے بیع صرف کہ اس میں تخلیہ قبضہ کے قائم مقام نہیں، بلکہ حسی قبضہ ضروری ہے۔(۱)

- اس کے علاوہ سونے چاندی کے خرید وفروخت کے آن لائن تجارت کی مختلف صورتیں بدلتے ناموں کے ساتھ آئے دن پیدا ہوتی جارہی ہیں، جو سود، سٹہ، ادھار، عدم قبضہ وغیرہ شرعی خرابیوں پر مشتمل ہونے کے باعث ناجائز اور حرام ہیں۔

لہٰذا ایسے جدید طرقِ بیع کو اختیار کرنے سے قبل اس کی مکمل قسموں کو سمجھنا اور کسی تجربہ کار ماہر مفتی سے رہبری حاصل کرنا ضروری ہے۔

---

(۱) اسلامی قانونِ خرید وفروخت ص: ۳۵، ۳۶، ۶۳، ۶۵

جائز ناجائز اسکیمیں اور متفرقات

پراویڈنٹ فنڈ

سرکاری اور پرائیوٹ محکموں میں یہ رواج عام ہے کہ ملازمین کی تنخواہ میں سے کچھ حصہ لازماً محکمہ کی طرف سے ہر مہینہ کاٹ لیا جاتا ہے اور ملازم کے اختیار کا اس میں دخل نہیں ہوتا ہے، فرض کریں، اگر کسی آدمی کی تنخواہ دس ہزار روپے ہے تو اس کی تنخواہ میں سے ہر مہینے مثلاً پانچ سو روپے کاٹ لیے جاتے ہیں، پھر تمام ملازمین کی تنخواہ میں سے جو رقم کاٹی جاتی ہے اس کو ایک فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے، اس فنڈ کو پرائیوڈنٹ کہتے ہیں اور مختصر الفاظ میں اسے P.F بھی کہتے ہیں، اس میں ہوتا یہ ہے کہ محکمہ اپنی طرف سے اس فنڈ میں وضع کردہ رقم کے بقدر رقم کا اضافہ کرتا ہے، پھر ملازمین کی کاٹی ہوئی رقم اور محکمہ کی طرف سے اضافہ کردہ دونوں رقموں کو ملا کر حکومت کسی نفع بخش کام میں لگاتی ہے، آج کل سودی کاروبار میں عموماً لگایا جاتا ہے، پھر اس پر جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کو بھی حکومت اس فنڈ میں جمع کرتی رہتی ہے اور جب ملازم کی ملازمت ختم ہو جاتی ہے تب اس فنڈ میں اس کی جمع شدہ ساری رقم اس کو یا اس کے ورثاء کو دیدی جاتی ہے، اس سے ملازم کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس کو بہت بھاری رقم اکٹھی مل جاتی ہے اس کو پراویڈنٹ فنڈ کہتے ہیں۔(۱)

پراویڈنٹ تین چیزوں کا مجموعہ ہے

مذکورہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ پراویڈنٹ میں انتہاء ملازمت پر جو رقم

---

(۱) انعام الباری:۶/۴۵۰

ملتی ہے اس کے تین حصے ہوتے ہیں (۱) ایک حصہ وہ ہے جو اس کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے (۲) دوسرا وہ حصہ ہے جو حکومت یا محکمہ نے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کیا ہے (۳) تیسرا وہ حصہ ہے جو اس فنڈ کی رقم کو نفع بخش کاروبار میں لگایا گیا ہے۔

اور عام طور سے وہ نفع بخش کاروبار سود کا ہوتا ہے، بینک میں رکھوا دیا جاتا ہے، اور اس پر سود لیا جاتا ہے یا عام ڈپازٹ سرٹیفکٹ کے خریدنے میں صرف کیا جاتا ہے اور اس پر سود لیا جاتا ہے اور جب ملازم کو پراویڈنٹ فنڈ ملتا ہے تو اس میں تینوں قسموں کی رقمیں شامل ہوتی ہیں اصل رقم جو تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے وہ بھی ہوتی ہے، محکمہ کی طرف سے جمع کردہ رقم اور سود کی رقم بھی ہوتی ہے۔(۱)

پراویڈنٹ کی قسمیں

پراویڈنٹ کی دو قسمیں ہیں:

۱) ایک جبری طور پر کاٹی جاتی ہے جس میں ملازم کی مرضی واجازت کا دخل نہیں ہوتا، حکومت یا محکمہ ملازمین کی تنخواہوں میں سے بیمہ کے نام سے کاٹ لیتی ہے۔

۲) اختیاری طور پر کاٹی جاتی ہے جس میں ملازم کی رضا ورغبت ہوتی ہے ملازم کی اجازت سے محکمہ کچھ رقم کاٹ لیتا ہے پھر سود کے ساتھ حوالہ کرتا ہے۔

پرویٹ فنڈ کا حکم (اکابر کی نظر میں)

یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ ہمارے اکابر نے جہاں بھی پراویڈنٹ فنڈ کے مسئلہ کو چھیڑا ہے اور مطلق پراویڈنٹ کہا ہے تو اس سے جبری پراویڈنٹ فنڈ ہی مراد ہوتا ہے اختیاری نہیں ہوتا کیونکہ زمانے میں جو عام ہے وہ جبری پراویڈنٹ فنڈ ہی ہے اختیاری نہیں ہے اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حضرات اکابر کی گفتگو کو سمجھنا چاہیے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

---

(۱) انعام الباری:۶/۴۵۰

''تنخواہ کا کوئی جز اس طرح وضع کرادینا اور پھر یکمشت وصول کرلینا اگرچہ اس کے ساتھ سود کے نام سے کچھ رقم ملے یہ سب جائز ہے کیونکہ یہ تبرع ابتدائی ہے، گو گورنمنٹ اس کو اپنی اصطلاح میں سود ہی کہے''۔(۱)

حضرت مولانا مفتی نظام الدین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''پراویڈنٹ فنڈ کے سلسلہ میں جو زائد رقم محکمہ دیتا ہے اس پر سود کی تعریف کا صادق نہ آنا تو ظاہر ہے، اس لیے کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی رقم کے برابر جو محکمہ رقم ملاتا ہے وہ رقم تو ملازمت کے شروع ہی میں طے شدہ ہوتی ہے اور اس کے علاوہ جو زائد رقم محکمہ خود ملاتا ہے خواہ بینک میں جمع رکھنے کی وجہ سے نفع ملے یا کسی اور طریقہ سے، یہ سب محکمہ کا ذاتی فعل ہے، ملازم کا اس میں کوئی مطالبہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا لینا بھی درست ہے''۔(۲)

اور مفتی محمود حسن گنگوہی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں کہ

''یہ جزو تنخواہ ملازم نے خود جمع نہیں کیا بلکہ یہ سلسلہ حکومت نے اپنے قانون کے پیشِ نظر جاری کیا ہے جس سے ملازم کی خیر خواہی مقصود ہے، جب تک اس پر ملازم کا قبضہ نہ ہو یہ ملازم کی ملکیت نہیں، لہٰذا اس پر جو بھی اضافہ ملتا ہے یہ بھی سود نہ ہوگا بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض محکموں میں ملازمت ختم ہونے پر حسن کارکردگی کے صلہ میں پنشن ملتی ہے اس کو بھی سود نہیں کہا جاتا ہے''۔(۳)

---

(۱) امداد الفتاویٰ جدید مطول: ۶/ ۵۹۷

(۲) منتخب نظام الفتاویٰ: ۱/ ۲۰۸، ۱۹۳

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۱۶/۳۹۴

حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی دامت برکاتہم نے لکھا ہے:

''ملازم کو ریٹائر پر اس مد میں سے ملنے والی پوری رقم کا لینا اور اپنے خرچ میں لانا شرعاً جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔(۱)

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ ''مفتی شفیع صاحب علیہ الرحمہ'' کے ایک ایک رسالہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ ملازمین کا جو پراویڈنٹ فنڈ کاٹا جاتا ہے اور ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد ان پر سود کے نام سے جو رقم دی جاتی ہے وہ شرعاً سود نہیں ہے۔(۲)

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے جبری پراویڈنٹ فنڈ کے تعلق سے لکھا ہے:

''جبری طور پر جو رقم کاٹی جاتی ہے اور محکمہ خود اپنی طرف سے ایک طرفہ طور پر جو اضافہ کرتا ہے یہ دونوں قسم کی رقمیں تو بلاشبہ ملازم کے لیے حلال ہیں، اسی طرح اگر محکمہ ان رقموں سے حلال اور جائز کاروبار کر کے ملازم کو کچھ نفع دیتا ہے تو وہ بھی حلال ہے اور اگر ان دونوں رقموں کو حرام کاروبار میں لگاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو محکمہ خود اپنی ذمہ داری میں یہ کام کرتا ہے یا ملازم کی ذمہ داری میں کر دیتا ہے، اگر اپنی ذمہ داری میں یہ کام کر کے نفع ملازم کو دیتا ہے تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں اور اگر ملازم خود جا کر وصول کرے اور نفع حاصل کرے تو اس کا لینا جائز نہیں ہے''۔(۳)

کفایت المفتی میں ہے:

---

(۱) موجودہ مسائل اوران کا حل ص:۱۰۷

(۲) آپ کے مسائل اوران کا حل: ۳۲۸/۷

(۳) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ۳۴۹: بحوالہ مفتی تقی عثمانی ڈاٹ کام

''پراویڈنٹ فنڈ پر جو رقم محکمہ کی طرف سے دی جاتی ہے اور اسی طرح دونوں کے مجموعے پر سود کے نام سے بڑھائی جاتی ہے یہ سب رقم جائز ہے یہ شرعاً سود نہیں، اگرچہ محکمہ اس کو سود کے نام سے موسوم کرتا ہے''(۱)

یہی رائے مفتی شبیر احمد قاسمی دامت برکاتہم کی بھی ہے۔(۲)

اختیاری پراویڈنٹ فنڈ (اکابر علماء کی نظر میں)

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ ''مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ'' کے ایک رسالہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اگر ملازم نے اس کو خود کٹوایا تو اس پر جو زائد رقم ''سود'' کے نام سے ملتی ہے وہ سود تو نہیں لیکن سود کے مشابہ ہے اس سے احتراز کیا جائے تو بہتر ہے۔(۳)

لیکن حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جو رقم ماہانہ کاٹنے کی آپ نے اپنی مرضی سے منظوری دی ہے اور اس پر سود کے نام سے جو رقم چلے گی وہ سود ہوگی؛ کیونکہ وہ آپ کی ذاتی رقم کے حساب میں دی گئی ہے''۔(۴)

حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

''پراویڈنٹ فنڈ اگر اپنے اختیار سے کٹوائی جائے تو اس پر جو رقم محکمہ بنام سود دیگا اس سے اجتناب کیا جائے؛ کیونکہ اس میں ربا کی مشابہت بھی ہے اور سود خوری کا ذریعہ بنا لینے کا خطرہ بھی ہے، اس لیے اس کو وصول نہ کرے، اگر وصول کرے تو صدقہ کر دے''۔(۵)

---

(۱) کفایت المفتی: ۸/ ۹۷، فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۶۷

(۲) فتاویٰ قاسمیہ ۲۰/۴۱۶

(۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۲۸

(۴) فتاویٰ رحیمیہ: ۵/ ۱۴۷

(۵) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ص: ۳۵۰ بحوالہ مجموعۃ الجواہر فی مسائل الحاضر ص ۸۸

اس حوالہ سے مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی فرماتے ہیں:

’’کچھ لوگ اس وجہ سے کہ انکم ٹیکس نہ لگ جائے اپنا پراویڈیٹ فنڈ زیادہ کٹوانے لگتے ہیں، اور کچھ لوگ پراویڈیٹ فنڈ اس لیے زیادہ کٹواتے ہیں کہ تا کہ زیادہ سے زیادہ ان کی رقم جمع ہوجائے تا کہ رٹائرڈمنٹ ہونے پر وہ کام آئے تو یہ جائز ہوگا، مگر اس پر جو اضافہ ملے گا وہ سود ہوگا، اس کو بلا نیتِ ثواب صدقہ کرنا ہوگا، اور انکم ٹیکس میں دینا بھی جائز ہے۔

اور کچھ لوگ اس لیے زیادہ کٹواتے ہیں کہ اگر نوکری کے درمیان اچانک بیماری کی وجہ سے پیسوں کی ضرورت پڑ جائے یا خوشی کرنا پڑ جائے تو ضرورت کے حساب سے پیسہ نکال سکیں، تو اس طرح جمع کرانا اور وصول کرنا جائز ہے، لیکن اگر جمع کرنے کے بعد نکالنے کی ضرورت نہ پڑے اور رٹائرڈمنٹ کے وقت اس پر اضافہ مل جائے تو وہ بھی سود کے حکم میں ہے، اس کو اپنے تصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ بلا نیت ثواب یا فقراء کو دیدے یا انکم ٹیکس وغیرہ میں دیدے‘‘۔(۱)

البتہ مفتی تقی عثمانی صاحب کا فتویٰ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ

’’احتیاط تو اسی میں ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کے طور پر جو رقم ملازم نے اپنے اختیار سے کٹوائی ہے اس پر ملنے والی زیادہ رقم کو صدقہ کردیا جائے لیکن شرعی نقطۂ نظر سے یہ زیادہ کی رقم سود کے حکم میں نہیں ہے، اس لیے اسے اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش ہے، البتہ احتیاطاً صدقہ کرنا ہے، اور یہ صدقہ ایسا ہے کہ اپنے بیوی بچوں اور دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں پر بھی صرف کیا جاسکتا ہے‘‘۔(۲)

---

(۱) فتاویٰ قاسمیہ (۲) فتاویٰ عثمانی:۲۷۸،۳۰۸

اور دین اسلام ڈاٹ کام پر مفتی تقی عثمانی صاحب اس طرح لکھتے ہیں:

''اختیاری طور پر جو رقم کاٹی جاتی ہے اس پر محکمہ جو رقم بنام سود دیتا ہے اس سے اجتناب کیا جائے؛ کیونکہ علماء کی تحقیق کے مطابق یہ بعینہ سود اگرچہ نہیں ہے؛ لیکن ربا کی مشابہت ضرور موجود ہے اور یہ سودخوری کا ذریعہ بن سکتا ہے؛ اس لیے یہ رقم وصول نہ کرے اگر کریں تو صدقہ کردے''۔(۱)

خلاصۂ بحث: خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جبری PF پر ملنے والی ساری رقموں کا لینا درست ہے البتہ اختیاری PF میں سود کی رقم کا لینا درست نہیں مگر یہ کہ صدقہ کردے۔

مدرسہ میں پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ جیسے سرکاری ملازمت میں ہوتا ہے اسی دینی اداروں میں بھی اب رواج پا رہا ہے اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ادارہ ملازمین کی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک معین رقم وضع کرتا ہے پھر ادارہ اپنی طرف سے دو فیصد یا کم وپیش اس میں اضافہ کرکے ملازم کو اس وقت دیتا ہے جب وہ ادارہ چھوڑ کر جانے لگتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ اقدام شرعاً درست ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درست ہے، لیکن رضامندی شرط ہے، چنانچہ حضرت مولانا یٰسین صاحب نے فتاویٰ احیاء العلوم میں لکھا ہے:

مدرسہ میں پراویڈنٹ فنڈ درست ہے، میرا جواب اس صورت میں ہے جبکہ ملازمین اپنی جزو تنخواہ کے کٹانے پر راضی ہوں۔(۲)

اور حضرت مولانا مہربان علی بڑوتی علیہ الرحمہ نے بھی جامع الفتاویٰ میں اس کی صراحت کی ہے۔(۳)

---

(۱) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ص: ۳۵۰ بحوالہ دینِ اسلام ڈاٹ کام

(۲) فتاویٰ احیاء العلوم: ۱/ ۲۷۲

(۳) جامع الفتاویٰ: ۲/ ۵۱۱

لہٰذا مدرسہ میں رضامندی کے ساتھ تنخواہ کا وضع کرنا کرانا پایا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس میں ملازم کی ایک بڑی ضرورت بیک وقت پوری ہوجاتی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ اور بینک کے سود میں فرق

پراویڈنٹ فنڈ میں نصف رقم عطیہ ہوتی ہے اور نصف ملازم کی تنخواہ میں سے وضع کی ہوئی ہوتی ہے چونکہ وہ ملازم کے قبضے میں آنے سے پہلے وضع کر لی جاتی ہے اس لیے اس کا سود اور نصف رقم عطیہ کا سود دونوں ملکر عطیہ کا حکم لے لیتی ہے اور نصف رقم وضع شدہ سے زائد جو رقم ملتی ہے وہ سب عطیہ ہی قرار پاتی ہے بینک کا سود اس سے مختلف ہے دونوں میں وجہ فرق یہ ہے کہ بینک میں اپنے قبضہ سے نکال کر رقم جمع کی جاتی ہے اس لیے اس کا سود حقیقۃً سود ہوتا ہے۔(۱)

پراویڈیٹ فنڈ پر زکوۃ کا حکم

پراویڈیٹ فنڈ کی رقم وصول ہونے سے قبل اس پر زکوۃ فرض نہیں وصول ہونے کے بعد بھی گزشتہ سالوں کی زکوۃ فرض نہیں۔ آئندہ کے لیے یہ تفصیل ہے:

اگر یہ شخص پہلے سے صاحب نصاب ہے تو اس نصاب پر سال پورا ہونے سے اس کے ساتھ رقم کی بھی زکوۃ ادا کرنا فرض ہوجائے گا۔ اور اگر اپہلے سے صاحب نصاب نہیں مگر پراویڈیٹ فنڈ کی رقم ملنے سے صاحب نصاب ہوگیا تو قمری مہینہ کی جس تاریخ میں یہ رقم ملی ہے اس کے بعد ایک سال گذرنے پر زکوۃ ادا کرنا فرض ہے، اگر پراویڈیٹ فنڈ کی رقم کسی بیمہ کمپنی کے حوالہ کردی گئی تو اس پر زکوۃ فرض ہوجائے گی۔(۲)

یہ تو پراویڈیٹ فنڈ کے اس صورت کا حکم ہے جس میں جبری طور پر لازماً تنخواہ کاٹ لی جاتی ہے، دوسری صورت جس میں تنخواہ کا حصہ ملازم کی مرضی وخوشی سے کاٹ لیا

---

(۱) کفایت المفتی: ۸/ ۹۵

(۲) احسن الفتاوی: ۷/ ۲۷

جاتا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ ہر سال بہ سال اس جمع شدہ رقم کی زکاۃ ادا کرنا اس شخص پر لازم ہے کیوں کہ یہ رقم اس کی ملکیت میں داخل ہونے کے بعد اس کی رضا و خوشی سے فنڈ میں جمع ہوئی ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اپنی رقم بینک میں جمع کرتا ہے، اس لیے جس طرح بینک میں جمع رقم پر زکوۃ ہر سال آتی ہے اسی طرح اس قسم کے پراویڈیٹ فنڈ پر بھی ہر سال زکوۃ آئے گی۔(۱)

ایام ماضیہ کی زکوۃ پر قدرے تفصیل:

امام اعظم ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ پراویڈیٹ فند (جو جزو تنخواہ ہے) دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف میں ایام ماضیہ کی زکوۃ واجب نہیں ہوتی لہذا پراویڈیٹ فنڈ پر بھی ایام ماضیہ کی زکوۃ واجب نہیں ہونی چاہیے۔ یہی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کی آخری تحقیق ہے، نیز حضرت مفتی شفیع صاحب کی بھی یہی تحقیق ہے، البتہ صاحبینؒ کے نزدیک چونکہ دیون میں قوی، متوسط، ضعیف کی کوئی تفصیل نہیں ہے، بلکہ ہر قسم کے دین پر زکوۃ ایام ماضیہ کی واجب ہے، چنانچہ کوئی شخص احتیاط اور تقویٰ پر عمل کرتے ہوئے ایام ماضیہ کی زکوۃ بھی ادا کر دے تو بہتر ہے۔(۲)

فقہ اکیڈمی کا فیصلہ:

پراویڈنٹ فنڈ (تنخواہ سے لازمی طور پر وضع ہونے والی رقم) جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے اس کی زکوۃ واجب نہ ہوگی جب یہ رقم حاصل ہو جائے اور بقدرِ نصاب ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کی زکوۃ ادا کرنا ہوگی۔

بعض اوقات کچھ لوگ قانون انکم ٹیکس کی زد سے بچنے یا دیگر مصالح کی خاطر

---

(۱) مستفاد از: نفائس الفقہ: ۱/ ۱۱۵، ۱۱۶

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: نفائس الفقہ: ۱/ ۱۱۵-۱۱۶

اختیاری طور پر اپنی تنخواہ سے کچھ زائد رقم وضع کرا کر پی ایف (PF) جمع کراتے ہیں۔ یہ رقم اگر قدر نصاف کو پہنچ جائے تو سال بہ سال زکوۃ ادا کرنی پڑے گی۔ اس اختیاری وضع کرائی ہوئی رقم کی حیثیت ودیعت کی ہے اور مالِ ودیعت پر زکوۃ واجب ہوتی ہے۔(۱)

پنشن کی حقیقت اور اس کا فروخت

پنشن کی رقم معاوضہ کا ایک حصہ ہے پنشن کی حیثیت ایک لحاظ سے عطیہ کی ہے، اس لیے جو معاملہ پنشنز اور حکومت کے درمیان طیے ہو جائے وہ صحیح ہے، یہ جوا اور قمار نہیں ہے۔(۲)

گورنمنٹ ملازمین کو مدتِ ملازمت ختم کرنے کے بعد پنشن بطور حق ملتی ہے مروجہ قانون کے مطابق پنشنرز کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی نصف پنشن کی حد تک گورنمنٹ کو بیچ دے، یعنی پنشن کی اس رقم کے بدلے (عوض) یکمشت رقم نقد لے لے۔ اس کو انگریزی میں کمیوٹیشن کہتے ہیں، اس کے لیے شرط ہے کہ پنشنرز بالکل تندرست ہو اور مقامی سول سرجن اس کو تندرست تسلیم کر کے سرٹیفکٹ دے،،، الغرض یہ پنشن کی حیثیت ایک لحاظ سے عطیہ کی ہے، اس لیے جو معاملہ پنشنز اور حکومت کے درمیان طے ہو جائے وہ صحیح ہے، یہ جوا اور قمار نہیں، (۳) وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص پنشن پر جا رہا ہے حکومت کے ذمہ اس کی جو رقم پنشن کی شکل میں ہے وہ واجب الاداء ہے، وہ اس کا اس وقت تک مالک نہیں ہوتا، جب تک کہ اس رقم کو وصول نہ کر لے، اب اس پنشن کو گورنمنٹ کے پاس فروخت کرنے کا مطلب یہ ٹھہرتا ہے کہ گورنمنٹ اس سے معاہدہ کرتی ہے کہ وہ اپنا یہ حق چھوڑ دے اور اس کے بجائے وہ اتنی رقم نقد لے لے، اور ملازم

---

(۱) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے ص: ۶۳

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۷۰

(۳) مستفاد آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۷۰

اپنے استحقاق کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے، پس یہاں درحقیقت کسی رقم کا رقم کے ساتھ تبادلہ نہیں بلکہ تاحینِ حیات جو اس کا استحقاق تھا اس کا معاوضہ وصول کرنا ہے، اس لیے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ولو باعه من المديون أو وهبه جاز(۱)

فتاویٰ حقانیہ میں پنشن کی خرید وفروخت سے لکھا ہے:

''یہ وظیفہ درحقیقت دورانِ ملازمت محنت وخدمت کے صلہ میں بطورِ اعزاز واکرام کے ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے والے کو حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے جس میں بعض حصہ عطاء سلطانی اور بعض اپنی محنت کا حصہ ہوتا ہے، اس کی فروخت کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں ایک تو گورنمنٹ کو فروخت کرنا ہے اور ایک اس کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، تو حکومت کے علاوہ کسی اور پر فروخت کرنا چند خرابیوں کی وجہ سے مشروع نہیں کیونکہ اس میں رقم کو فروخت کیا جاتا ہے جو کہ ابھی اس کے قبضے میں آئی ہی نہیں، اس لیے غیر مقدور التسلیم ہونے کی بناء پر جائز نہیں، اسی لیے فقہاء کی عبارات اور احادیث نبویہ میں اس قسم کی بیع سے منع کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ثمن کا آپس میں بیع کی وجہ سے دست بدست اور مثل بمثل ہونا ضروری ہے جو کہ یہاں مفقود ہے، لہٰذا ان نقصانات اور خرابیوں کی وجہ سے اس (پنشن) کی بیع جائز نہیں۔ جہاں تک گورنمنٹ پر فروخت کرنا ہے تو یہ درحقیقت بیع نہیں بلکہ عطاء مؤجل کو معجّل بنانا ہے اور وہ اس طرح کہ حکومت نے جو وظیفہ قسط وار حیثیت سے مقرر کیا تھا اب اس سے زیادہ وظیفہ کو نسبتاً کم کرکے یکمشت لیا جارہا ہے یعنی پہلی صورت میں تاجیل تھی اور اس میں یکبارگی حاصل کرنا ہے جسمیں شرعی طور پر کوئی

---

(۱) الأشباه والنظائر: ۱۴/۴ مستفاد حوالہ سابق: ۷۶/۷

حرج نہیں''۔(۱)

پنشن کی فروختگی کے سلسلہ میں مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں اس معاملہ میں (یعنی پنشن کی بیع میں) بظاہر ایک خرابی تو یہ ہے کہ جو چیز ابھی تک ملازم کے قبضہ میں نہیں آئی، وہ اس کی بیع کر رہا ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔ لکونہ غیر مقدور التسلیم۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ جس شئی پر ابھی تک ملازم کی ملک حاصل نہیں ہوئی تھی، اس کی بیع کر رہا ہے یہ بھی ناجائز ہے۔ نهی عن بيع ما لا يملك۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ عمر کا تخمینہ خود ایک فرضی چیز ہے جس میں زیادتی کمی کا امکان غالب ہے اس لیے ایک صورت میں ملازم کے پاس رقم زیادہ آنے کا امکان ہے اور دوسری صورت میں کم کا احتمال ہے یہ بھی ممنوع ہے۔ لکونہ قمارا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ اگر معاملہ ثمنین کا ہو تو اس میں یداً بید و مثلا بمثل ہونا ضروری ہے، وہ یہاں موجود نہیں لہذا ناجائز ہے، لکونہ ربوا۔

لیکن ملازمت سے سبکدوشی پر تا زیست ملازم کو رقم ماہانہ متعین کر کے بنام حق الخدمت دینا واجب نہیں؛ بلکہ تبرع ہے، جس پر جبر نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کا دل چاہے دے نہ چاہے نہ دے، جس طرح ماہانہ رقم دینا تبرع ہے جبر نہیں، اسی طرح یہ بھی اختیار ہے کہ اندازہ کر کے مجموعی رقم یکمشت دیدے، یہ درحقیقت احسان ہی کی ایک صورت ہے، اس میں اس لیے اصالۃً نہ بیع ما لا یملک ہے، نہ بیع ما لیس عندہ ہے، نہ قمار ہے، نہ ربوا، لہذا یہ لین دین شرعاً درست ہے:

> ونظيره بيع العرايا، قال في العناية في شرح الهداية ص: ۶۹۵، هامش فتح القدير: و تأويلها أن يهب الرجل ثمرة نخلة من بستانه لرجل ثم يشق على المعرىٰ له، الخ (۲)

---

(۱) فتاویٰ حقانیہ، مکتبہ سید احمد شہید اکوڑہ خٹک: ۶/ ۳۹

(۲) فتاویٰ محمودیہ: ۱۶/ ۱۱۴، ۱۱۵

جی پی فنڈ لینا جائز ہے

جی پی فنڈ جو گورنمنٹ ریٹائرڈ ہونے والے ملازمین کو دیتی ہے، اس کا لینا جائز ہے اور اس پر جو اضافہ سود کے نام سے دیتی ہے، اس کا لینا بھی جائز ہے، اس لیے کہ مذکورہ رقم درحقیقت تنخواہ ہی کا حصہ ہے۔(۱)

جی پی فنڈ کی رقم حصول سے قبل کسی کمپنی یا بینک کو سود پر دینے کا حکم

کوئی بھی سرکاری ملازم اگر درخواست دے کر اپنے جی پی فنڈ کی رقم کسی بینک یا بیمہ کمپنی کے حوالہ کردے تو وہ کمپنی اس کی وکیل بن جائے گی وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے لہٰذا کمپنی وکیل کے اعتبار سے جتنا سودی کاروبار کرے گی وہ ایسا ہوگا جیسے یہ خود اس میں ملوث ہے، کیوں کہ ملازم نے باختیار خود یہ رقم کمپنی کے حوالہ کی ہے، یہ سودی رقم دوبارہ حکومت کے خزانہ میں جاکر جمع ہوجاتی ہے، اختتام ملازمت پر جب یہ رقم ملازم کو ملے گی تو سودی رقم ہوگی اس کو وہ شرعاً اپنے مصرف میں نہیں لاسکتے۔(۲)

شیئر مارکیٹ

شیئر دراصل کمپنی کی جانب سے کاغذی دستاویز ا ہوا کرتا ہے، جس پر خریدنے والے کا نام، قیمت اور شیئر کی تعداد تحریر رہتی ہے، اس کے علاوہ بھی کچھ بنیادی چیزیں ریکارڈ کے طور پر تحریر ہوتی ہیں، آج کل کمپنیاں کسی ایک فرد کے پیسے سے نہیں چلتے؛ بلکہ ان کمپنیوں میں مالیاتی طور پر بہت سے لوگ شریک ہوتے ہیں، نیز کمپنی کے نفع ونقصان میں حصہ دار بھی ہوتے ہیں، اس طرح کے شریک کار کو شیئر خریدار (Shareholder) کہتے ہیں، سال میں کمپنی اپنے نفع ونقصان کو تقسیم کرتی ہے جب کمپنی فائدے میں ہو تو اس کے شیئر کی قیمت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اگر کمپنی گھاٹے میں ہو تو اس کے شیئر کی قیمت گر جاتی ہے اور اس کے شیئر ہولڈروں کو بسا اوقات ناقابل

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۶۹

(۲) فتاویٰ حقانیہ: ۶/ ۲۱۲

تلافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

شیئر کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

۱) پہلی قسم ترجیحی شیئر (Prefrence Share) یہ ایک طرح سے فکسڈ ڈپازٹ (Fixed Deposite) سے کافی مماثلت رکھتا ہے، اس طرح کے شیئر میں Shareholder کو عام طور پر ایک متعینہ مقدار میں نفع ملتا رہتا ہے، اگر کمپنی فائدے میں ہے، یہ نفع (Intrest) سود کے مترادف ہے، چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس طرح کا شیئر ایک مسلمان کے لیے ہرگز جائز نہ ہوگا، خواہ کمپنی حلال اشیاء کی پیداوار میں ہی کیوں مصروف نہ ہو، اسی وجہ سے بہت سے علماء شیئر بازار کی تجارت کو حرام قرار دیتے ہیں۔

۲) اس کے برخلاف دوسری قسم شراکتی شیئر (Equitg Share) ہے جس میں نفع کی مقدار متعین نہیں ہوتی ہے، اگر کمپنی کو فائدہ ہوتا ہے تو اس کے شیئر خریداروں کو بھی فائدہ ملتا ہے اور اگر سوءِ اتفاق کمپنی کو نقصان ہو رہا ہے تو شیئر خریداروں کو نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کا پیسہ ڈوب سکتا ہے، تو یہ طریقہ شرکت اور مضاربت سے زیادہ ہم آہنگ ہے (جو کہ شرعاً جائز ہے)۔(۱)

شیئر مارکیٹ کا حکم

شیئر مارکیٹ میں سرمایہ لگانے کے متعلق علماء مختلف الخیال ہیں، کچھ اسے اس لیے جائز قرار دیتے ہیں کہ اس میں کوئی متعین سود نہیں ملتا، اور نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہے؛ اس لیے جائز ہے، بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ دورِ حاضر میں شیئر مارکیٹ سٹے کا ایک عظیم کاروبار بن چکا ہے۔

۱۔ اس میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ درمیان کے دلال، لوگوں کا سرمایہ لے کر رفو چکر ہوجاتے ہیں اور بے چارے عوام کی خون پسینے کی گاڑھی کمائی منٹوں میں برباد

---

(۱) مستفاد: شیئر بازار تعارف اور مواقع، عرفان شاہد، اسلامی پبلیشر زنئی دہلی

ہوجاتی ہے اور شیئر مارکیٹ میں اس طرح کی ڈوبی ہوئی رقم کی بازیابی کا کوئی سسٹم موجود نہیں ہے۔

۲- دوسرا یہ کہ اکثر کمپنیاں کیا کاروبار کرتی ہیں اس کی بھی شیئر ہولڈرس کو کوئی خبر نہیں ہوتی، کئی کمپنیاں حرام اشیاء کی تجارت کا بھی کاروبار کرتی ہیں اور اس سے حاصل ہونے والے فائدے کو اپنے حصہ داروں میں تقسیم کرتی ہیں۔

۳- تیسرا سبب یہ کہ کئی کمپنیاں اپنے شیئر ہولڈرس کو کمپنی کے نفع ونقصان کے متعلق دھوکے میں رکھتی ہیں، مثلاً: اگر گھاٹے میں چل رہی ہو تو وہ اس طرح کی معلومات فراہم کرتی ہیں کہ کمپنی چل نہیں؛ بلکہ دوڑ رہی ہے جس وقت کمپنی کا جنازہ اٹھا رہا ہوتا ہے اس وقت اس کے حصے داروں کو پتا چلتا ہے کہ ہماری زندگی بھر کی کمائی شیئر قزاقوں کی نذر ہوگئی، ان میں سے بعض صدمے سے ہسپتال پہنچ جاتے ہیں اور بعض قبرستان۔

ان تمام اندیشوں کے باوجود علمائے کرام نے مندرجہ ذیل شروط کے ساتھ کمپنیوں کے شیئرز خریدنے کی اجازت دی ہے کہ

۱) کمپنی کسی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو۔

۲) اس کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک نقد رقم کی شکل میں نہ ہوں؛ بلکہ اس کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے بھی ہوں، ورنہ کمی بیشی کے ساتھ بیع جائز نہیں ہوگی۔

۳) حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں یا سودی بینکوں کے شیئرز کی خرداری سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، اگر ممبر بننے کے بعد اس کا علم ہو تو حتی الامکان اس سے نکلنے کی کوشش کی جائے یا سال کے اخیر میں اس کے خلاف آواز اٹھائے۔

۴) نفع کا جتنا حصہ سودی کاروبار سے حاصل ہوا ہو اس کو بلا نیتِ ثواب فقراء وغیرہ پر صرف کردیا جائے۔

۵) شیئرز کی خرید وفروخت سے مقصود حصہ داری حاصل کرنا ہو نفع نقصان برابر

کر کے نفع کمانا مقصود نہ ہو، جس میں نہ تو شیئرز پر قبضہ ہوتا ہے نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ سٹّہ بازی کی شکل ہے جو کہ حرام ہے، اگر ان چیزوں کا خیال رکھا جائے تو پھر ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنے میں حرج نہیں ہے۔(۱)

فتاوی دار العلوم زکریا میں ہے:

- بعض حضرات کا شیئرز کی خرید و فروخت میں درحقیقت خریدنا بیچنا مقصود ہی نہیں ہوتا، (مبیع وثمن کا کوئی وجود ہی نہیں ہے) ان کے پیش نظر سرٹیفکٹ وصول کرنا ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی یہ حضرات سرٹیفکٹ وصول کرتے ہیں، بلکہ محض زبانی کلامی اس پوری کاروائی سے مقصد انتہا اور نتیجہ کے اعتبار سے فرق برابر کرنا ہوتا ہے، تو یہ صورت بھی جوا اور سٹہ بازی ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔
- شارٹ میل، یعنی بیع غیر مملوک جائز نہیں ہے، اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز نہیں ہیں اور وہ شارٹ سیل یا بلینک سیل کر رہا ہے تو یہ ''بیع مالا یملک'' ہونے کی وجہ سے ناجائز اور باطل ہوگی۔
- اگر بیچنے والے کی ملکیت میں شیئرز ہیں اور وہ ان کی ڈیلیوری (ادائیگی) بھی لے چکا ہے اور آئندہ کی تاریخ کے لیے آج ہی ایجاب وقبول کے ذریعہ بیع کی تکمیل کر رہا ہے، جسے فارورڈ سیل (Forward Sale) ''البيع المضاف إلى المستقبل'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ آئندہ کی تاریخ کے لیے ہے اس وجہ سے یہ ناجائز ہے۔
- فیوچر سیل (Fature Sale) بھی ناجائز ہے، یہ سٹہ ہے، یعنی شیئرز کی ایسی بیع وشراء کہ شیئرز لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نفع ونقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود ہو تو یہ بھی ناجائز ہے۔(۲)

---

(۱) مروجہ سودی معاملات نقل وعقل کی روشنی میں، ص:۱۳۰

(۲) فتاوی دار العلوم زکریا:۵/۲۲۶، مزید تفصیلات کے لیے دیکھئے: فقہی مقالات:۱/۱۴۱

خلاصہ یہ کہ شیئرز کی بعض صورتیں درست اور بعض خالص حرام اور جو درست ہیں ان کی معاملت بھی اکثر اسلامی اصول شراکت کے مغائر ہوتی ہے۔اس کی تفصیلات بہت تفصیل ہے اس لیے اگر کسی کو ایسی کسی کمپنی میں حصہ دار بننا ہے تو اس کی تفصیلات حاصل کر کے کسی مستند عالم دین سے رجوع ہو کر شرعی نوعیت معلوم کر لے، پھر قدم اٹھائے، تا کہ غلط فہمی یا نادانی سے کسبِ حرام کا مرتکب نہ ہو جائے۔

شیئر پر زکوۃ

ابتداء میں شیئر کی مالیت کا مسئلہ تھوڑا سا مبہم تھا اور لوگ تذبذب کا شکار تھے کہ زکوۃ کا اطلاق شیئر کی قیمت خرید پر ہوگا یا شیئر کی موجودہ مالیت پر؟ لیکن اب یہ مسئلہ بھی ماہرین اور علماء فن کی جدو جہد سے حل ہو گیا ہے کہ زکوۃ نکالتے وقت شیئر کی موجودہ قیمت کا خیال کرنا چاہئے۔

کچھ فقہاء کہتے ہیں کہ خدمات انجام دینے والی چیزوں پر زکوۃ نہیں ہے، یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑا، اسلحہ اور گھر وغیرہ پر زکوۃ وصول نہیں کیا کرتے تھے؛ لیکن اس کی نوعیت آج کل کی کمپنیوں سے بالکل مختلف ہے، موجودہ دور میں جو کمپنیاں خدمات پیش کر رہی ہیں مثلاً: جہاز، ٹراول انجنسی، مشورہ دینے والی کمپنیاں وغیرہ، ان کے شیئرز پر بھی زکوۃ نفاذ ہوگا؛ کیوں کہ یہ کمپنیاں سلعہ (سامان تجارت) کے ساتھ بہت بڑا اثاثہ بھی ہیں، اس طرح کے اثاثے کوئی عام یا غریب آدمی خرید بھی نہیں سکتا ہے، اگر اس طرح کی کمپنیوں میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور وہ ٹوٹ جائیں تو ان کے مالکان پر کوئی خاص فرق نہیں پڑنے والا ہے اور نہ ان کے ٹوٹنے سے وہ فقر و فاقہ کا شکار ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ اس طرح کی کمپنیاں سلعہ (سامانِ تجارت) کے دائرے میں آتی ہیں، یہ کمپنیاں سامانِ تجارت سے زیادہ اثاثے کی حیثیت رکھتی ہیں؛ لہٰذا اس طرح کی کمپنیوں کے شیئر پر بھی زکوۃ ادا ہونی چاہیے۔(۱)

---

(۱) مستفاد: شیئر بازار تعارف اور مواقع، ص: ۵۱

میوچول فنڈس (Mutual Funds)

میوچول فنڈس (Mutual Funds) کو ہم آسان زبان میں باہمی فنڈ یا باہمی سرمایہ کاری کے ادارہ کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، اس وقت ہندوستان میں بہت سارے میوچول فنڈس کام کر رہے ہیں، ان میں سے کچھ مسلمانوں کی شرعی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے بنائے گیے ہیں، تاکہ مسلمان سرمایہ کار بھی اس بازار میں سرمایہ کاری کر کے نفع کر سکیں۔

سب سے پہلے منظم طور پر میوچول فنڈس میں سرمایہ کاری کا آغاز امریکہ میں، اس کے بعد برطانیہ میں ہوا، پھر رفتہ رفتہ سرمایہ کاری کا یہ طریقہ پوری دنیا میں پھیل گیا، ہندوستان میں اس کا آغاز ۱۹۶۴ء میں ہوا، حکومت نے چھوٹے چھوٹے سرمایہ کاروں کو شیئرز بازار میں سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کرنے کی غرض سے ایک میوچول فنڈس قائم کیا جسے آج ہم یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا (Unit Trust of India) یا UTI کے نام سے جانتے ہیں۔

میوچول فنڈس عموماً چھوٹے چھوٹے سرمایہ کاروں کے سرمایہ کو جمع کر کے ان کی رقم سے مختلف کمپنیوں کے شیئرز کو خریدتے ہیں، یہ سرمایہ حاصل کرنے کے لیے اپنے سرمایہ کاروں کو ایک حصہ (Unit) دیتے ہیں، ان کی کیفیت بالکل شیئرز سرٹیفکیٹ کی طرح ہوتی ہے، مثال کے طور پر اگر ایک لاکھ روپے جمع کرنا ہے تو اس رقم کو ایک ہزار یونٹ میں تقسیم کر دیا جائے گا، اس طرح ایک یونٹ کی قیمت سو روپے ہوگی اور جو بھی یہ یونٹ خریدے گا اس رقم کے بقدر اس کا حصے دار ہو جائے گا، ایک مرتبہ یونٹ خریدنے کے بعد یونٹ کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے، اس کا پتا لگانے کے لیے یونٹ خریدار کو NAV یعنی Net Asseds Value کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے، میوچول فنڈس کے تمام یونٹ کی Nav ہر روز کمرشیل اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

جیسے جیسے کسی یونٹ کا (NAVNet Asseds Value) بڑھے گا ویسے

ہی اس کی مالیت اور قیمت میں اضافہ ہوگا، Nav کا پتا لگانے کے لیے تمام واجب مطالبات واخراجات سے زائد سرمایہ کو تمام جاری شدہ یونٹ سے تقسیم کر دیتے ہیں، اس کے بعد جو بھی نتیجہ آتا ہے اسے NAV کہتے ہیں۔

عامۃ الناس کا میوچول فنڈس میں سرمایہ کاری کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ لوگ نقصان سے بچنا چاہتے ہیں اور میوچول فنڈس سرمایہ کاری خود شیئرز بازاری میں سرمایہ کاری کے مقابلہ میں نقصانات کم ہوتے ہیں، دوسری وجہ یہ کہ اس میں اسکیمیں زیادہ ہوتی ہے، وقت کم ضائع ہوتا ہے، تحقیق کی ضرورت کے لیے تعب کم اٹھانا پڑتا ہے، کم سرمایہ کے ساتھ بھی اس میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔

میوچول فنڈس اور مسلمان

مسلمان بھی میوچول فنڈس میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں بشرطیکہ میوچول فنڈس کا اپنا ذاتی سرمایہ کاری کا طریقہ اسلام کے طریقۂ تجارت سے مغائر نہ ہو، بیرون دنیا اور عرب ممالک میں بہت سارے میوچول فنڈس قائم کیے گیے ہیں جو اسلامی طریقۂ تجارت سے مطابقت رکھتے ہیں، جیسے ایمان میوچول فنڈس ، امانۃ میوچول فنڈس ٹرسٹ، ڈاو جون اسلامی فنڈس وغیرہ۔

اگر کچھ اور میوچول فنڈ بھی کسی ملک میں ہوں تو ان میں شرکت سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا شریعہ ایڈوائزر کون ہے اور اس نے اس فنڈس کو کیسے ترتیب دیا ہے اور اس میں کتنا شریعت کے بنیادی قوانین کا لحاظ کیا گیا ہے؟ واضح رہے کہ شریعہ ایڈوائزر دونوں علوم سے واقفیت رکھتا ہو، یعنی وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ علم معاشیات اور فائنانس کے علوم سے بھی واقف ہو، دونوں میں سے کسی بھی علم کی عدم موجودگی میں وہ صحیح طریقے سے شرعی قوانین کو جدید تجارتی اصولوں پر منطبق نہیں کر سکے گا، تجارتی امور میں شرعی رہنمائی کے لیے ہمیں انہی لوگوں سے رجوع کرنا چاہیے جو دینی علوم کے ساتھ معاشیات، فائنانس، انگریزی اور عربی زبان کا علم رکھتے ہوں اور اسلام کے ساتھ جدید

تجارتی نظام سے بھی واقفیت رکھتے ہوں، الحمدللہ آج ہمارے درمیان اس طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں جو ہماری رہنمائی اس میدان میں بہتر طریقے سے کرسکتے ہیں۔(۱)

کیش بیک (Cashback)

انٹرنیٹ کے زمانے میں اکثر تجارت اسی سے جڑ گئی ہیں، لین دین کا انحصار تو اب سو فیصد اس پر ہو گیا ہے اور خرید وفروخت کے میدان میں انٹرنیٹ نے کافی سہولیات فراہم کردی ہے، گھر بیٹھے مرضی کا سامان دستیاب ہوجاتا ہے اور آمدورفت کی مشکلات واخراجات سے بچنے لگے۔

انٹرنیٹ سے جڑے موبائل کا ایک اپلیکیشن پیٹیم (Paytm) اس وقت بڑی مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔

پیٹیم (Paytm) نہ کوئی بینک ہے، نہ تجارتی کمپنی ہے اور نہ ہی مالیاتی ادارہ ہے، یہ محض ایک اپلیکیشن ہے، اس کے بنانے والے اس ایپ کو مختلف بینکوں، تجارتی اداروں، آن لائن خرید وفروخت اور لینڈ لائن، موبائل ریچارج، بجلی، ٹکٹ (ٹرین، بس، جہاز) ٹی وی، سنیما، فیشن، ہوٹل، گیس، دوا، علاج، انٹرٹمنٹ گرچیریٹی آفس وغیرہ سے مربوط کرکے ان کاموں کو اس ایک ایپ سے کرنا آسان کردیا ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ پیٹیم اپنے ایپ سے ٹرانجیکشن (Transection) کرنے پر کیش بیک یعنی کچھ پیسہ واپس دیتا ہے، اس پیسے کا حاصل کرنا یا لے کر استعمال کرنا شرعاً کیسا ہے؟

ہوتا اس طرح ہے کہ کسی نے اس ایپ کے ذریعہ کوئی موبائل پچاس روپے کا ریچارج کیا، یہ ریچارج موبائل کمپنی سے ہوا، موبائل کمپنی سے لین دین پچاس روپے کا ہوا، یہاں پر پیٹیم کی جانب سے تیس (۳۰) روپے کا کیش بیک ملتا ہے، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب پیٹیم موبائل کمپنی نہیں ہے تو کیش بیک کیوں اور کہاں سے دیتا ہے؟

---

(۱) مستفاد: شیئر زبازار تعارف اور مواقع

تو اس سلسلے میں بعض لوگوں (مفتی عامر کانپوری) کا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ یہ صورت (کیش بیک) ناجائز ہونا چاہئے؛ کیوں کہ جب ہم سوال کی حقیقت تک پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح گوگل کمپنی بلاگ، ویب سائٹ اور یوٹیوب یہ کمپنیوں کی تشہیر کر کے اس کا کچھ منافع ان سماجی روابط کے استعمال کنندہ کو بھی دیتا ہے، اسی طرح کا معاملہ پیٹیم ایپ میں بھی ہے۔

اگر اس ایپ کے محض استعمال سے یعنی اس کے ذریعہ موبائل ریچارج یا کسی قسم کے بل کی ادائیگی پہ کیش بیک ملتا ہے، تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں تھا؛ لیکن اس ایپ میں کئی رکاوٹیں ہیں:

۱- یہ ایپ بیمہ، فلم، انٹرٹینمنٹ اور فیشن وغیرہ کی بھی تشہیر کرتا ہے اور بہت ساری آن لائن تجارتی اشیاء کی برہنہ تصاویر کے ساتھ اشتہار موجود ہے۔

۲- ٹرانجیکشن پہ کیش بیک اشتہار پہ تعاون کے عوض ہے اور اشتہار بازی میں کئی ساری شرعی خامیاں ہیں۔

۳- اس ایپ میں کئی قسم کی آن لائن تجارت بھی ہے، جس کے متعلق دجل وفریب کا بھی امکان ہے۔

۴- آن لائن خرید وفروخت میں سامان پہ قبضے کیے بغیر اس سے دوسرے کے ہاتھ بیچنا عام ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔

۵- اس ایپ کو شیئر کرنے والے سے پچاس روپے ملنے کا وعدہ ہے جس نے یہ ایپ شیئر کیا ہے، اس کی وجہ سے کوئی اس ایپ سے فلم کا ٹکٹ خریدتا ہے یا بیمہ کرواتا ہے یا اس کا پریمیم جمع کرواتا ہے، تو اس گناہ کا ذمہ دار شیئر کرنے والا بھی ہوگا۔

۶- لالچ کا مزاج بن جاتا ہے، دنیا کی ہوس کا شکار ہو جاتا ہے۔

الغرض اس ایپ میں دھوکہ کا امکان ہے، غیر شرعی تجارت ہے اور حرام کام پہ تعاون ہے؛ لہٰذا یہ کیش بیک حرام ہونا چاہئے۔

❁ دار العلوم دیو بند کا فتوی:

ویلٹ میں پیسہ لوڈ کرنے پر یا بعض اوقات آن لائن اشیاء کی خریداری پر جو کیش بیک ملتا ہے، یہ ترغیبی انعام ہے اور جائز ہے۔(۱)

❁ دار العلوم بنوریہ ٹاؤن کا فتوی:

اگر یہ رعایت (کیش بیک) بینک کی طرف سے ملتی ہے تو اس صورت میں وہ رعایت حاصل کرنا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ یہ رعایت بینک کی کارڈ ہولڈر کو اس قرض کی وجہ سے مل رہی ہے جو اس نے اکاؤنٹ کی صورت میں بینک میں رکھوایا ہے اور اگر یہ رعایت Paytm کمپنی والوں کی طرف سے ملتی ہے تو یہ ان کی طرف سے انعام، تبرع واحسان ہوگا، اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا۔(۲)

ڈرا بیک (Draw back)

جب امپوٹر دیگر ممالک سے خام مال منگواتا ہے تو اس کو پہلے حکومت کو ایک بھاری رقم کسٹم ڈیوٹی کے نام سے دینی پڑتی ہے، اس کے بغیر وہ مال نہیں منگوا سکتا، پھر جب اس خام مال کو صاف ستھرا کر کے اور دیگر مراحل سے گزار کر جو بھی چیز بنائی ہو، اس کو ایکسپورٹ کرتا ہے، تو حکومت اپنی طرف سے اس کو ایک متعینہ رقم 7 / 8٪ ایکسپورٹر بطور انعام نقصان کی تلافی کے نام سے دیتا ہے، اس کو ڈرا بیک کہتے ہیں، اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں؛ کیوں کہ یہ حکومت کی طرف سے ایک انعام ہے، چاہے حکومت اس کو نقصان کی تلافی سمجھتی ہو یا کسٹم ڈیوٹی کا عوض ہر حال میں یہ انعام ہے۔(۳)

چٹھی کا کاروبار

چٹھی کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ چند افراد مل کر ماہانہ متعینہ رقم ادا کریں

---

(۱) Fatwa:133-140/N=3/1440

(۲) فتوی نمبر:143909201014

(۳) بینک کے مسائل، ص:۹۶

اورقرعہ اندازی کے ذریعہ چٹھی کے شرکاء میں سے جس کا نام نکل آئے اس کو دے دی جائے، اس طرح باری باری تمام لوگوں کو پوری رقم یکمشت حاصل ہوجائے، جیسے دس آدمی ہوں، دس ہزار روپے چٹھی میں دی، اور ہر ماہ شرکاء میں سے ایک کو یکمشت ایک لاکھ روپے مل جائیں، یہ صورت جائز ہے اس کی حیثیت ایک دوسرے کو قرض دینے کی ہے، یعنی جس کی چٹھی پہلی بار اٹھ گئی، گویا اس کو نو ساتھیوں نے اس کو نوے ہزار قرض دیا ہے، یہ صورت نہ صرف جائز ہے، بلکہ بہتر ہے اور اس کے ذریعہ معاشی خود کفالت میں مدد مل سکتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ شرکاء میں سے کوئی شخص اپنی باری آنے سے پہلے نقصان اٹھا کر چٹھی لے لے مثلا ایک لاکھ کی چٹھی اسی ہزار میں لے لے جو بیس ہزار روپے بچ جائیں وہ شرکاء میں تقسیم ہو یہ صورت صریحا سود کی ہے اور قطعا جائز نہیں، اسے ہراج کی چٹھی بھی کہتے ہیں۔(۱)

کمیشن کی چٹھی

اگر چٹھی میں شریک تمام ممبران سے پہلے یہ بات طے ہوجائے کہ یہ چٹھی چلانے والا شخص متعلق شخص سے رقم وصول کرنے اور جس کا نام قرعہ میں نکلا ہو اس کو پہنچانے کا ذمہ دار ہو اور اس کے بدلے اسے ماہانہ پانچ سو روپے بطور اجرت دیے جائیں گے تو یہ صورت جائز ہے، کیوں کہ یہ اس کی مزدوری اور محنتانہ ہے اور ایسے شخص کی امامت بھی درست ہے، البتہ بہتر ہے کہ وہ شخص خود اس چٹھی میں شریک نہ ہو، کیوں کہ ایسی صورت میں ایک درجہ کے سود کا شائبہ پیدا ہوجاتا ہے۔(۲)

سرکاری اسکیموں سے استفادہ اور تجاویز

(۱) سرکاری قرضے جن کا کچھ حصہ معاف کردیا جاتا ہے اور لی ہوئی رقم سے کم واپس

---

(۱) کتاب الفتاویٰ:۵/ ۳۴۴

(۲) کتاب الفتاویٰ:۵/ ۳۴۸، بکمل بحوالہ احکام مال حرام

کرنا پڑتا ہے، ایسے قرضوں کا لینا جائز ہے۔

البتہ مفتی محمد عثمانی بستوی کا خیال ہے کہ اس طرح کی چھوٹ والی اسکیموں سے استفادہ میں اس بات کو بھی مصلحتاً مدنظر رکھنا چاہیے کہ بسا اوقات سیاسی جماعتیں اپنے سیاسی مقاصد کی غرض سے اس طرح کی اسکیمیں جاری کرتی ہیں اور عوام کو بعد میں دینی ودنیوی ضرر لاحق ہوتا ہے۔

(۲) وہ قرضے جن میں ایک مقررہ مدت کے اندر واپس کرنے پر معافی ہوتی ہے ورنہ پوری رقم ادا کرنی پڑتی ہے، ایسے قرضوں کا لینا بھی درست ہے؛ (کیوں کہ لی ہوئی رقم سے زائد نہیں دینا پڑتا، اس لیے یہ معاملہ بھی سودی معاملہ کے دائرے میں نہیں آئے گا)۔

(۳) وہ قرضے جن میں مقررہ مدت کے بعد قرض واپس کرنے پر کل رقم واپسی کے ساتھ زائد رقم بھی ادا کرنی پڑے، ایسے قرضے بلا ضرورت شدیدہ جائز نہیں ہے (کیوں کہ یہ سراسر سودی معاملہ ہے)۔

(۴) وہ قرضے جن کی واپسی پر اصل سے زائد رقم ادا کرنی پڑتی ہو وہ ناجائز ہے؛ البتہ اگر وہ دیندار ماہرین اور معتبر اصحاب افتاء کی رائے کے مطابق اس جیسے عمل کے لیے واقعی سروس چارج کہلانے کے لائق ہو اور کسی طرح بھی سود لینے کا حیلہ نہ ہو تو لینے کی گنجائش ہے۔

(۵) قرض پر لی جانے والی زائد رقم کا اوسط معمولی نہ ہو کہ جس کو انتظامی خرچ پر محمول کیا جاسکے وہ رقم سود ہے اور عام حالات میں ایسا قرض لینا جائز نہیں ہے۔

(۶) مکان یا بیت الخلاء کی تعمیر یا تعلیمی ضروریات وغیرہ کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے امداد کے طور پر جو رقم ملتی ہے اس کو حاصل کرنا اور اس کا استعمال کرنا درست ہے۔

(۷) رشوت لینا اور دینا جائز نہیں ہے؛ البتہ گورنمٹن کی طرف سے ملنے والی رقم حاصل کرنے کا طریقہ کار سے کوئی شخص واقف نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کو انجام دینے

پر قادر نہ ہو اور وہ کسی ایسے شخص کی مدد حاصل کرے جو اس کے حصول کے لیے تگ ودو اور جد وجہد کرتا ہو اور یہ کوشش اس کی ذمہ داری میں داخل نہ ہو تو بطور محنتانہ مناسب مقرر اجرت کا لین دین درست ہے۔

(۸) امدادی رقوم یا قرض حاصل کرنے کے لیے جو شرائط ومعیارات حکومت کی طرف سے متعین ہوں اس سلسلہ میں غلط بیانی سے کام لینا اور غلط طریقہ پر امداد یا قرض حاصل کرنا درست نہیں ہے۔

(۹) تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے حکومت عوام کو بینک سے قرض دلاتے اور اس پر عائد ہونے والی زائد رقم خود مقروض کو ادا نہ کرنا پڑے؛ بلکہ خود حکومت ادا کرے تو اس طرح کا قرض لینا درست ہے۔

(۱۰) جن اسکیموں میں حکومت نے محفوظ فنڈ قائم کر کے اس کو بینک میں ڈپازٹ کر دیا اور اس کے انٹرسٹ سے حاصل شدہ رقم کا مالک ہو کر تعلیمی ورفاہی اداروں اور افراد واشخاص کا تعاون کرتی ہے، ایسی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

(۱۱) دوسری قومی اکائیوں کی طرح مسلمانوں کا بھی سرکاری خزانہ میں حق ہے، اس لیے سرکاری اسکیموں سے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہیے، بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو، جو شرعاً ممنوع ہے۔

(۱۲) شرکاءِ سمینار مسلم ودانش وروں، تنظیموں اور اداروں کے نمائندوں اور ذمہ داروں کو توجہ دلاتے ہیں کہ سرکاری جائز اسکیموں کا لوگوں میں زیادہ سے زیادہ تعارف کرائیں اور بلا معاوضہ ممکنہ تعاون کی صورت پیدا کریں۔(۱)

بچیوں کی پیدائش پر تعاون کی اسکیم

(الف) حکومت نے لڑکی کی پیدائش کے متعلق ایک اسکیم بنائی ہے جس کے تحت بچی کی پیدائش پر متعلقہ محکمہ سے فارم کی خانہ پوری کے بعد حکومت اس لڑکی کے نام پر

(۱) سرکاری اسکیموں سے استفادہ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا، مجمع الفقہ الاسلامی

بینک میں دس ہزار روپے جمع کرتی ہے اور پندرہ سال پورے ہونے پر لڑکی کے کھاتے میں حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپے جمع دئے جاتے ہیں، درمیان میں لڑکی یا اس کے والدین کی طرف سے کچھ جمع کرنا نہیں پڑتا، تو اس حوالہ سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں:

''اس صورت میں حکومت ہی ابتداءً دس ہزار روپے لڑکی کے نام پر جمع کرتی ہے اور پندرہ سال پورے ہونے پر حکومت ہی مزید ایک لاکھ روپیہ جمع کرتی ہے، لڑکی کی طرف سے کوئی رقم جمع نہیں کی تو اس میں سود کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، کیوں کہ ربا تو عقد معاوضہ میں پیدا ہوتا ہے، جب کہ عوضین ایک ہی جنس کے ہوں اور ایک طرف سے ایسا اضافہ پایا جائے جس کے مقابلہ میں دوسرے کی طرف سے کچھ نہ ہو، علامہ موصلی علیہ الرحمہ کے الفاظ ہیں:

"وفی الشرع: الزیادة المشروطة فی العقد وہذا إنما یکون عند المقابلة بالجنس"(الاختیار شرح المختار: ۳/۲، باب الربا)

نیز علامہ نسفی علیہ الرحمہ کا بیان ہے:

"ہو فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال" (کنز الدقائق مع التبیین: ۴۵۸، باب الربا)

اس لیے یہ پوری کی پوری رقم حکومت کی طرف سے تبرع سمجھی جائے گی اور اس سے نفع اٹھانا حلال ہوگا''۔

(ب) بچیوں کی پیدائش کے سلسلہ میں بعض صوبوں میں اس طرح کی اسکیم بھی جاری کی گئی ہے کہ بچی کی پیدائش پر اس کے نام سے بینک میں کھاتہ کھول کر ہر ماہ کچھ رقم جمع کرائی جاتی ہے (مثلاً: پانچ سو یا ہزار روپے) پھر جب لڑکی اٹھارہ سال کی ہوجاتی ہے تو جمع شدہ رقم کی تین گنی مقدار حکومت کی طرف سے اس کے

کھاتے میں جمع کردی جاتی ہے، (مثلاً: اگر دو لاکھ روپے جمع ہوئے تو چھ لاکھ روپے حکومت جمع کرائے گی) اس حوالہ سے بھی حضرت رقمطراز ہیں کہ:

''اس صورت میں حکومت ۱۸؍سال کے بعد تین گنا رقم دینے کا وعدہ کرتی ہے اور حسب وعدہ اسے پورا کرتی ہے، یہ حکومت کی طرف سے تبرع ہے، بظاہر اس کا سبب یہ کہ ہندوستان میں شادی کے اخراجات کے خوف سے لڑکیوں کے اسقاط کا تناسب بہت بڑھ رہا ہے، یہاں تک کہ ہندوستان میں ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ نو سو یا اس سے کچھ ہی زیادہ لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں، اور پنجاب وہریانہ کی ریاستوں میں تو ایک ہزار لڑکوں کے مقابلہ آٹھ سو سے بھی کم لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں، اس طرح کی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت نے ''بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ'' کی ایک تحریک شروع کی ہے؛ اس لیے یہ ایک امدادی اسکیم؛ تاکہ لڑکیوں کی تعلیم اور شادی میں سہولت ہو، یہ لڑکی کے نام پر جمع کی جانے والی رقم کا عوض نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو ''تبرع مشروط'' کہا جاسکتا ہے، گارجین سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ جتنی بچت کریں گے اس کا تین گنا اس لڑکی کے لیے حکومت ادا کرے گی، اور تبرع چوں کہ عقد معاوضہ نہیں ہوتا؛ اس لیے اس میں شرط لگانا باعث فساد نہیں، یہ اور بات ہے کہ بعض صورتوں میں ہبہ بھی درست ہوتا ہے اور شرط بھی معتبر ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں ہبہ درست ہوتا ہے اور شرط باطل ہو جاتی ہے:

"وهب أمه إلا حملها، وعلى أن يردها عليه او يعتقها أو يستولدها أو وهب دادا على أن يرد عليه شيئا منها ولو معينا كثلث الدار أو ربعها أو على أن يعوض في الهبة والصدقة

شيئا عنها صحت الهبة وبطل الاستثناء فی الصورة الأول وبطل الشرط فی الصورة الثانية، لأنه بعض أو مجهول والهبة لا تبطل بالشروط"(شامی، کتاب الهبة:۵؍۷۰۶)

بظاہر یہ صورت پرائیوڈ نڈ فنڈ کی طرح ہے، جس میں ملازم ہر ماہ ایک رقم جمع کراتا ہے اور اخیر میں حکومت اس کو بڑھا کر واپس کرتی ہے؛ اس لیے اس کو جائز ہونا چاہیے"(۱)

چینل مارکٹنگ کا حکم شریعت کی روشنی میں

پوری دنیا میں وقتاً فوقتاً ملٹی لیول مارکٹنگ MLM یا چینل مارکٹنگ، عربی زبان میں "التوسيق الشبكى، التصديق الحرم" کے نام سے مختلف کاروبار چلتے رہتے ہیں، کبھی D.X.N. کے نام پر Vestage،Amway Qnet،R.C.M. Busness یہ مختلف نام مختلف ملکوں میں چلتے رہے ہیں اور آج کی ہمارے ملک ہندوستان میں Vostage نامی ایک کاروبار کافی ترقی کررہا ہے، لوگ اس میں حصہ لے رہے ہیں، ان سب کاروباروں کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے کہ استعمال کا سامان، Cosmatek کا سامان یا گھریلو Kitchen کی ضروریات کس ہوٹل کا قیام اور اس کی ٹکٹ وغیرہ وغیرہ مختلف انداز کا سامان بیچا جاتا ہے اور اس میں یہ کہا جاتا ہے کہ A کا ایک سلسلہ ہو B کا ایک سلسلہ ہو، پھر آگے A.b دونوں کو لائن میں آگے بڑھاتا رہے گا، جوڑتا رہے، جتنا وہ جوڑتا جائے گا اتنا اس کا فائدہ ہوتا جائے گا، گویا اس کاروبار کی بنیاد ہی یہ چین سسٹم ہے۔

حلال وحرام کی پہچان

ایک بنیادی بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہئے، حلال وہی ہے جس کو اللہ نے حلال کیا ہے، حرام وہی ہے جس کو اللہ نے حرام کیا ہے، مفتی صاحب کے سامنے پوری

---

(۱) سہ ماہی مجلہ بحث ونظر، ص:۲۰، جنوری-جون ۲۰۱۹ء

صورتِ مسئلہ بتا کر مسئلہ پوچھا جائے ،اگر اُن کو پوری صورتِ مسئلہ نہ بتائی جائے ،مکمل نہ بتائی جائے اور اندھیرے میں رکھ کر حلال ہونے کی رائے لے لے تو اس سے وہ حرام چیز حلال نہیں ہو جاتی۔

نفع لینا کب جائز ہوتا ہے؟

اچھی طرح اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ نفع یا تو (۱) خرید وفروخت سے جائز ہوتا ہے، (۲) یا Invest کرنے سے مضاربت سے جائز ہونا ہے، (۳) یا Partner بننے سے مشارکت سے جائز ہوتا ہے، (۵) یا اجیر یا مزدور بننے سے جائز ہوتا ہے چنانچہ پہلی مرتبہ جس نے سامان خریدا آپ کے لیے سامان جائز ہے؛ لیکن پریشان یہ ہے کہ یہاں پر ممبر بنے بغیر سامان نہیں دیا جاتا اور محنت دو چار پر ہوتی ہے لیکن کمیشن ناویں ہزارویں کا بھی کھایا جاتا ہے کہ مثلاً دسواں آدمی جو آپ کے ذریعہ سے ممبر بنا اس نے آگے بڑھتے بڑھتے ہزارویں کو ممبر بنایا، جس پر پہلے کی کوئی محنت نہیں ہے دوسرے کی کوئی محنت نہیں ہے، لیکن پہلے کو بہت بڑی مقدار کمیشن کی، بونس کی دی جارہی ہے یہ کسی جائز خانے میں نہیں آتی ہے، پہلے شخص کو جو اس نے ممبر بنایا وہ نفع تو اس کے لیے جائز ہے، لیکن کوئی آدمی پورے چینل سے ہٹ کر کوئی سامان بالعموم خرید نہیں سکتا۔

چینل مارکیٹنگ کے اندر پائی جانے والی قباحتیں

ایمان والے کا یہ یقین ہے کہ تھوڑا سا حلال بہتر ہے حرام کی زیادہ مقدار کے سامنے، سب سے پہلا پہلو شرعی نقطۂ نظر سے اس کاروبار کو دیکھنا چاہئے ، اس پورے کاروبار میں ایک ہی مقصد ہوتا ہے: Channel بنانا، سلسلہ بڑھانا، رات دن محنت کر کے لوگوں کو مطمئن کرتے ہوئے ان کو حصہ دار بنانے کی کوشش کرنا اور اس کے نتیجہ میں جو فیصدی نفع دیا جاتا ہے یا مختلف Post (مقام، درجہ) دیے جاتے ہیں، ان مختلف مصنوعات کے نام پر روپے وصول کرنا، اس کے اندر بہت ساری قباحتیں پائی جاتی ہیں:

۱) سب سے پہلی خرابی یہ ہے کہ صفقۃ فی صفقۃ ایک معاملہ میں دوسرے معاملہ کو جوڑا جاتا ہے، سامان خریدنے کے لیے شرط ہے کہ آپ ممبر بنے اور ممبر بننے کے لیے شرط ہے کہ آپ سامان خریدیں، اجارہ اور بیع کو لازم وملزوم کردیا گیا ہے۔

۲) دوسری خرابی یہ ہے کہ اس کاروبار سے جڑنے والا ایجنٹ یا کمیشن کمانے والا بھی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، کمیشن اس کو اس لیے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کمیشن اور ایجنٹ آزاد ہوا کرتا ہے، سامان خریدے بغیر بھی وہ سامان بیچ سکتا ہے، کسی اور کمپنی کا سامان بھی بیچ سکتا ہے، ضرورت کا سامان یا مارکٹ مین جس سامان کی ضرورت ہے عام طور پر کمیشن ایجنٹ وہی سامان بیچتا ہے؛ لیکن ملٹی لیول کمپنیوں میں یہ بات ہر جگہ دیکھی جارہی ہے کہ بیچا جانے والا سامان عام طور پر خریدار کی ضرورت ہی نہیں ہوتا اور وہ اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ عام حالات میں وہ اسے خریدنا نہیں چاہتا ہے، اور سامان اگر کھلے بازار میں اسے رکھا جائے تو خریدار نہیں ملتا، اس لیے اس کو کمیشن ایجنٹ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

۳) تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ ملازم بھی نہیں بن سکتا کیوں کہ اگر یہ ملازم ہوگا تو اس کی باضابطہ تنخواہ طے ہونی چاہیے کام کرے یا نہ کرے ممبر بنایے یا نہ بنایے اور ملازم کے لیے کہیں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ کمپنی کا مال خریدے اور یہاں کمپنی کا مال خریدنا اس کا لازم ہوتا ہے۔

۴) چوتھی خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ اس میں غرر کی ہے سامان خریدنے کے بعد اگر آگے چینل بنتا ہے تو پھر اسے کمیشن ملے گا ورنہ نہیں ملے گا، تو یہ غرر ہے، یہی جوا قمار اور میسر ہے، چینل بن گیا تو چاند تک پہنچ جائے گا، غیر معمولی نفع حاصل ہوجائے گا، اور اگر چینل نہیں ملا تو ممبر بننے پر اور خریدے ہوئے سامان پر بھی افسوس ہوتا ہے۔

۵) پانچویں خرابی یہ ہے کہ یہ دلالی اور بردکری بھی نہیں ہے، یہ تو سود کی طرح بغیر

محنت کے گھر بیٹھے کمانے کی ایک ترکیب ہے، کیوں کہ دلالی بردکری ایک شخص پر دو پر تین پر یا چار پر ہوگی، دسویں بیسویں ناویں شخص پر اس کی محنت نہیں ہوئی ہے، لیکن کمیشن اس کا بھی اس کو مل رہا ہے۔

۶) چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس میں بیع اور شرط دونوں داخل ہیں کہ سامان خریدتا ہے تو ممبر بنیں گے یا ممبر بنیں گے تو سامان دیا جائے گا یا رعایت دی جائے گی: ''نہی عن بیع وشرط''(۱)

۷) تعجب یہ ہے کہ بعض لوگ اس میں ملنے والے نفع کو Bonus قرار دیتے ہیں انعام قرار دیتے ہیں، کیا انعام کو حاصل کرنے کے لیے اتنی کوشش ہوتی ہے؟ انعام یہ تو عقدِ تبرع ہے کہ اگر انعام نہ دیا جائے تو یہ محنت کرنے والے کیا اس بات پر تیار ہیں کہ ان کو بونس نہ دینے پر وہ خاموش ہو جائیں گے۔

۸) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری محنت کا پھل ہے خوب یاد رکھیں کہ ہر محنت جائز نہیں ہوتی اور محض محنت پر ملنے والا معاوضہ حلال نہیں ہوتا ورنہ تو چور کو چوری میں اور نقب لگانے میں جتنی محنت لگتی ہے اتنی اس میں نہیں لگتی تو کیا نقب لگا کر چوری والی محنت کا عوض حلال ہو جائے گا؟ یہ شیطان دھوکہ ہے حلال ہونے کا پیمانہ محنت نہیں بلکہ شریعت ہے، شریعت کی نظر میں جب محنت ہی ناجائز ہوگی تو کمائی بھی ناجائز وحرام ہوگی۔

۹) بعض لوگ اس کو جائز قرار دینے کے لئے حیلے حوالے کرتے ہوئے اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ اس چینل والے نظام کو صدقۂ جاریہ پر قیاس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح آپ کسی کو حافظہ بنا دیں پھر وہ کسی دوسرے کو پھر وہ تیسرے کو اسی طرح دسویں بیسویں تک پہنچ جائیں تو اوپر والے یعنی آپ کو بھی وہ ثواب ملتا ہے جبکہ اس دسویں شخص پر آپ کی محنت نہ ہوئی، یہ کتنی بڑی جرأت دین سے

---

(۱) مجمع الزوائد

ناواقفیت ہے، دنیوی معاملات کو اخروی درجات پر قیاس کرنے لگے، صدقۂ جاریہ کا ثبوت حدیث سے ثابت ہے اور اس نظام کا ثبوت تو نہیں ہے، یہ دراصل کم علمی کی دلیل ہے۔

چینل مارکیٹنگ کا حکم

بعض عرب علماء نے اس کو ربا الفضل اور ربا النسیہ بھی قرار دیا ہے؛ کیوں کہ چینل بتا کر آگے کمیشن کمانا ہی اصل مقصود ہوتا ہے، خریدا ہوا سامان ہر گز مقصود نہیں ہوتا، تو گویا ۴ر ہزار، ۵ر ہزار، ۲۵ر ہزار روپیہ دے کر اس کے اوپر نفع حاصل کیا جا رہا ہے، تو یہ ربا الفضل بھی ہوسکتا ہے اور ربا النسیہ بھی ہوسکتا ہے؛ اس لیے بڑے بڑے دار الافتاء نے حرام قرار دیا ہے، حرام قرار دینے والوں میں ہندوستان کے (۱) دار العلوم دیوبند (۲) ندوۃ العلماء (۳) مظاہر العلوم (۴) فقہ اکیڈمی کی ۳۰۰ صفحات پر مشتمل کتاب: ''ملٹی لیول مارکٹنگ'' (۵) سوڈاں فقہ اکیڈمی، (۶) اردن دار الافتاء (۷) مصر دار الافتاء (۸) سعودیہ کی افتاء کمیٹی (۹) فلسطین کی افتاء کمیٹی، (۱۰) اور مفتی تقی عثمانی نے فقہ البیوع میں اس کو حرام قرار دیا ہے، جائز قرار دینے والے علماء نے جو دلائل دئے ہیں بہت کمزور ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہیں یا غالباوہ صحیح صورتِ حال سے واقف نہیں ہے۔

ہمیں ان بڑے بڑے Economist کے بیانات کو دیکھنا چاہیے، علی محی الدین قرہ داغی، مصطفی عدوی، فتاوی بینات کی جلد نمبر ۴ر ۲۳۴ پر بھی اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

ملٹی لیول مارکیٹنگ کے نقصانات

تیسرا پہلو اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ Econemicلیول پر ملٹی لیول مارکیٹنگ Econamic کو تباہ کرنے والا ہے، تجارت کے بنیادی ڈھانچہ کو نقصان پہنچاتا ہے، اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، دوسرے فطری کاروباروں کو نقصان پہنچتا ہے، ایسی کمپنیاں اپنا خسارہ بتا کر غائب ہوجاتی ہے، اور اسی طریقہ سے پڑھنے

والے طلبہ اپنی پڑھائی میں دلچسپی ختم کر دیتے ہیں، کاروباری اپنا کاروبار ختم کر دیتے ہیں Practics کرنے والے اپنے پراکٹس ختم کر دیتے ہیں، اس خیالی دنیا اور اس خیالی وہمی نفع دنیا کو حاصل کرنے کے لئے، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار پر امریکہ، چین، کناڈا اور عرب ملکوں میں پابندی لگائی گئی ہے، ان کی ویب سائٹ دیکھی جاسکتی ہے، نہ مارکٹنگ کرنے والوں کو باقاعدہ تنخواہ دینے کی ضرورت نہیں ہے، باہر کی کوئی کمپنی عام طور پر کسی ملک میں داخل ہوتی ہے اور وہ اپنا سامان بہت آسان طریقے سے لوگوں پر تھوپ دیتی ہے، اور اس کی ٹوپی اس کے سر، اس کی ٹوپی اس کے سر، نفع کا ایک فیصد ان کو دیتے ہوئے بڑا مال وہ سمیٹ کر وہ اچانک غائب ہوجاتی ہے۔

الغرض ملٹی لیول مارکٹنگ ایک واضح اور صاف نقصان جو ضرور ہو کر رہے گا اور یہ ہورہا ہے کہ ایک خاص کمپنی کا تسلط اور اس کی Monopolyn اور اجارہ داری پورے ملک کی عوام پر قائم ہوجائے گی، لوگ اسی کمپنی کا سامان اور اسی کمپنی کا Pruduct چلانے پر ممبر شپ میں مجبور ہوجائیں گے اور کسی بھی خاص کمپنی کا اور کسی بھی خاص کاروبار کا اس طرح سے اجارہ داری قائم ہوجانا، تسلط کا قائم ہوجانا، بہت زیادہ ہر معیشت کے لیے نقصان ہوسکتا ہے، پھر اندھا دھن قیمتیں اور دولت کی گردش اور دولت کا بہاؤ ایک طرف ایک شخص یا ایک کمپنی کی طرف ہونے لگ جاتا ہے۔

چینل مارکیٹنگ پر محنت کرنے والے اتنی محنت اپنے کاروبار پر کرلیتے تو زیادہ بہتر تھا، سارا کھیل چین سلسلہ بنانے کا ہے، نہ سامان بیچنا مقصود ہے، نہ لوگوں کی ضرورت پوری کرتا۔

اہل علم ودعوت متوجہ ہوں

ایک اور پہلو جس کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھ میں آرہا ہے کہ ملٹی لیول مارکٹنگ میں جس طبقہ کو جھونکا جارہا ہے جو طبقہ زیادہ اپنی نیک نامی کو اور دینی تعلقات کو استعمال کر رہا ہیں وہ مسجدوں کے امام، اہل علم یا دعوت وتبلیغ سے وابستہ افراد ہیں، یہ کاروباری اچھی

طرح جانتے ہیں کہ اہل دین، اہل دعوت کو عوام الناس میں غیر معمولی اعتماد حاصل ہے؛ اس لیے وہ لوگ ان کا استعمال کرتے ہیں، مطمئن کرنے کے لیے اور آگے سلسلہ کو بڑھانے کے لیے ایسا ہوتا ہوا آرہا ہے، اور آگے ہوکر رہے گا کہ جو ان سے بڑے ممبر ہے ان کو بڑی رقومات مل جائے گی، اور جو چھوٹے لوگ ہیں ان کی رقومات نہیں ملے گی، یا بہت ترا نقصان ہوجائے گا، یا یہ کمپنی جب دھاندلی کرکے اچانک ملک کے منظر نامہ سے غائب ہوجائے گی، بستر پوٹلہ سمیٹ کر جب نکل جائے گی، پھر بہت زیادہ اندیشہ ہے کہ یہ دیندار، بہت زیادہ دیندار ماننے والے طبقہ اور امت کا اعتماد رکھنے والا طبقہ اس کی توہین ہوگی، غبن کا الزام ہوگا، ان پر انگلیاں اٹھے گی، ان کے تعلقات بگڑ جائیں گے، آئندہ دین کی بات سنانے کے لیے بڑی رکاوٹیں بن جائیں گی، اس لیے اہل دین ودعوت طبقہ سے بڑی لجاجت اور عاجزی کے ساتھ درخواست ہے کہ جب چینل مارکٹنگ حرام ہے اور ہمارے بڑے اکابر میں اس سلسلہ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، کسی کی جائز رائے نہیں ہے، کوئی متعارف نام کوئی قابل ذکر نام نے اس کے جائز ہونے کو نہ لکھا ہے نہ بولا ہے، دیندار طبقہ، باریش طبقہ کا، مسجد سے تعلق رکھنے والے طبقہ کا کسی کاروبار میں حصہ لینا اس کے جائز ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہے، حرام وحلال کی دلیل قرآن ہے، حدیث ہے اور با اعتماد علماء کے صحبت یافتہ، پہلے سے مقبول علماء کی آراء بھی اس میں سنی جانی چاہیے، بغیر تحقیق کے عوام الناس کو اس میں شامل کرنا خود کو بھی گڑھے میں ڈالنا ہے اور دوسروں کو بھی۔

خیر خواہانہ نصیحت، دردمندانہ اپیل

جو بھائی اس حرام اور ناجائز کمیشن کے کاروبار میں پڑ چکے ہیں ان بھائیوں کو خیر خواہانہ یہ نصیحت ہے کہ وہ آگے اس چین کو نہ بڑھائے، اور اس سے توبہ کرے، اور جو مال آچکا ہے، بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کریں، جتنے لوگوں کو اس حرام کاروبار میں جوڑا ہے، ان سب کو بتلادے کہ مجھے معلوم نہیں تھا، نادانی میں یہ حرکت کی ہے، میں

اس سے توبہ کرتا ہوں، آئندہ ہرگز نہ کریں گے، آپ کو بھی اس کی تلقین کرتا ہوں، دنیا کی تھوڑی دیر کی رسوائیاں آسان ہے، آئندہ کی ہمیشہ ہمیش کی رسوائیوں کے مقابلہ میں "من ترک شیئا للہ عوضہ اللہ خیرا منہ" جو اللہ کے لیے کوئی چیز چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر کوئی چیز اسے عطا کر دیتا ہے، یہ رب کریم کا وعدہ ہے، اس وعدہ پر یقین کرتے ہوئے اس حرام سے توبہ کریں اور ابھی سے لوگوں کو Join کرنا چھوڑ دیں۔

اگر کوئی شخص اس میں ملوث ہو چکا ہے اور اب وہ اللہ کی توفیق سے توبہ کرنا چاہتا ہے ہرگز جھجک نہ کرے پیچھے نہ ہٹے، بلکہ جن جن لوگوں کو اس نے Join کیا ہے ان سب حضرات تک ناجائز ہونے کے بیانات وتفصلات منتقل کریں، اگر وہ اور مزید سمجھنا چاہتے ہیں، اپنی علمی پیاس اور تشنگی کو بجھانا چاہتے ہوں، تو ہم ان کی خدمت کرنے کے لیے لکھی گئی تحریر تیار ہیں؛ لیکن اوپر بیان وہ کافی ہے، سارے پہلوؤں کو واضح کر دیا گیا ہے، اسی کو بار بار پڑھنا ان شاء اللہ ان کو مطمئن کر دے گا۔

ہرگز اس بات سے نہ ڈریں کہ دنیا کیا کہے گی، ہزار لوگوں کو حرام پر چھوڑ کر جائیں گے تو اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے، اور ہزاروں لوگوں کی معیشت جب تباہ ہو جائے گی، ان کی جیبوں کو مزید آگے سلسلہ وار آگے ہلکا کر دیا جائے گا، خالی کر دیا جائے گا، ان کی گاڑھی کمائیوں کو مہذب طریقے سے لوٹ لیا جائے گا، آپ اتنا بڑا جرم اپنی گردن پر کیوں لے کر جانا چاہتے ہیں۔

ابھی وقت ہے کہ واپسی ہو جائے، ابھی وقت ہے کہ ساتھیوں کو صاف طور پر مطلع کر دیا جائے، البتہ جتنے پیسے کا سامان ہم نے خریدا ہے اور ہم نے ڈائرکٹ براہِ راست جس ساتھی کو ممبر بنایا تھا، اس سے جو پیسے اور کمیشن ملا ہے وہ ہمیں جائز ہے اس سے آگے کے پیسے جو ہمارے پاس آرہے ہیں وہ ہمارے لیے ہرگز جائز نہیں ہے، وہ حرام ہی ہے، اس کو ثواب کے ارادے کے بغیر ہی صدقہ کر دینا ہی مسئلہ کا حل ہے جس کو

فقہاء نے لکھا ہے۔

اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس حرام کام کے ایک دروازے کو چھوڑ دینے پر تین دروازے حلال کے ضرور کھولے گا، جیسے زلیخا کو چھوڑنے پر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے جوان خوبصورت زلیخا ملی، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کو ذبح کرنے پر اللہ ہوا کو مسخر کر دیا، جیسے داؤد علیہ السلام کے لیے بیت اللہ کی تنخواہ کے چھوڑنے پر لوہے کو موم کر دیا۔

ساری دنیا اگر کسی زہریلی چیز کو دوا کہنے لگ جائے تو وہ دوا نہیں ہو جاتی اور اگر کسی چیز کے بارے میں بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ زہر ہے کوئی دوا کہتا ہے تو آدمی اتنی آسانی سے اس کو قبول نہیں کرتا ہے، جب اتنے سیکڑوں علماء اس کو زہر کہہ رہے ہوں، حرام قرار دے رہے ہوں، اور ہم اس کو دوا سمجھ کر استعمال کر لیں، کسی اَن پڑھ ساتھی کے کہنے پر، کسی نا معلوم ساتھی اور کسی بے دلیل کیے جانے والے بیان پر، یہ سوائے اپنے نفس کی تسلی اور سوائے شیطان کی گود میں بیٹھنے اور اپنے دل کو سمجھا لینے کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں ہے، اللہ کے یہاں اس قسم کے اعذار کی بنا پر اس کی گردن بچ نہیں سکتی ہے، ہم لوگ اپنے دوسرے ساتھیوں کو متوجہ کریں، فوراً پیچھے ہٹ جائیں اللہ ہمت و حوصلہ عطا کرے۔ آمین

جیونا کمپنی

آج کل ''جیونا'' نام سے ایک کمپنی قائم ہے، جس کی اسکیم یہ ہے کہ پینتیس سو (۳۵۰۰) روپے دیکر اس کے ممبر بن جاؤ اور ساڑھے تین ہزار کے عوض کمپنی کوئی شئ نہیں دے گی، لیکن اگر یہ ممبر کم سے کم مزید دو ممبر کمپنی کے لئے بنا دیتا ہے، یعنی یوں کہئے کہ کمپنی کو سات ہزار روپے دوسرے دو فردوں سے لا دیتا ہے، تو کمپنی اسے اس میں سے بطورِ کمیشن چھ سو (۶۰۰) روپے ادا کرے گی اور ان دو ممبروں میں سے ہر ممبر دو دو ممبر بناتا ہے، تو جہاں ان دو ممبروں کو چھ چھ سو (۶۰۰۔۶۰۰) روپے بطورِ کمیشن ملیں گے،

وہیں پہلے ممبر کو مزید بارہ سو (۱۲۰۰) روپے ملیں گے یعنی کل اٹھارہ سو (۱۸۰۰) روپے ملیں گے اور اگر یہ چاروں ممبروں میں سے ہر ممبر دو دو ممبر بناتا ہے، تو ان میں سے ہر ایک کو چھ چھ سو (۶۰۰۔۶۰۰) اور پہلے کو گذشتہ کے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) میں مزید چوبیس سو (۲۴۰۰) روپے ملا کر یعنی کل بیالیس سو (۴۲۰۰) روپے دیئے جائیں گے اور جیسے جیسے یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا ویسے ویسے پہلے ممبر کو بھی ہر ممبر پر کمیشن ملتا رہے گا۔

اسکیم کی یہ صورت جوا اور باطل طریقہ سے لوگوں کے اموال کھانے کی حرمتِ صریحہ پر مشتمل ہے، اس لیے اس طرح کی اسکیموں کا ممبر بننا او بنانا دونوں عمل شرعاً ناجائز وحرام ہے اور اس پر ملنے والا کمیشن بھی حرام ہے، اس لیے اس طرح کی اسکیموں میں شرکت سے کلی اجتناب ضروری ہے۔(۱)

ایزی پیسہ ایپ (Easy Paisa App)

ایک ایپ ہے ''ایزی پیسہ'' جس کے انسٹال کرنے پر ۱۵۰/ روالا پیکج ۸۰/ روپے میں ہو جاتا ہے، اسی طرح ایزی لوڈ کرنے پر پچاس فیصد خرچ ہوتے ہیں، اس سے مذکورہ فوائد حاصل کرنا کیسا ہے؟

جواب یہ ہے کہ ایزی پیسہ اکاؤنٹ ایک ایسی سہولت ہے جس میں آپ اپنی جمع کردہ رقوم سے کئی قسم کی سہولیات حاصل کر سکتے ہیں، مثلاً: بلوں کی ادائیگی یا رقوم کا تبادلہ، موبائل وغیرہ میں بیلنس کا استعمال وغیرہ، نیز تحقیق کرنے پر یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کی پشت پر ایک بینک ہوتا ہے Financing Telenor Milro Bank یہ بھی ایک قسم کا بینک ہی ہے کہ جس میں عام طور پر چھوٹے سرمایہ داروں کی رقوم سود پر رکھی جاتی ہیں اور اس میں سے چھوٹے کاروباروں کے لیے سود پر قرض بھی دیا جاتا ہے، اس اکاؤنٹ میں جمع کردہ رقم قرض ہے، اور چوں کہ قرض دے کر اس سے کسی بھی قسم کا نفع

---

(۱) حوالہ سابق: ۱۷۶/۲

اٹھانا جائز نہیں ہے، لہٰذا کمپنی کی طرف سے سہولتیں ناجائز ہوگی، مثلاً: کمپنی اکاؤنٹ ہولڈر کو اس مخصوص رقم جمع کرانے کی شرط پر یومیہ فری منٹس اور میسیجز وغیرہ کی سہولت فراہم کرتی ہے، یا رقم کی منتقلی پر ڈسکاؤنٹ وغیرہ دیتی ہے تو ان کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

الغرض اس میں اپنا اکاؤنٹ کھلوانا جائز نہیں ہے، اگر کوئی ایزی پیسہ اکاؤنٹ کھلوا چکا ہو تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ صرف اپنی جمع کردہ رقم واپس لے سکتا ہے۔(۱)

زیسٹ منی (Zest Money) اور Zero Cost

سودی نظم کو پوری دنیا میں عام کرنے، خواہشات کو بڑھا کر ۲۴ر گھنٹہ کی غلامی کو سر پر مسلط کرنے اور سود کے دلدل میں دھنسانے کے لیے آئے دن نیے نئے نام، طریقوں کی تبدیلی، ابھرتے عناوین اور آفرس اور دھوکہ کا لیبل (Label) لگا کر مختلف بینک، کمپنیاں اور کمیٹیاں پوری دنیا کے مال کو سمیٹ رہی ہے۔

شریعت نے ادھار بیچنے پر پیسوں کے بڑھانے کی گنجائش رکھی ہے، جبکہ قیمت متعین کر دی جائے کہ آج نقد لو گے تو ۱۵ر ہزار روپیہ دینا ہوگا، ۶ر ماہ (قسطوں میں) بیاج نہ بڑھایا جائے، قسطوں کے ادا نہ کرنے پر پچھلے Instalment کو ڈبایا نہ جائے اور خریدی گئی چیز چھینی نہ جائے۔

خوب یاد رکھیں! بینک کوئی پیسہ بانٹنے کے لیے نہیں ہوتا، کوئی دوکان یا کمپنی عموماً کسی انسانی جذبہ کے تحت نہیں کھلتی، Finace پر اشیاء کی فروختگی غربت دور کرنے کے لیے نہیں ہوتی، اچھے اچھے آفرس (Offers) انسانیت کی خدمت یا رفاہی کام کا زینہ نہیں ہوا کرتی، انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، یہ کمپنیاں دکھاتی کچھ ہے اور کرتی کچھ ہے، یہ کمپنیاں خدمتِ خلق کے لیے بازار میں ہرگز نہیں آتی؛ بلکہ ہر کمپنی کا مقصد پیسہ کمانا اور سمیٹنا ہی ہوتا ہے۔

انہی کمپنیوں میں سے ایک زیرو کاسٹ یا نو کاسٹ (Zero Cost no Cost)

---

(۱) بینک کے مسائل، مفتی عامر صاحب کانپوری

کا کانسپٹ (Consept) چل پڑا ہے کہ آپ کو زیرو کاسٹ پر گاڑی دی جائے گی فون یا واشن مشین دیا جائے گا، جس کا نعرہ، Label اور سرورق بغیر سود کے قسطوں پر ادائیگی کا ہے، خریدنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے ہمیں قسطوں میں ادا کرنے کا انتظام کر دیا ہے؛ لیکن جب رقم ادا کرتا ہے، قسطوں میں تاخیر ہوتی ہے، تمام شرائط و باریکیوں پر گہری نگاہ پڑتی ہے، تب معلوم ہوتا ہے کہ یہ (بغیر سود کے قسطوں کی ادائیگی) ۳/۶/ مہینوں کے ساتھ مقید ہے، یعنی اگر کسی شخص نے تین مہینے یا چھ مہینے کے اندر اندر اپنے حاصل کردہ قرض کو واپس لوٹانے کے ارادہ سے ہی کسی پروڈکٹ (Product) کو خریدا تھا؛ لیکن کسی وجہ سے وہ وقت مقررہ اپنے حاصل کردہ قرض کو واپس نہ لوٹا سکا تو اب اس کو اصل رقم کے ساتھ سود بھی ادا کرنا پڑے گا، جیسا کہ ریسٹ منی کے معاہدہ (Agremdng) میں یہ بات مکمل وضاحت کے ساتھ مذکور ہے:

However in Such cases, in the event the installment id not paid on the due date. All overdue amounts shall accrue interest at the prwscrobed rate which shall be compated respective due dates for payments and shall become payable upon tarting of compounal interest with monthly rests.

اور اکثر کیش بیک (Cashback) کے عنوان سے ابتداءً زائد رقم لی جاتی ہے، پھر ادائیگی میں تاخیر ہونے پر اسی کو سود کا نام دے کر جمع کر لی جاتی ہے، واپس نہیں کی جاتی۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معاملہ زیسٹ منی کی جانب سے حاصل کردہ کوپن کورڈ

یا گفٹ ووچر (Gift Voucher) سے ہو، کیوں کہ اگر کوئی شخص زیسٹ منی کی جانب سے کوپن کورڈ یا گفٹ ووچر وغیرہ حاصل کیے بغیر فلپ کارڈ یا امیزون (Amazon) وغیرہ سے کوئی چیز خریدتا ہے تو چاہے وہ تین مہینے چھ مہینے بارہ مہینے کسی بھی مدت پر وہ چیز خریدے اس کو ہر حال میں سود ادا کرنا لازم ہے جو کہ ناجائز ہے۔

اور عام طور پر ایسے شرائط اور Xandisions کو Hiden رکھا جاتا ہے چھپایا جاتا ہے، یا اتنا چھوٹا ڈاٹ (Dot) یا Star ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو نظر بھی نہیں آتا اور خریدنے والا دھوکہ کھا جاتا ہے۔

اسی لیے دھوکہ تب ہی ہوتا ہے جب مسئلہ صحیح نہ سمجھا جاے، یا تمام شرائط اور نوعیت کا صحیح اندازہ نہ لگایا جائے، دنیا کی حرص کم قیمت میں زیادہ سامان، معیار زندگی اور Sratus Main Tain کرنے کے جنون میں اس کے تمام شرائط اور باریکیوں پر نگاہ ڈالے اور علماء سے رہبری لیے بغیر ابھرتے عناوین اور آفرس کا نام ان چیزوں میں ملوث ہونے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اس طرح آدمی ایک معمولی خواہش (مثلاً: ۱۰/ہزار کے فون سے ضرورت پوری ہو رہی ہے؛ لیکن ۲۲/ہزار کے فون کی خواہش کرنا یا ۲/لاکھ کی گاڑی سے ضرورت پوری ہو رہی ہے، لیکن ۱۵/لاکھ کی گاڑی Finace پر لینا چاہتا ہے) کی بنا پر اللہ سے اعلانِ جنگ اور اپنی ماں سے بے حیائی کرنے کے گناہ سے بھی بر تر گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قسطوں کا عذاب، سود کا بوجھ، اللہ کی ناراضگی، آئندہ دس بیس سال کی غلامی، بینک اور سودی نظام کا مزدور اور اجیر بننا پڑتا ہے۔

بٹ کوئن (Bit Coin)

بٹ کوئن (Bit Coin) انگریزی Bitcoin ایک ڈیجیٹل کرنسی اور پیئر ٹو پیئر پیمنٹ نیٹورک ہے، اس ڈیجیٹل کرنسی کا وجود محض انٹرنیٹ تک محدود ہے، خارجی طور پر اس کا کوئی جسمانی وجود نہیں، اسی طرح بٹ کوئن کرنسی کے پیچھے کوئی طاقت ور مرکزی

ادارہ مثلاً: مرکزی بینک نہیں ہے اور نہ ہی کسی حکومت نے اب تک اسے جائز کرنسی قرار دیا ہے، اسی وجہ سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے وزارت خزانہ نے اسے غیر مرکزی کرنسی (Deconlralized Carrency) قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اس کرنسی کو ایک شخص براہ راست دوسرے شخص کو منتقل کرسکتا ہے، اس کے لیے کسی بینک یا حکومتی ادارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، تاہم انٹرنیٹ کے ذریعہ بٹ کوئن کو دیگر رائج کرنسیوں کی طرح ہی استعمال کیا جاسکتا ہے، الغرض یہ ایک آزاد کرنسی ہے، جس کو ہم اپنے کمپیوٹر کی مدد سے بھی خود بناسکتے ہیں۔

ہر بٹ کوئن دس کروڑ چھوٹے حصوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں ''ستوشی'' کہا جاتا ہے، ہر UTXO کی قیمت ''ستوشی'' میں ریکارڈ کی جاتی ہے، بٹ کوئن کی آخری حد 21 ملین ہے۔

اس بٹ کوئن کا آغاز ۲۰۰۹ء میں کاذب نام ستوشی ''نا کاماتو'' (Satoshi Nokonob) نے کیا ہے اسے کرپٹو کرنسی کہتے ہیں: کیوں کہ یہ پبلک کی کریٹوگرافی کے اصولوں پر مبنی ہے۔

حکم اور علماء کی آراء

❁ حضرت مولانا محمد احمد افنان صاحب اس حوالہ سے فرماتے ہیں: Bit Coin شرعی لحاظ سے ''مال'' کے زمرے میں آتا ہے، اور یہ شرعی لحاظ سے ثمن بھی ہے (کہ لوگوں کے عرف میں مال بھی ہے اور طبیعت سلیمہ اس کی طرف مائل بھی ہوتی ہے اسے محفوظ بھی کیا جاسکتا ہے) اس اعتبار سے Bit Coin اور دیگر ڈیجیٹل/Virtual کرنسیاں شرعی کرنسی سے فلوسِ رائجہ کے حکم میں ہیں، لہٰذا اس پر بھی کرنسی نوٹ کے احکام جاری ہوں گے، جیسے : سود، مضاربت، مشارکت، سلم، قرض اور وجوبِ زکوۃ وغیرہ کے مسائل جاری ہوں گے۔

البتہ ان دونوں میں فرق یہی ہے کہ کرنسی نوٹ کی ثمنیت حکومت کی مرہون منت

ہوتی ہے، حکومت اگر ثمنیت باطل کردے تو ان کی کوئی قیمت باقی نہیں رہے گی، جب کہ غیر حسی کرنسیوں کی ثمنیت باصطلاح الناس قائم ہوتی ہے؛ لہٰذا جب تک یہ عرف قائم ہے ثمنیت بھی باقی رہے گی، عرف ختم ہونے کے بعد سلعہ کے حکم میں ہوگا، فقہ میں اس کی مثال نبہرجہ یا زیوف کی ہوگی۔

بعض ممالک نے اسے قانونی طور پر تسلیم کیا ہے اور اس پر دیگر کرنسیوں کی طرح ٹیکس بھی لگایا ہے، جیسے امریکا، جرمنی، ہالینڈ اور اکثر ترقی یافتہ ممالک، بعض نے اس سے منع نہیں کیا اور نہ ہی اس کے استعمال کے ضوابط Regulations بنائے ہیں، جیسے: ہانگ کانگ۔

بعض ممالک اس معاملے میں بالکل ساکت ہیں، جیسے: پاکستان، اس قسم کے ممالک میں Bit Coin کو بطور کرنسی استعمال کرنا جائز ہے جن ممالک میں اس کو ذریعہ تبادلہ بنانا قانونی طور پر منع ہے، ایسے ممالک میں حکمِ حاکم کی وجہ سے اس کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

- مفتی محمد حسین ہاجوری صاحب نے اس بٹ کوئن کی چند خصوصیات کے علاوہ خطرات مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد سوال کے جواب میں تحریر فرمایا کہ ”اس طرح کی کرنسی کی زبردست حوصلہ شکنی کرنی چاہئے، تاہم جہاں رائج ہو تو وہاں آپ کے ذکر کردہ جوہات کی بناء پر اس پر کیے جانے والے معاملات کو درست قرار دیا جانا چاہئے، ویسے بھی نوٹ میں اصلی مالیت مخصوص نمبر کی وجہ سے ہے، باقی شکل وصورت تو نمبر کے نقل وحمل کو آسان بنانے کے لیے ہے؛ لہٰذا کوئی جوہری فرق نہیں۔

- مفتی ارشاد اعجاز (شریعہ ایڈوائزر بینک اسلامی) صاحب اس حوالہ سے فرماتے ہیں: ”میری رائے میں بٹ کوئن فی نفسہ جائز زرمبادلہ ہے؛ کیوں کہ اس کی اساس اگرچہ خود کرنسی یا اثاثے تھے، مگر اب یہ خود مستقل بالذات زر کا درجہ کسی

نہ کسی حد تک دکھتا ہے اور زر کے لیے کسی اثاثے یا نقود کی اساس پر ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ فیاٹ منی کے جواز پر علماء کی آراء سے یہ واضح ہوتا ہے؛ البتہ اس کے جواز کے فتوی کے ساتھ قانونی اور انتظامی شرائط کا ذکر ضروری ہے؛ تاکہ مستفتی کو اس کی صحیح حیثیت کا علم ہو سکے، خصوصاً وہ ممالک جہاں یہ قوانین کے تحت ممنوعات میں شامل ہو وہاں اس میں تعامل ناجائز ہوگا۔

- مولانا عبداللہ اعوان صاحب رقمطراز ہیں کہ بٹ کوئن اپنے تمام شرعی قیود وبند کے ساتھ مروجہ کرنسی نوٹ کی طرح ''فلوس نافقۃ'' ہی کے زمرے میں آتا ہے؛ چنانچہ جو فقہی احکام کرنسی نوٹ پر متفرع ہوتے ہیں، مثلاً: وجوبِ زکوۃ، سلم، استصناع، مضاربہ ومشارکہ میں رأس المال ہونے کی صلاحیت، صرف اور ربا اسی طرح بٹ کوئن پر بھی وہی فقہی احکام جاری ہوں گے۔
- حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں یہ سوال پیش گیا تھا، حضرت نے فرمایا کہ مال کا ''عین'' ہونا ضروری ہے اور Bit Coin اعیان میں سے نہیں ہے؛ بلکہ اعراض میں سے ہے؛ اس لیے اس پر مال کی تعریف صادق نہیں آتی۔
- شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم سے پوچھا گیا، حضرت نے فرمایا کہ ابھی اس کی صورت حال پوری طرح واضح نہیں ہے؛ اس لیے فی الحال اس کا جواب دینے سے توقف کیا جائے۔(۱)

ورچوئل کرنسی

لفظ ''Virtual'' انگریزی زبان کا لفظ ہے جو کہ لاطینی زبان سے انگریزی میں منتقل ہوا ہے، کمپیوٹر کے میدان میں یہ لفظ ایم مخصوص معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس کا معنی ہے: ''ایسی چیز جو حسی وجود نہ رکھتی ہو؛ بلکہ سافٹ ویئر سے ایسی بنی ہو کہ حسی وجود

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: Crppto mania The Shariah Verdicts

کی طرح ظاہر ہو' ورچوئل کرنسیاں سافٹ ویئر اور کمپیوٹر پروگرام کی مدد سے بنتی ہیں اور استعمال ہوتی ہیں۔

ورچوئل کرنسیوں میں سب سے مشہور کرنسی ''بٹ کوائین'' ہے ورچوئل کرنسیوں کے بارے میں کسی بھی تفصیل کو عموماً بٹ کوائن کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔

ورچوئل کرنسیوں کی خصوصیت، جس کی بناء پر لوگوں کا رجحان زیادہ ہوتا ہے ایک تو ٹیکس سے حفاظت ہوجاتی ہے، چوری اور چھینے جانے سے حفاظت کے ساتھ ساتھ کم محنت میں آسانی کے ساتھ قیمت بڑھتے رہتی ہے، جس میں حکومتوں اور ملکوں کا دخل نہیں ہوتا ہے۔

ورچوئل کرنسیوں کے حوالے سے بعض ممالک تو ایسے ہیں جہاں ان کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور بعض ممالک ایسے کہ جن کے بارے میں کوئی واضح قانون موجود نہیں ہے، جیسے جنوبی افریقہ، اور بعض ممالک وہ ہیں جن میں ان کرنسیوں کو باقاعدہ غیر قانونی قرار دیا جاچکا ہے۔

ورچوئل کرنسیوں کے حکم سے متعلق علماء کی وہی آراء اور اقوال ہیں جو بٹ کوئن سے متعلق ہیں؛ کیوں کہ بٹ کوئن ورچوئل کرنسی کی مشہور مثال اور پہچان ہے۔(۱)

بانڈ وڈبینچر (Bonds Debentures)

آج کی بانڈ اور ڈبینچر کا استعمال بہ طور مترادف ہوتا ہے، اس میں کوئی بہت زیادہ فرق بھی نہیں ہے، ابتاء میں اس کی صرف دو ہی قسمیں تھیں؛ لیکن سرمایہ کاری کے میدان میں جوں جوں ترقی ہوئی ویسے ویسے بانڈ اور ڈبینچر کی قسموں میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

بنیادی طور پر ڈبینچر کی دو قسمیں ہیں: پہلے کو محفوظ ڈبینچر (Secared Debenture) اور دوسرے کو غیر محفوظ ڈبینچر (Unsevarel Debenture) کہا جاتا ہے، نیز وقت کے اعتبار سے بھی بانڈ اور ڈبینچر کی تقسیم ہوتی ہے۔(۲)

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: ورچوئل کرنسیوں کی شرعی حیثیت، محمد اویس پراچہ، دارالافتاء، جامعۃ الرشید کراچی

(۲) تفصیل کے لیے شیئر بازار تعارف اور مواقع وغیرہ کتب دیکھی جاسکتی ہیں۔

شیئر اور بانڈ میں فرق اور اس کا حکم

شیئر اور بانڈ میں بنیادی طور پر یہ فرق ہوتا ہے کہ شیئر کمپنی میں شراکت کا ایک سرٹیفکیٹ ہوتا ہے جس میں بالعموم نفع کی مقدار متعین نہیں ہوتی، اس کے برخلاف بانڈ وڈبینچر قرض کی دستاویز ہوا کرتا ہے، اس میں خریدار کو ایک متعینہ مقدار میں ایک متعینہ مدت کے لیے سود ملتا رہتا ہے، اس میں قرض دہندہ اور قرض وصول کنندہ کے نام کے ساتھ کچھ ہدایات وغیرہ درج رہتی ہیں، شیئر کی صورت میں خریدار کو کبھی نقصان کا بھی سامنا کرنا پڑسکتا ہے، لیکن بانڈ میں نقصان کے امکانات بہت ہی کم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے اس میں نفع کی مقدار بھی بہت کم ہوتی ہے، اس کے علاوہ بانڈ اور ڈبینچر میں ایک طرح سے قانونی معاہدہ ہوتا ہے کہ بانڈ خریدنے والے شخص کو اس کی رقم کچھ زائد کر کے ایک خاص مدت کے بعد واپس کر دی جائے گی، اگر کمپنی کسی وجہ سے ٹوٹ جائے اور کمپنی کو نفع نہ حاصل ہوسکے تو بھی ایک خاص وقت پر کمپنی مالکان کو اپنی کمپنی کا اثاثہ فروخت کر کے بانڈ خریداروں کو رقم چکانا ہوگا، اگر کمپنی مالک راہ فرار اختیار کر لے تو یہ کام گورنمنٹ کرے گی، گورنمنٹ اس کمپنی کے موجودہ یا بچے ہوئے سرمایہ کو فروخت کر کے بانڈ خریداروں کے درمیان تقسیم کر دے گی، شیئر کی طرح بانڈ اور ڈبینچر کی فروخت بھی اسٹاک مارکیٹ میں ہوتی ہے؛ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ چیز جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں بالواسطہ سود کا عمل دخل ہے، اسی وجہ سے بہت سے علماء نے اسے ناجائز قرار دیا ہے۔(۱)

فارن ایکسچینج

فارن ایکسچینج بیرر سرٹیفکٹ کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ بیرونِ ہند ملازمت کرتے ہیں، وہ اگر زرِ مبادلہ ہندوستان لے آئیں، تو حکومت کا قانون یہ ہے کہ وہ بیرونی زرِ مبادلہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرائیں اور اس کے بدلے حکومت کے طے کردہ نرخ کے مطابق ہندوستانی روپیہ وصول کریں۔

---

(۱) مستفاد: شیئر بازار، تعارف ومواقع، ص: ۳۹-۴۰

اس سرٹیفکٹ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اسے دکھا کر کسی بھی ملک کی کرنسی تبادلے کے دن کی قیمت کے اعتبار سے وصول کی جاسکتی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس سرٹیفکٹ کو ایک مدتِ مخصوص تک اپنے پاس رکھے تو وہ کچھ فیصد نفع کے ساتھ ہندستانی روپیہ میں اسے بھنا سکتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ مدتِ مخصوصہ گزرنے پر یا اس سے پہلے کسی بھی وقت وہ اس کو بازارِ حصص میں ہی جس قیمت پر چاہے فروخت کرسکتا ہے چونکہ اس سرٹیفکٹ کی وجہ سے اس کے حامل کو زرمبادلہ حاصل کرنے کا حق مل جاتا ہے، اس لیے عموماً بازارِ حصص میں لوگ اسے زیادہ قیمت میں خریدتے ہیں، مثلاً ۱۰۰/روپے کا سرٹیفکٹ ۱۱۰ روپے میں بک سکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ سرٹیفکٹ حکومت کے ذمہ دین کا وثیقہ ہے اب خود حکومت مدتِ مخصوصہ کے بعد اس ۱۰۰ روپے کے وثیقہ کو ۱۱۰ روپے میں لیتی ہے تو گویا وہ دین پر دس فیصد زیادتی ادا کر رہی ہے جو شرعاً واضح طور پر سود ہے۔

اور اگر اس سرٹیفکٹ کا حامل یہ وثیقہ دین بازارِ حصص میں اس کی اصل قیمت سے زائد پر فروخت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنا دین زیادہ قیمت پر دوسرے کو فروخت کررہا ہے، اور یہ معاملہ بھی سودی ہونیکی وجہ سے ناجائز وحرام ہے۔(۱)

باقی فارن ایکسینج کے سرٹیفیکٹ کو خریدنے وغیرہ سے متعلق کی تفصیل کے لیے دیکھئے: (فقہی مقالات: ۲/ ۲۶۲، زمزم بکڈپو)۔

انعامی بانڈس (Prize bonds) کا مفہوم

بعض اوقات حکومت یا کسی کارپوریشن کی جانب سے عوام سے قرض لیے جاتے ہیں، اور ان قرضوں کے عوض میں ان کی توثیق کے لیے تحریر لکھ دی جاتی ہے

(۱) فتاویٰ حقانیہ: ٦/ ۲۱۲

جس کو بانڈ (bond) کہتے ہیں، بانڈ کا اطلاق عام معنی میں قرض کی ایسی تمام دستاویزات پر ہوتا ہے۔

جو حکومت یا کسی کارپوریش کی جانب سے حصول قرض کے لیے جاری کیے جاتے ہیں، لہٰذا ڈبینچرس (debentures) ہو یا حکومتی سیکوریٹیز اصلا یہ سب بانڈس ہیں۔

لیکن یہ اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے الگ الگ ناموں سے جانے جاتے ہیں، بانڈس کی مختلف قسموں میں سے ایک اہم قسم انعامی بانڈ ہے، اسٹیٹ بینک بانڈ جاری کر کے لوگوں سے قرض وصول کرتا ہے اور انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ تم جب چاہو بانڈ واپس کر کے اپنی رقم لے سکتے ہو اور یہ لالچ بھی کہ قرعہ اندازی تک انتظار کر کے نام نکل آنے کی صورت میں بہت بھاری رقم مل جائے گی، اس لالچ میں لوگ بہت زیادہ مقدار میں پرائز بانڈ خرید لیتے ہیں، اسٹیٹ بینک ان رقوم کو آگے کسی اور بینک یا ادارے کو سود پر دے دیتا ہے، اس سے سود لے کر کچھ حصہ قرعہ اندازی کے ذریعہ تقسیم کر دیتا ہے اور بقیہ رقم اپنے پاس رکھ لیتا ہے۔

اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر سالانہ متعین فیصد شرح سود ادا کرنے کے علاوہ قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام دیئے جانے کا متحرک ریزرو بینک کا وہ قانون ہے جو وہ تمام اداروں پر عائد کرتا ہے کہ کوئی بھی متعین فیصد شرح سے زائد ڈپازیڑوں کو سود نہیں دے گا، اور عام طور پر یہ متعین کردہ فیصد سے کم ہی ہوتا ہے، اس لیے یہ ادارے انعامی بانڈس کے ذریعہ اپنے منافع میں سے ایک بڑی رقم نکال کر ڈپازیٹروں کو دیتے ہیں، اور اس اسکیم سے ان کا مقصد لوگوں کو اپنی کمپنی کے دستاویزات کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے؛ چنانچہ اس سے انہیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انعام کی لالچ میں لوگ زیادہ سے زیادہ بانڈس خریدتے ہیں جس کے نتیجہ میں کمپنیاں اپنے مقصد یعنی کثیر مقدار میں سرمایہ جمع کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔(۱)

---

(۱) اسلام اور جدید اقتصادی مسائل ص: ۳۶۵

❁ ڈاکٹر وہبہ الزحیلی نے اس پر ''مجمع الفقہ الاسلامی'' کا ایک متفقہ قرارداد پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

"إن السندات التی تمثل التزاما دفع مبلغها مع فائدة منسوبة إليه أو نفع مشروط محرمة شرعا من حيث الإصدار أو الشراء أو التداول لأنها قروض ربوية سواء كانت الجهة المصدرة لها خاصة أو عامة ترتبط بالدولة، ولا أثر لتسميتها شهادات أو صكوكا استثمارية أو إدخارية أو تسمية الفائدة الربوية الملتزم بها ربحا أو ريعا أو عمولة أو عائدًا"(۱)

مذکورہ بالا عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ایسے بانڈز جن پر مشروط اضافہ ملتا ہے، اس معاملہ کی حقیقت قرض پر سود لینے کی ہے، ایسے بانڈز کو جاری کرنا، خریدنا، بیچنا اور اس پر نفع لینا قطعاً جائز نہیں اور نام بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا''۔

❁ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ''بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ'' میں بھی اسے قرض کا معاملہ قرار دیا ہے:

"وحقيقتها أن الحكومة ربما تحتاج إلى الاستقراض من عامة الشعب لمواجهة عجز ميزانيتها، فتعطى كل مقرض سندا يمثل مديونية الحكومة تجاه حاملة"

اور قرض دے کر کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھانا ربا (سود) ہے۔

كل قرض جر نفعا فهو ربا

❁ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ نے ''احسن الفتاوی'' میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:

---

(۱) الفقه الإسلامی وأدلته، ترادات شان السنادت: ۵۱۸۸/۷

''انعامی بانڈز خریدنا جائز نہیں، سود اور جوا کا مجموعہ ہے حرام در حرام ہے''(۱)

❁ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

''انعام بانڈز کے انعام میں ملنے والی رقم حرام ہے اس کا استعمال جائز نہیں''(۲)

دوسری جگہ فرمایا:

''انعامی بانڈز کی رقم لینا جائز نہیں، جتنے میں خریدا ہے اتنی ہی رقم میں اسے واپس کر دینا درست ہے''(۳)

❁ دار العلوم کراچی کے دار الافتاء سے صادر فتوی:

''پرائز بانڈ لینے والے اور جاری کرنے والے ادارے کے درمیان معاملہ کی حیثیت شرعا قرض کی ہے۔۔۔اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ پرائز بانڈ پر ملنے والا انعام شرعا سود ہے اور سودی انعام کی تقسیم کا یہ طریقہ جوئے سے مشابہ ہے۔۔۔اس سلسلہ میں بعض لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ چوں کہ بانڈز پر زیادتی مشروط نہیں ہوتی، اس لیے یہ سود نہیں؛ کیوں کہ اگرچہ یہاں انفرادی طور پر زیادتی مشروط نہیں ہوتی؛ لیکن مجموعی رقم پر زیادتی مشروط ہوتی ہے''

❁ حضرت مولانا مفتی عبد الرؤف سکھروی صاحب نے بھی اس کو حرام قرار دینے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ

''انعامی بانڈ کے انعام کو تجارتی انعام پر قیاس کرنا درست نہیں، اسی

---

(۱) احسن الفتاوی: ۲۷/۷

(۲) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۷۲/۶

(۳) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۲۷۴/۶

طرح انعامی بانڈ کے لین دین کو فقہی لحاظ سے بیع قرار دینا بھی صحیح نہیں؛ کیوں کہ حقیقتاً یہ خرید و فروخت نہیں بلکہ قرض کا لین دین ہے"۔

الغرض یہ معاملہ چوں کہ قرض ہے اور اس پر ملنے والی رقم سود ہے تو سودی عقد ہنے کی وجہ سے پرائز بانڈ لینا ہی جائز نہیں ہے، اس پر تمام اہل علم متفق ہیں، اور جس طرح سود لینا ناجائز ہے اس طرح سودی عقد بھی ناجائز ہے؛ لہٰذا اگر بانڈ ہولڈر کی انعام لینے کی نیت نہ ہو تب بھی یہ معاملہ ناجائز ہے، اگر کسی نے نادانستہ طور پر یہ بانڈز لے لیے ہیں تو شرعاً لازمی ہے کہ فوراً اس ادارے کو واپس کرادے جس سے لیے ہیں، یا پرائز بانڈ جاری کرنے والے ادارے میں جمع کرادے، جتنا جلد ممکن ہو اس معاملے کو ختم کردے"۔(۱)

- پرائز بانڈ کی حقیقت قرض ہے اور یہ دین قوی میں داخل ہے؛ لہٰذا اس کی اصل رقم پر زکوۃ واجب ہو جاتی ہے؛ البتہ اضافی رقم سارا کا سارا حرام ہے اور اس کو صدقہ کرنا لازم ہے؛ اس لیے اس میں زکوۃ نہیں۔
- اگر کسی بانڈ ہولڈر کا انتقال ہو جائے تو دوسرے واجب الوصول قرضوں کی طرح اس کی اصل رقم بھی ایک واجب الوصول قرض ہے اس واسطے تقسیم ترکہ کے وقت اسے بھی ترکہ میں شامل کر دیا جائے گا۔
- پرائز بانڈ خود مال نہیں؛ بلکہ ایک وثیقہ اور دستاوز ہے اس قرض کی جو بانڈ ہولڈر اسٹیٹ بینک کو دے چکا ہے، لہٰذا اس کو آگے کسی کو دینا بیع نہیں حوالہ ہے اس وجہ سے اس پر لکھی ہوئی قیمت "فیس ویلیو" سے کم یا زیادہ پر بیچنا جائز نہیں۔
- پرائز بانڈ کا پرائز بانڈ سے تبادلہ جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ "بیع الدین بالدین" ہے،

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: پرائز بانڈ کی شرعی حیثیت مفتی سمیع اللہ کراچی، مکتبہ عمر فاروق

جس کو ''بیع الکالی بالکالی'' کہا جاتا ہے، جو حدیث شریف کی رو سے حرام ہے۔

❁ پرائز بانڈ کے ذریعہ اشیاء خریدنے کی صورت میں بیع (یعنی خریدی جانے والی چیز) پر قبضہ ضروری ہے اگر اسی مجلس میں مبیع پر قبضہ نہیں کیا تو یہ بیع جائز نہ ہوگی۔(۱)

انعامی بانڈز کی رقم کا شرعی حکم

انعامی بونڈز کے نام سے جو انعام دیا جاتا ہے، حقیقتاً یہ سود کی ایک شکل ہے۔ انعامی بونڈز؛ کے انعام میں ملنے والی رقم حرام ہے، اور اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔ بینک جب انعامی بونڈز کی کوئی سیریز نکالتا ہے اور اس سیریز کے ذریعہ سے جو رقم عوام سے کھینچ لیتا ہے اس رقم کو عموماً بینک کسی کو سودی قرضے پر دے دیتا ہے، جس شخص کو قرضہ دیتا ہے اس سے بینک سود وصول کر کے اس سودی رقم میں سے کچھ اپنے پاس رکھتا ہے۔ اور کچھ رقم قرعہ اندازی (لاٹری) کے ذریعہ ان لوگوں میں تقسیم کر دیتا ہے کہ جنہوں نے انعامی بونڈز خریدے تھے، چنانچہ قرعہ اندازی کے بعد جو رقم لوگوں کو ملتی ہے وہ اصل میں سود ہی کی رقم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بینک اس رقم کو سودی قرضے پر نہیں دیتا بلکہ اس کو کسی کاروبار میں لگاتا ہے اور اس کاروبار سے جو نفع ہوتا ہے وہ قرعہ اندازی کے ذریعہ بونڈز خریدنے والوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے پھر بھی انعامی بونڈز پر ملنے والی رقم جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اول تو پارٹنرشپ کے بزنس میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے جبکہ یہاں بینک کی طرف سے نقصان کا کوئی ذکر ہی نہیں۔

دوسری بات یہ کہ تجارتی اور شرعی اصول کے مطابق پارٹنرشپ کے کاروبار میں جب نفع ہوتا ہے تو اس نفع میں ہر پارٹنر (شریک) کو اتنے فیصد ہی حصہ ملتا ہے کہ جتنے فیصد اس نے روپیہ لگایا ہے نفع کی تقسیم قرعہ اندازی (لاٹری) کے ذریعہ کرنا، اس میں بہت سوں کے ساتھ ناانصافی ہونا یقینی بات ہے، لہٰذا پرائز بونڈز کا انعام ہر اعتبار سے

(۱) مستفاد: پرائز بانڈ کی شرعی حیثیت

ناجائز اور حرام ہے اور یہ درحقیقت سود اور جوے دونوں کا مرکب ہے، اگرچہ بینک اسے ''انعام'' ہی کہتا ہے۔ زہر کو اگر کوئی تریاق کہے تو وہ تریاق نہیں بنتا، بلکہ زہر اپنی جگہ زہر ہی رہتا ہے یہ وہی پرانی شراب ہے جو نئی بوتلوں میں بند کر کے نئے لیبل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔

لہٰذا ایسے انعامی رقوم میں حصہ نہ لینا چاہیے نہ اس کو اختیار کرنا چاہیے، اگر یہ انعام کی رقم لے چکے ہیں تو اس کو بغیر نیت ثواب کے صدقہ کردینا چاہیے۔(۱)

انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کا حکم

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ پرائز بانڈز (انعامی بانڈز) سود اور قمار (جوا) کے مثل ہیں، حکومت کے بجٹ میں جب بھی خسارہ ہوتا ہے تو اس کو پورا کرنے کے لیے مختلف حیلے بہانے اختیار کرتی ہے، انعامی بانڈز بھی حکومتی بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے خرید شدہ بانڈز کی قیمت پر سود لگتا ہے اور جو سود بنتا ہے اس کو قرعہ اندازی کے ذریعہ جوا بنادیا جاتا ہے، چند افراد کے نام ہی قرعہ نکلتا ہے اور باقی فی الحال محروم رہ جاتے ہیں، لہٰذا سود اور قمار کی وجہ سے ان بانڈز کی خرید وفروخت اور ان پر نکلا ہوا انعام لینا شرعاً جائز نہیں۔(۲)

حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ نے بھی اس کو ناجائز قرار دیا ہے اور فرمایا کہ یہ بھی سود کی ایک شکل ہے، نہ اس کا کاروبار جائز ہے نہ اس سے عمرہ جائز ہے نہ صدقہ وخیرات صحیح ہے، جو رقم حاصل ہو چکی ہے اس کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کردینا چاہیے۔(۳)

بونڈس اور حکومت کو بطورِ قرض دی گئی رقم کی زکوۃ

حکومت اور کمپنی وغیرہ کو طے شدہ مدت اور معاہدہ کے تحت جو رقم بطورِ قرض دی

---

(۱) آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۷۸

(۲) فتاویٰ حقانیہ: ۶/ ۲۰۸

(۳) تفصیل کیلیے ملاحظہ ہو، آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۷۸، ۳۸۰۔ (انعام الباری: ۶/ ۱۴۴، ۱۴۶

جاتی ہے اس کو بونڈس کہا جاتا ہے اور وہ شرعی طور پر دینِ قوی کے حکم میں ہوتی ہے، اس لیے قبضہ ہونے کے بعد سنینِ ماضیہ (گذشتہ سالوں کی) کی بھی زکوۃ ادا کرنا واجب ہوا کرتی ہے۔(۱)

ریٹائرمنٹ پالیسی کا حکم

لائف انشورنس اور ریٹائرمنٹ پالیسی جس میں رقم کے عوض رقم ملتی ہے اور ساتھ میں اضافی رقم بھی ملتی ہے یہ سودی معاملہ ہے اور یہ ناجائز ہے، اس سے اجتناب کرنا لازم اور ضروری ہے، لیکن اگر غلطی سے یا جہالت یا فسق و فجور کی وجہ سے کسی نے ایسا عقد کرالیا تھا تو ادا کردہ رقم سے زائد بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے۔ پھر یہ ادا کردہ رقم میت کے انتقال کے بعد اس کے جمیع ورثاء میں شرعی طریقہ پر تقسیم کی جائے گی۔(۲)

نیشنل بینک سیونگ اسکیم

نیشنل بینک سیونگ اسکیم کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت کو ملک کے دفاع کے لیے ہتھیار وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اس خطیر رقم کو جمع کرنے کے لیے عوام سے رقم جمع کرواتی ہے، پھر ان کی رقم کے تناسب سے اس پر ان کو منافع کا لینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بلا کسی عوض کے ہے جو سود ہے جس کی حرمت کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بڑی شد و مد سے بیان کی گئی ہے۔(۳)

ایکسس بینک (Axis Bank) والی اسکیم

ایکسس بینک (Axis Bank) نے تعلیم کے فروغ کے مقصد سے ایک اسکیم جاری کی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ بچے کا والد اپنے نابالغ بچے کی طرف سے

---

(۱) ایضاح النوادر، ص: ۲۲۱

(۲) فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۶۸

(۳) محقق و مدلل جدید مسائل: ۲/ ۴۰۴، آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۳۲۴

پانچ سال تک بینک میں ایک لاکھ روپے سالانہ جمع کرے، جب پانچ سال کی مدت پوری ہو جائے تو آگے جتنی مدت تک بینک میں اس پیسے کو چھوڑے رکھے گا اس کو غیر متعینہ نفع ملتا رہے گا، جو کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی؛ البتہ اس میں نقصان کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔

اس طرح کی صورت ناجائز ہے، اس سلسلے میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

(۱) سرکاری بینک اور پرائیویٹ بینک کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے، سرکار پر عوام کا حق ہے کہ وہ ان کی ضروریات کو پوری کرے اور اگر ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ قرض اور اس پر زائد رقم کا مطالبہ کرے تو یہ اس کی طرف سے ظلم ہے، بخلاف ایکسس بینک یا کسی بھی پرائیویٹ بینک کے؛ اس لیے حاجت شدیدہ کے بغیر ان بینکوں سے قرض حاصل کرنا درست نہیں ہوگا۔

(۲) متعینہ رقم لینے کے بعد جب دیا جانے والا نفع زیادہ بھی ہو سکتا ہے تو یہ سیدھے طریقہ پر سود میں شامل ہے؛ بلکہ اس میں تفاضل بھی اور نسا بھی۔

(۳) اگر اس کو مضاربت کے دائرے میں لایا جائے تو ایک تو مضاربت میں نقصان کی ذمہ داری رب المال پر ہوتی ہے اور اس میں رب المال پر نقصان کی کوئی ذمہ داری نہیں رکھی گئی، دوسرے ہندوستان میں برٹش دور کا بینکنگ قانون چل رہا ہے جس میں بینک کو کسی بھی قسم کی تجارت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، اس کا کام ہے اپنے مقروضوں سے سود وصول کرنا اور اپنے کھاتہ داروں کو سود ادا کرنا، تو بینک جو نفع دے گا وہ بالیقین مال حرام ہی ہوگا اور بینک کا یہ فعل اس شخص کی طرف سے بھی منسوب ہوگا؛ کیوں کہ مضارب رب المال کی طرف سے وکیل کے درجہ میں ہوتا ہے اور وکیل کا تصرف مؤکل کی طرف منسوب ہوتا ہے۔(۱)

---

(۱) سہ ماہی مجلہ بحث ونظر، ص:۲۲، جنوری - جون ۲۰۱۹ء

پیکنگ کریڈٹ

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایکسپوڑ کے پاس بسا اوقات اتنی رقم موجود نہیں ہوتی، جتنی اس کو فوری ضرورت ہوتی ہے، تو وہ بینک سے مال کی تیاری کے لیے پیشگی سودی قرض لیتا ہے تو اس کو پیکنگ کریڈٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، چوں کہ اس معاملہ میں سودی قرض حاصل کیا جاتا ہے؛ لہٰذا یہ حرام ہے۔(۱)

بل پرچیز (B.P.)

بل پرچیز کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایکسپورٹر کو کبھی پیشگی رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے ارسال کردہ مال کے کاغذات بینک کے حوالہ کرکے ۷۰ ر یا ۷۵ ر فیصد تک مال کی قیمت بینک سے پیشگی وصول کر لیتا ہے اور جب امپورٹر کی طرف سے رقم آجاتی ہے تو بینک اپنے ضابطہ کے مطابق انٹرسٹ وصول کرکے بقیہ رقم ایکسپورٹر کو دے دیتا ہے، اس کو بی پی (بل پرچیز) کہتے ہیں، اور اگر خدانخواستہ امپورٹر کی طرف سے رقم آنے میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے تو اس تاخیر کا الگ سے انٹرسٹ وصول کرتا ہے اور اگر رقم پھنس جائے تو بینک نے ایکسپورٹر کو جتنی بھی رقم دے رکھی ہے، اس کو پوری کی پوری انٹرسٹ کے ساتھ وصول کر لیتا ہے، اور ایکسپورٹر نہ دے سکے تو بذریعہ عدالت انٹرسٹ کے ساتھ واپس وصول کرتا ہے، رقم کی صورت میں یا جائداد کی شکل میں، اس طرح اس بل پرچیز میں صریح سودی معاملہ ہونے کی وجہ سے شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے، اور یہ معاملہ زمانۂ جاہلیت کے سودی معاملہ کے مرادف ہے۔(۲)

بل پرچیز میں مکمل سود کا دخل ہے

بی۔پی (b-p) یعنی بل پرچیز (bill purchase) کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ایکسپورٹر کو کبھی پیشگی رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اپنے ارسال کردہ مال کے کاغذات

---

(۱) مستفاد: بینک کے مسائل، ص: ۸۴

(۲) مستفاد: بیک کے مسائل، ص: ۹۵، مفتی عامر صاحب

بینک کے حوالہ کر کے ۷۰ یا ۷۵ فیصد تک مال کی قیمت بینک سے پیشگی وصول کر لیتا ہے اور جب امپورٹر کی طرف سے رقم آجاتی ہے، تو بینک اپنے ضابطہ کے مطابق فیصد شرح سود وصول کر کے بقیہ رقم ایکسپورٹر کو دیدیتا ہے، اس میں مکمل طور پر سود کا دخل ہے، لہٰذا شرعاً ناجائز اور حرام ہوگا، اور جواز کے دائرے میں کسی بھی صورت میں داخل نہیں ہوسکتا۔(۱)

بیعانہ (Advanced) کی رقم ضبط کرنا

اگر کوئی شخص کسی کا کوئی مکان یا زمین خریدے، پھر خریدار قیمت کا ایک حصہ مثلاً ۲۵ ہزار روپے میں سے چار ہزار روپے بطورِ بیعانہ (Advanced) دیدے، اور بقیہ قیمت فراہم کرنے کے لیے چھ ماہ کا موقع مانگے، اور طرفین کی رضامندی سے یہ بات طے پائے کہ اگر چھ ماہ گزر جانے پر خریدار بقیہ قیمت ادا کر کے مکان یا زمین کا بیع نامہ نہیں کراتا، تو جو چار ہزار روپے بطورِ بیعانہ کے دیئے گیے وہ ضبط ہوجائیں گے، بیع کی اس صورت میں چھ ماہ کا موقع گزر جانے اور خریدار کے بقیہ قیمت فراہم کر کے بیع نامہ کرالینے میں نامراد ہوجانے پر بائع (بیچنے والا شخص) پر بیعانہ کی رقم کا واپس کرنا واجب ہے اور بیعانہ کے ضبط ہوجانے کا جو معاہدہ کیا گیا تھا وہ خلافِ شرع ہونے کی وجہ سے اس کی پابندی لازم نہیں ہے، بلکہ اس معاہدہ کو توڑنا ضروری ہے۔(۲)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے فکس ڈپازٹ میں رقم جمع کروانا

انکم ٹیکس کی بچت کی غرض سے فکس ڈپازٹ میں رقم جمع کروانا جائز ہوگا، لیکن نیت صرف جمع کروانے کی ہو نہ کہ سود حاصل کرنے کی، ہاں مگر جو سود ملے اسے چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ لیکر فقراء میں تقسیم کردے، یا انکم ٹیکس، کسٹم ٹیکس وغیرہ میں بھی دے سکتا ہے۔(۳)

---

(۱) محقق ومدلل جدید مسائل: ۱/ ۳۶۲

(۲) اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۵/ ۲۲۲، فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۱۴/ ۴۰۷

(۳) محقق ومدلل جدید مسائل: ۱/ ۳۶۵

ہاؤس فائنانسنگ کا شرعی حکم

بڑے بڑے ملکوں اور شہروں میں سودی کمپنیاں لوگوں کو مکان بنانے کے لیے جو قرض دیتی ہیں اس کو ہاؤس فائنانسنگ کہا جاتا ہے، چونکہ یہ تمام معاملات میں سود کا پورا دخل ہوتا ہے، اس لیے شرعی اعتبار سے ایسا معاملہ جائز نہیں بلکہ حرام ہوگا۔(۱)

ڈیبٹ کارڈ اور کریڈٹ پر ملنے والی پوائنٹس کا شرعی حکم

ڈیبٹ کارڈ کے استعمال کرنے سے بینک کی طرف سے کیش بیک (Cashback) ملتا ہے، اس کے چند صورتوں کا شرعی حکم سوال وجواب کے طریقہ پر درج ذیل ہے:

الف: مخصوص بینک کے ڈیبٹ کارڈ کو مخصوص کمپنی کی خریداری میں استعمال کرنے، مثلاً: ایکسیز بینک کے کارڈ کو فلپ کارڈ کی کمپنی میں استعمال کرنے سے بینک بطور انعام کے چند پوائنٹ کھاتے میں جمع کرتا ہے، جب اس کی متعینہ مقدار پوری ہوجاتی ہے تو کیش بیک ملتا ہے۔

ب: اگر دوسری کمپنی میں استعمال کریں تو پوائنٹس کم ملتے ہیں یا کچھ بھی نہیں ملتا؟

جواب: ڈیبٹ کارڈ کے ذریعہ کسی مخصوص کمپنی سے سامان خریدنے کی صورت میں جو پوائنٹس حاصل ہوتے ہیں اس کی کل چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱) اگر ڈیبٹ کارڈ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں یہ پوائنٹس بینک کی طرف سے ملتے ہوں، جیسا کہ سوال سے واضح ہے تو اس صورت میں اس رعایت کا حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ یہ رعایت (پوائنٹس) بینک کی طرف سے صارف یعنی کارڈ ہولڈر کو اپنے اکاؤنٹ کی وجہ سے مل رہی ہے جو شرعاً قرض کے حکم میں ہے اور جو فائدہ قرض کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے وہ سود کے زمرے میں داخل ہوکر ناجائز ہوتا ہے:

”(كل قرض جر منفعة) إلى المقرض (فهو ربا) أي في حكم

---

(۱) حوالہ سابق ص: ۳۷۷

الربا فیکون عقد القرض باطلا، فإذا شرط فی عقده مایجلب ـــ الخ"(۱)

۲) اگر ڈیبٹ کارڈ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں یہ پوائنٹس اس کمپنی کی جانب سے ہو، جہاں سے سامان خریدا گیا ہے تو یہ اس کمپنی کی طرف تبرع واحسان ہونے کی وجہ سے جائز ہوگا؛ کیوں کہ یہ رعایت مستقرض (بینک) کی طرف سے مقرض (صارف) یعنی کارڈ ہولڈر کے علاوہ ایک تیسرے شخص کی طرف سے صارف (کارڈ ہولڈر) کو نفع پہنچایا جارہا ہے جو سود میں داخل نہیں ہے۔(۲)

۳) اگر ڈیبٹ کارڈ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں یہ پوائنٹس دونوں طرف سے ہوں یعنی بائع (Veader) اور بینک کی طرف سے تو جو پوائنٹس بائع کی طرف سے ہوں ان کا لینا تو درست ہے؛ البتہ جو بینک کی طرف سے حاصل ہوں انہیں لینا جائز نہیں۔

۴) اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ رعایت (پوائنٹس) کس کی طرف سے ہے، یعنی بینک کی طرف سے ہے یا کسی تیسرے شخص یا ادارہ کی طرف سے تو ایسی صورت میں اجتناب کرنا بہتر ہوگا۔

نوٹ: بائع (Vender) سے یہ بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے، آیا یہ رعابت (پوائنٹس) مکمل بائع کی طرف سے ہے، یا بینک کی طرف سے، یا دونوں کے اشتراک سے ہے۔

کریڈٹ کارڈ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ کریڈٹ کارڈ کا خریدنا اور اس کا استعمال کرنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررمدت کے اندر ادا کردی جائے؛ تاکہ ان پر سود لاگو نہ ہوسکے؛ کیوں کہ تاخیر کی صورت میں اس پر بھی

---

(۱) شرح المجلة:۱/ ۴۴۲

(۲) بحوالہ پندرہواں فقہی اجتماع ادارہ مباحث الفقہیہ، تجاویز:۸/ ۱

سود ادا کرنا پڑتا ہے جو کہ حرام ہے۔

لہٰذا کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں اگر یہ پوائنٹس بائع کی طرف سے ملے تو اس کا لینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ بینک اور صارف کے علاوہ ایک تیسرے شخص (بائع/تجارتی کمپنی وغیرہ) کی طرف سے نفع پہنچایا جارہا ہے، جو کہ جائز ہے۔

اسی طرح اگر کریڈٹ کارڈ کے استعمال کے وقت پوائنٹس بینک کی طرف سے دیا جائے تو بھی اس کے لینے کی گنجائش ہے، جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں یہ بینک کی طرف صارف کو ایک سہولت دی جارہی ہے جس میں سود کا پہلو نہیں ہے، سود اس لیے نہیں ہے کہ یہ مقروض (بینک) کی طرف سے مستقرض (صارف) کو نفع پہنچایا جارہا ہے جو سود میں داخل نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ سود وہ مشروط نفع ہوتا ہے جو مستقرض کی طرف سے مقروض کو پہنچایا جائے۔

خلاصہ یہ کہ کریڈٹ کارڈ کے استعمال کے وقت پوائنٹس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، چاہے یہ پوائنٹس بائع (Vender) کی جانب سے ہو یا بینک کی طرف سے:

"وعلى هذا فإن مصدر البطاقة لا يعد وتجاه حامل البطاقة من أن يكون محتالا عليه أولا ... الخ"(۱)

اخباری معمے

آج کل بعض اخباروں اور پرچوں میں معمے آتے ہیں، جن کو بھر کر بھیجنے کے بعد صحیح نکل آنے پر بڑے بڑے انعام دیئے جاتے ہیں، ان معموں کو بھرنے کے لیے صرف فیس بھیجنی ہوتی ہے، اس طرح کے معموں کو حل کرنا اور اس پر ملنے والے انعام کا لینا شرعاً درست نہیں، کیونکہ یہ جوا اور سود پر مشتمل ہے اور یہ دونوں چیزیں شرعاً حرام ہیں۔(۲)

---

(۱) بحوث في قضايا فقهية معاصرة: ۲/ ۱۶۳، دارالافتاء برائے تجارتی ومالیاتی امور بنگلور، فتوی نمبر: ۰۲/ ۱۰۰۰

(۲) اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: ۱/ ۱۰۹

ڈپازٹ سرٹیفکٹ خرید کر اس پر نفع حاصل کرنا

کسی شخص نے بینک سے ڈپازٹ سرٹیفکٹ خریدا، جس کی قیمت دس ہزار روپیے ہے، اب وہ رقم بینک میں رہے گی اور چند سالوں کے بعد اس رقم پر اس شخص کو نفع بھی دیا جائے گا، یہ صورت درست نہیں ہے کیونکہ بینک سے ڈپازٹ سرٹیفکٹ خرید کر، اس پر نفع حاصل کرنا بہر حال سود ہے، اور سود شریعت اسلامیہ میں ناجائز وحرام ہے۔(۱)

قرض کے بدلے قرض کی بیع

دین کو دین کے بدلے غیر مقروض کے ہاتھ فروخت کرنے کا نام "بیع الکالی بالکالی" ہے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کرام کے مذہب کے مطابق یہ بیع ناجائز ہے، مثلاً زید کو بکر سے ایک من چاول ایک ماہ بعد لینا ہے، اب زید عمر سے کہے کہ مجھے بکر سے جو چاول ایک ماہ بعد لینا ہے، میں تمہیں وہ چاول ایک ہزار کے بدلے فروخت کرتا ہوں، اور تم یہ رقم مجھے دو ماہ بعد دیدینا، بیع کی اس صورت میں مبیع اور ثمن دونوں ادھار ہیں، اسے بیع الکالی بالکالی کہا جاتا ہے جو شرعاً جائز نہیں۔(۲)

حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنا

بہت سے لوگ اندرونِ ملک ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں خفیہ طور پر مالی وتجارتی سامان لے جاتے ہیں، بسا اوقات حکومت کے کارندے ان کو پکڑ کر سامان ضبط کر کے نیلام کر دیتے ہیں، جب کہ شرعی نقطۂ نظر سے یہ مال وتجارتی سامان اصل مالک کی ملک سے نہیں نکلتا، کیونکہ معروف حق کے ثابت ہوئے بغیر حکومت کے لیے رعایا کے اموال ضبط کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا ایسا مال وتجارتی سامان اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے اور اس ضبط شدہ مال کی خرید وفروخت جائز نہیں۔(۳)

---

(۱) محقق ومدلل جدید مسائل: ۳۲۶/۲

(۲) محقق ومدلل جدید مسائل: ۳۲۶/۲

(۳) مستفاد: فتاوی حقانیہ: ۶/ ۱۷

شرط پر قرض

قرض دینے والے کا قرض دیتے وقت شرط لگانا، مثلاً یوں کہنا کہ تو میری فلاں چیز خریدے گا تو میں تجھ کو قرض دوں گا، یہ سودخوروں کا سودی حیلہ ہے، جو آپ ﷺ کے فرمان ”لا یحل سلف و بیع“ (بیع کی شرط کے ساتھ قرض دینا جائز نہیں) کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز وحرام ہے۔(۱)

مال حرام کی زکوۃ

(۱) مالِ حرام کسی کی ملکیت میں آئے اور وہ بعینہٖ موجود ہو، نیز مال کا اصل مالک معلوم ہو تو اس شخص کو وہ پورا مال لوٹا دینا واجب ہے۔

(۲) اگر مال حرام متعین طور پر معلوم نہ ہو سکے یا اس کی تعداد معلوم نہ ہو سکے تو غالب گمان کے مطابق مالِ حرام کی مقدار متعین کی جائے گی، اگر مالک مال معلوم ہو تو اتنی مقدار میں رقم اس کے مالک کو واپس کر دی جائے، اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو اسی مقدار میں بلانیت ثواب صدقہ کر دیا جائے۔

(۳) اگر مالِ حرام کی واپسی اس پر واجب ہوئی اور اس نے واپس نہیں کیا اور مالِ حرام اس کے قبضہ میں باقی رہ گیا اور مال کا کوئی انسان مطالبہ کرنے والا نہیں ہے، ایسی صورت میں اس مال کی زکوۃ ادا کرنی بھی واجب ہوگی اور زکوۃ ادا کرنے کے باوجود مقدار کو حقدار کو لوٹانے یا حق دار کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں بلانیت ثواب صدقہ کرنے کا حکم باقی رہے گا۔

مالِ حرام میں اصل یہی ہے کہ اگر ایسے مال کا طلب کرنے والا مالک موجود ہو تو اس کو واپس کر دیا جائے ورنہ صدقہ کر دیا جائے اور اگر حرام وحلال مال مخلوط ہو تو تحری ورجحان قلب کے مطابق مال حلال کی مقدار متعین کر کے اس کی زکوۃ ادا کی جائے، مالِ حرام میں زکوۃ واجب نہ ہوگی، مگر استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ پورے کے پورے مال کی

---

(۱) محقق ومدلل جدید مسائل: ۴۰۱/۲

زکوۃ ادا کردی جائے تا کہ یقینی اور اطمینان بخش طریقے پر زکوۃ ادا کرنے والا فریضہ زکوۃ سے بری الذمہ ہوجائے، اور ظالمانہ اور حرام طریقوں سے لوگوں کے مال سے فائدہ اٹھانے والوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو، نیز ایسا نہ ہو کہ مال حرام کھانے والا دوطرفہ فائدہ اٹھائے، اس طرح ایک طرف مال حرام سے انتفاع کرکے اور زکوۃ سے بھی بچ جائے۔(۱)

اور فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں لکھا ہے کہ اگر اس قدر رقم کو فوراً لیکر صدقہ کردے تو اس پر زکوۃ نہیں ہے اور اگر لے کر سال بھر تک اپنی ملک میں رکھے بشرطیکہ وہ بقدرِ نصاب ہو تو زکوۃ واجب ہوگی خواہ کسی رقم میں سے دے غرض یہ کہ قبل وصول زکوۃ اس کی واجب نہ ہوگی۔(۲)

---

(۱) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۶۷-۶۸

(۲) فتاویٰ دار العلوم دیوبند ۹۶/۴ ۱۴

خلاصۂ کتاب

کسی مالی معاوضہ کے بغیر حاصل ہونے والی زیادتی کو ربا کہتے ہیں، اردو میں سود، ہندی میں بیاج بٹا، سنسکرت میں مول بیاج انگریزی میں Intrest کہتے ہیں۔

۱) تقریباً بارہ قرآنی آیتوں میں سودی کام پر تنبیہ، لعنت، اس کی حرمت، جہنم کا مژدہ اور جنگ کا اعلان بتلایا گیا ہے۔

۲) تقریباً پندرہ احادیث مبارکہ میں سودی جرم کی سنگینی، سبب ناراضگی اور اس کا انجام بتلا کر اس سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

۳) سود شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علاوہ شریعت موسوی، شریعت عیسوی، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور عقلا کی نظر میں بھی حرام قطعی، منحوس قابل مذمت عمل ہے۔

۴) شریعت (قرآن وحدیث) نے سود کے نقصانات اور خرابیوں کا تذکرہ فرما کر اس کی نفرت دلوں میں بٹھا کر پھر اس کو بتدریج حرام قرار دیا ہے۔

۵) سود کے حرام ہونے کی وجہ مالکِ حقیقی کی ناراضگی اور اس کا منع کرنا ہی ہے، ایک عاشق اور غلام کے لئے اپنے معشوق اور آقا کے حکموں کی علتیں تلاش کرنا زیبا نہیں دیتا، بلا چوں وچرا حکم کی تعمیل ہی عبدیت اور غلامیت کا تقاضا ہے۔

۶) سود کو حلال سمجھنے والا باغی اور مرتد واجب القتل ہے تا آں کہ توبہ نہ کرلے۔

۷) سود خور سودی کاروبار کے ذریعہ خواہ کتنی ہی دولت پیدا کرلے وہ دولت کے حقیقی لطف ثمرہ سے ہمیشہ محروم رہتا ہے، وہ دولت مند ہونے کے باوجود مفلس اور تہی

دست ہی رہتا ہے۔

۸) حرام مال سے کیا ہوا صدقہ قبول نہیں ہوتا، نہ اس کی دعا چالیس دن تک قبول ہوتی ہے۔

۹) حرام کمائی میں برکت نہیں ہوتی، حرام کو کمانے کا بھی گناہ ہوگا، اور وارثوں کو حرام کھلانے کا بھی۔

۱۰) قرآن وحدیث میں جن گناہوں کی سخت مذمت کی گئی ہے، غالباً کفر کے بعد سود ان میں سرفہرست ہے۔

۱۱) جس چیز کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے، شراب، پیشاب، سود جس طرح پینا اور کھانا حرام ہے اسی طرح اس کا کھلانا اور پلانا بھی حرام ہے۔

۱۲) سود دینے سے بھی سود لینے والے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، اس لئے سود دینے کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔

۱۳) سودی کاروبار کو لکھنے والا، سودی معاملہ پر گواہ بننے والا بھی سود کھانے والے کی طرح نفس گناہ اور لعنت میں برابر ہے؛ البتہ مقدار گناہ ولعنت میں تفاوت ہے۔

۱۴) شراب کو Bear, Brandy, Whisky,Coke وغیرہ نام دے دیں، تو شراب کی حقیقت نہیں بدلتی، وہ شراب بہر حال شراب رہتا ہے، اسی طرح دنیا والے سود کو Intrest,Finance • Fixdiposit , اسکیم انعام جو بھی دے دیں وہ بدستور سود ہی رہے گا۔

۱۵) سود میں حیلہ کرنے سے وہ حرام حلال نہیں ہوتا۔

۱۶) جو نفع، سہولت آسانی قرض کے دباؤ سے حاصل ہو وہ بھی سود اور ناجائز ہے۔

۱۷) حرام مال سے باطن کا جو نقصان ہو کر ظلمت پیدا ہوتی ہے اہل بصیرت (اللہ والے) اس کو خوب جانتے ہیں، ان کو اس کا پتہ چل جاتا ہے اور ان کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے حتی کہ کبھی قے بھی ہو جاتی ہے۔

۱۸) قرآن پاک نے کسی چیز کی بھی فقہی، قانونی یا فنی انداز کی تعریف نہیں کی، قرآن پاک نے بار بار اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا؛ لیکن کہیں بھی صلوٰۃ کی تعریف بیان نہیں کی، زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی؛ لیکن کہیں بھی زکوٰۃ کی فقہی تعریف نہیں کی، زنا کو جرم قبیح قرار دیا؛ لیکن کہیں بھی زنا کی قانونی تعریف نہیں کی، لیکن ان سب چیزوں کا ایک طۓ شدہ متعین مفہوم ہے، جو زمانہ اور علاقہ کے بدلنے سے نہیں بدلتا، اسی طرح ربا کی بھی قرآن پاک نے فقہی فنی یا قانونی انداز کی تعریف نہیں کی ہے؛ لیکن اس کا ایک متعین مفہوم ہے جو زمانہ اور علاقہ کے بدلنے سے نہیں بدلتا۔

۱۹) قرآن پاک میں "أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" کی قید احترازی نہیں ہے، اتفاقی ہے، قرآن پاک میں "لَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" فرمایا گیا ہے، اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ فقر وفاقہ کے خوف سے اولاد کو قتل نہ کرو، کسی اور وجہ سے قتل کر سکتے ہو —— حدیث میں أَنْ تَزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ، فرمایا گیا ہے (کہ تم اپنی پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو، یہ بھی کبیرہ گناہ ہے) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ محلہ کی کسی شخص کی بیوی سے بدکاری کبیرہ گناہ نہیں ہے، اگر ہم بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا! مسجد میں چوری نہیں کرتے، یا بڑی بہن کو نہیں مارتے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسجد سے باہر چوری کر سکتے ہیں، اور دوسری بہنوں کو مار سکتے ہیں، یہ ایک اسلوب ہے جس سے ایک خاص پہلو کی شناعت کی طرف توجہ مقصود ہوتی ہے، اسی طرح "أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً" کا ذکر بھی ایک پہلو کی شناعت کی طرف توجہ کے لئے ہے، قید احترازی نہیں ہے۔

۲۰) مکان جائیداد وغیرا استعمالی اشیاء ہیں، جن میں ربا نہیں ہوتا، اس کے برعکس سونا چاندی روپیہ، گندم، نمک وغیرہ، استہلاکی اشیاء ہیں، جن کو خرچ کئے بغیر ان سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا، لہٰذا ان میں ربا ہوتا ہے، لہٰذا کرایہ مکانات ایک معاوضہ

ہے، اس محنت کا جو ایک شخص مکان سے اٹھاتا ہے، پھر مکان جوں کا توں اس کو واپس کر دیتا ہے، برخلاف سود کے جو کسی محنت، مال، خطرہ کے بغیر محض وقت اور مہلت کے مقابلہ میں کسی مشروط اضافہ کا مطالبہ ہے۔

۲۱) ذاتی اور صرفی مقاصد کے لئے لیا جانے والا سود اور تجارتی اغراض کے لئے حاصل کئے جانے والے قرضوں پر سود دونوں حرام ہیں، دونوں میں ظلم ہے، دونوں قسم کے سود عرب میں رائج تھے، یہی قرآن، حدیث، سیرت اور تاریخ سے معلوم ہوا، لہٰذا تجارتی قرضوں پر سود سے عرب ناموس تھے کہنا، یہ ایک بے دلیل بات ہے، تجارتی قرضوں پر سود میں ظلم واستحصال نہیں ہے کہنا، یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

۲۲) بیع اور ربا میں فرق یہ ہے کہ بیع میں لیا جانے والا روپیہ کسی مال کا معاوضہ ہوتا ہے؛ لیکن ربا میں سود خور جو زائد وصول کرتا ہے وہ کسی مال کا معاوضہ نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ وقت اور مہلت کا بدلہ ہوتا ہے، جو کہ بغیر محنت بغیر خطرہ اور رسک کے حاصل ہونے والا نفع ہوتا ہے۔

۲۳) ربا اور شرکت میں فرق یہ ہے کہ شرکت میں سرمایہ لگانے والا نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے جب کہ سود خور صرف اپنے نفع سے دلچسپی رکھتا ہے، شرکت کرنے والا دوسروں کی مشکلات میں کام آتا ہے، جب کہ سود خور مشکلات سے فائدہ اٹھاتا ہے، شرکت کرنے والا معاشرہ کے پیداواری عمل میں خود براہ راست شریک ہوتا ہے جب کہ سود خور سرمایہ کی سرکولیشن روک کر صرف سود وصول کرنے سے دلچسپی رکھتا ہے، شرکت کرنے والے کو وقت کی کمی بیشی کی بنیاد پر کوئی مفاد یا نفع نہیں ملتا، لیکن سود کا سارا دار ومدار وقت اور مہلت کی کمی بیشی پر ہے۔

۲۴) ربا اور اجرت میں فرق یہ ہے کہ سود زیادتی اور اضافہ کو کہتے ہیں، اور اُجرت

خدمت کے مقابلہ میں عوض کو کہتے ہیں، اجرت استعمالی اشیاء سے فائدہ اٹھانے کا بدلہ ہوتا ہے، اور ربا استہلالی اشیاء سے فائدہ اٹھانے کے بدلہ ہوتا ہے، جن کو خرچ کئے بغیر مستفید نہیں ہو سکتے۔

۲۵) ربا اور مضاربت میں فرق یہ ہے کہ مضارت میں فریقین نفع ونقصان دونوں میں ہوتے ہیں، جب کہ سودی معاملہ میں مال والے کو نفع کی متعین مقدار کی یقینی ضمانت وگارنٹی ہوتی ہے، گرچہ اس نے اپنی کچھ بھی محنت صرف نہ کی ہو اور نہ رِسک Risk لیا ہو۔

۲۶) قانوناً سودخوری کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب فرانس کا انقلاب آیا، اس کے بعد سے ہی سود کی قانونی جواز حاصل ہو گیا، اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب ہر ایک شخص سود کا کاروبار کر سکتا ہے، قانونی طور پر بھی ایسے آدمی کی مدد کی جائے گی، تب سے اب تک دنیا کے ہر کونے میں سود نے اپنے پیر جما لئے، اب عالم یہ ہے کہ سود کے بغیر لین دین کا کوئی بھی معاملہ ناقص اور ناتمام سمجھا جاتا ہے۔

۲۷) سودخوری کے اخلاقی نقصانات میں سے بے رحمی، سنگ دلی، خودغرضی، قطع تعلقی، کنجوسی، عداوت دنیا کی حرص، غریبوں کی غربت کا ناجائز فائدہ اٹھانا اور ان کا خون چوسنا، بے ایمانی کذب بیان وغیرہ ہیں۔

۲۸) سود کے معاشی نقصانات میں سے یہ ہے کہ فقیر فقیر ہی رہتا ہے مالدار مالدار ہی رہتا ہے، فقیر کبھی مالدار نہیں بنتا، سودخوروں میں عیاشیت، سستی کاہلی، کام اور محنت سے فرار آجاتا ہے، صنعت اور زراعت سے بے توجہی پیدا ہوتی ہے، دولت کی آزادانہ گردش ختم ہو جاتی ہے، سودی جال میں پھنسنے والے نکل نہیں پاتے ہیں، بلکہ دادا کا لیا قرض پوتوں تک وراثت میں منتقل ہوتا چلا جاتا ہے، سود سے بظاہر چند لوگوں کا نفع محسوس ہوتا ہے، اکثروں کا نقصان ہوتا ہے۔

(۲۹) بینک اٹلی زبان کے لفظ Banco سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ٹیبل کے ہیں، اصطلاح میں، ایسے ادارہ کو کہتے ہیں، جو لوگوں کی رقمیں جمع کر کے تاجروں، صنعتکاروں اور دیگر ضرورت مند افراد کو قرض فراہم کرتا ہے، دنیا کا پہلا بینک شہر وینس میں ۱۱۵۷ء کو Banacodella pizaadi Riaalro کے نام سے وجود میں آیا، پھر ۱۴۰۱ء میں شہر بارسلون میں اس کے بعد پوری دنیا میں سلسلہ رائج ہو گیا۔

(۳۰) بینک میں رقم رکھانے کو ڈپازٹ کہتے ہیں، اس کی چار قسمیں ہیں۔(۱) کرنٹ اکاؤنٹ: اس میں رکھی رقم پر سود نہیں ملتا، رکھی رقم کو کسی بھی وقت جتنی مقدار میں چاہیں، بغیر کسی پابندی کے نکالی جا سکتی ہے، ضرورت کے موقع پر اس میں رقم رکھوا سکتے ہیں (۲) بچت کھاتہ: اس میں رقم نکلوانے پر عموماً مختلف پابندیاں ہوتی ہیں، قواعد اور ضوابط کے تحت ہی رقم نکلوانے کا اختیار ہوگا، اس پر بینک سود دیتا ہے، اس میں رقم رکھوانے کی اکثر علماء نے ضرورت کے موقع پر گنجائش دی ہے، تاہم اس سے بچنا زیادہ بہتر ہے، لیکن اس پر زائد جو سود ملتا ہے، اس کو نکال کر بغیر ثواب کی نیت سے صدقہ کر دیں (۳) فکسڈ ڈپازٹ: اس میں لمبی مدت کے لئے رقم رکھوائی جاتی ہے، مقررہ مدت سے پہلے رقم واپس کرنے کی عام اجازت نہیں ہوتی ہے، اس میں بھی بینک زیادہ مقدار میں سود دیتا ہے، اس میں رقم رکھوانا جائز نہیں ہے۔(۴) لاکرز: بینک کے اندر کسی مخصوص تجوری کو کرایہ پر لیتا ہے اور اس تجوری میں وہ خود اپنی رقم رکھتا ہے یا سونا چاندی وغیرہ جس کا علم بینک کے ملازمین کو بھی نہیں ہوتا ہے، اور اس کا کرایہ دیا جاتا ہے، اس کو استعمال کرنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(۳۱) تمویل کے اعتبار سے بینک کی مختلف قسمیں ہیں: مثلاً زرعی بینک Agricultural Bank صنعتی بینک Industrail Bank ترقیاتی

بینک، کمرشیل بینک، ریزور بینک وغیرہ، (تفصیلات بینک اور اس کے متعلقات والے باب میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

(۳۲) سود حاصل کرنے کے لئے بینک میں رقم جمع کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

(۳۳) محض حفاظت یا کسی مصلحت کی خاطر مسجد، مدرسہ، مسلم فنڈ اور رفاہی اداروں کا اکاؤنٹ کھولنا اور اس میں رقم جمع کرنا جائز ہے؛ البتہ فکسڈ ڈپازٹ میں نہ رکھائیں، کہ وہاں سود کا حصول ہی مقصود ہوتا ہے۔

(۳۴) سودی رقم حرام ہے، اس کو اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے، اور شریعت نے اضاعت مال (اس رقم کو جلا دینے یا سمندر میں ڈالنے) سے بھی منع فرمایا ہے، اور اگر بینک ہی میں اس سودی رقم کو چھوڑ دیا جائے تو اکابر کے فتاویٰ اور ان کی تحریروں سے یہ تحقیق سامنے آئی ہے کہ وہ روپیہ پادریوں کو دے دیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو مرتد (عیسائی) بنانے ہماری مضرتوں اور دین محمدی کی بیخ کنی کے لئے استعمال کرتے ہیں؛ لہٰذا اس رقم کو اپنے ذمہ سے ساقط کرنے کی نیت سے نکال کر مستحق تک بغیر ثواب کی نیت سے پہنچادے یہی ہمارے اکابر کا فتویٰ ہے۔

(۳۵) سود سود ہے، چاہے وہ غیر مسلم کے بینک سے لیا جائے یا مسلم بینک سے لیا جائے، دونوں حرام ہے؛ البتہ مسلم حکومتوں کے بینکوں سے اگر سودی رقم دی جارہی ہے تو اس کو اسی بینک میں چھوڑ دے۔

(۳۶) بینک کے ذریعہ ڈرافٹ کی شکل میں رقم ارسال کرنا، بینک کو قرض دینا ہے، ابتلائے عام کی وجہ سے اس میں جواب کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

(۳۷) یونٹ ٹرسٹ حکومت ہند کی جانب سے (عوام کے فائدہ کے لئے) منظور شدہ ادارہ ہے۔ عوام سے ان کا سرمایہ لے کر مختلف قسم کے کاروبار میں لگا کر ہر سال فیصدی نفع تقسیم کیا جاتا ہے، مفتی نظام الدین صاحب علیہ الرحمہ نے اس میں سرمایہ لگانے اور باقاعدہ ایجنسی لینے کی بھی گنجائش دی ہے؛ البتہ مفتی شبیر احمد صاحب

قاسمی دامت برکاتہم کی تحقیق کے اعتبار سے اس میں مضاربت کے شرائط نہ پائے جانے کی بنا پر اس کو ناجائز کہتے ہیں۔

(۴۸) بینک ایک سودی کاروبار ہے؛ اس لئے اگر پہلے سے مقصد معلوم ہو تو خالص اس مقصد کے لئے مکان کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا کہ یہ معصیت میں ایک طرح کا تعاون ہے: وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ یہی مسلک (حرام ہونے کا) صاحبینؒ اور ائمہ ثلاثہؒ کا ہے، مفتی رشید احمد صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ اور مفتی شعیب اللہ خاں صاحب مفتاحی نے بھی اس کو حرام لکھا ہے؛ البتہ مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی، مفتی سلمان منصور پوری صاحب نے مکروہ تنزیہی (بکراہت جائز) قرار دیا ہے، اور اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ سودی کاروبار فاعل مختار کا عمل ہے، جس میں مالکِ مکان (کرایہ پر دینے والے) کا کوئی دخل نہیں ہے؛ لہٰذا مالک مکان کے حق میں یہ حرام نہ ہوگا، اجرت بھی جائز اور حلال ہوگی، مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ چوں کہ بینک کے سرمایہ کی اکثریت دحرام نہیں؛ لہٰذا اس کے لئے بیچنے کی گنجائش تو معلوم ہوتی ہے؛ لیکن کراہت تنزیہی سے بھی خالی نہیں۔

نوٹ: بعض فقہی کتابوں میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ آپ نے حرام کاموں کے لئے مکان کرایہ پر دینا جائز قرار دیا ہے، لیکن مفتی شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم نے مکمل نظائر اور دلائل کے ساتھ اس بات کو واضح کیا ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے اس قول میں جواز سے مراد حلال ومباح ہونا نہیں ہے؛ بلکہ منعقد ہونا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس کام سے گناہ بھی ہوگا، پھر یہ جواز بھی چار شرائط کے ساتھ مشروط ہے، جو شرائط ہندوستان جیسے ملک میں نہیں پائے جاتے؛ لہٰذا امام اعظم علیہ الرحمہ کے قول کے اعتبار سے بھی حرام کام کے لئے مکان کرایہ پر دینا ناجائز ہوگا۔

۳۹) بینک کے سارے کام غلط، نا جائز اور حرام نہیں ہیں؛ بلکہ بعض جائز خدمات بھی بینک سے جاری ہوتے ہیں، مثلاً قرض وصول کرنا، روپیہ ایک ملک سے دوسرے ملک ٹرانسفر کرنا، دوسرے ملک کی کرنسی لے کر مطلوبہ کرنسی ادا کرنا، امانتیں رکھنا وغیرہ۔

۴۰) بینک کے ذریعہ کاروبار کی متعدد مختلف صورتیں ہوتی ہیں، اور اس کے احکام بھی مختلف ہیں، مثلاً مالک مال ازخود بینک کا واسطہ اختیار کرتا، یا خود بینک سے خریداری کرتا ہے، یا بینک خود پیش کش کرتا ہے وغیرہ، (تفصیلات کے لئے بینک کے ذریعہ تجارت، عنوان دیکھئے)۔

۴۱) اے ٹی ایم (ATM) کے ذریعہ قرض کی ادائیگی کرنا درست ہے، بشرطیکہ قرض کی رقم کے ساتھ بینک کا سروس چارج (اگر لگتا ہو تو) قرض خواہ کے اکاؤنٹ میں ڈال دے۔

۴۲) ایس بی آئی (SBI) جو اپنے صارفین کو اسکیم دیتی ہے کہ وہ اس کے ڈیبٹ کارڈ سے جو کچھ خرید کرے گا اس کا پانچ فیصد بینک اس کو واپس کرے گا، تو یہ واپسی والی رقم جائز اور حلال ہوگی۔

۴۳) کریڈٹ کارڈ کی مروجہ صورت چوں کہ سودی معاملہ پر مشتمل ہے؛ لہٰذا اس کا استعمال ناجائز وحرام ہے، یہی فقہ اکیڈمی کا فیصلہ ہے؛ البتہ دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ چند شرائط کے ساتھ جواز کا ہے۔

۴۴) ملک ہندوستان پر دارالاسلام کی تعریف تو صادق نہیں آتی ہے، اس لئے یہ دارالحرب ہے، بمعنیٰ دارالکفر؛ لیکن چوں کہ یہاں مسلمانوں کے لئے مذہبی آزادی ہے، وہی شہری حقوق ہیں، جو غیر مسلموں کے لئے ہیں، اس لئے حکیم الامت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے دارالحرب (بمعنیٰ دارالکفر) کی دو قسمیں کی ہیں، (۱) دارالخوف جہاں مسلمان خوفزدہ ہوں (۲) دارالامن جہاں مذہبی

آزادی ہو، اس لحاظ سے ہندوستان دارالامن ہے؛ لہٰذا یہاں پر بعض احکام وہی جاری ہوں گے جو دارالاسلام کے ہیں۔

۴۵) فقہ کی بعض عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالاسلام کا باشندہ جب دارالحرب امان (Visa) لے کر آئے، تو وہ دارالحرب کے باشندوں سے سودی معاملہ کر سکتا ہے؛ لیکن ہندوستان جیسے ملکوں پر یا اس میں مقیم رہنے والے افراد پر یہ فقہی عبارات صادق نہیں آتی ہیں؛ کیوں کہ (۱) ہندوستان جیسے ملکوں پر دارالحرب کی مکمل تعریف صادق نہیں آتی ہے (۲) فقہی عبارات کی بنیاد ایک حدیث مرسل پر ہے جس کا غریب اور بے سند ہونا ثابت ہو چکا ہے (۳) قوتِ دلائل کثرتِ دلائل عدم جواز کے ہیں (۴) جمہور کا مذہب یہی ہے۔

نوٹ: اگر اس حدیث کی سند کو اصل مان کر فقہی عبارت کو مضبوط بھی کر لیا جائے تب بھی یہ جواز صرف مسلم ممالک کے باشندوں کے حق میں ہے جو ہندوستان جیسے ملکوں میں Visa لے کر آئے مثلاً سعودی عرب کا باشندہ جب ہندوستان Visa لے کر آئے؛ لیکن یہ بات کہیں سے کسی بھی حدیث یا فقہی عبارت سے ثابت نہیں ہے کہ دارالحرب میں رہنے والے مقیم مسلمان باشندے دارالحرب کے باشندوں سے سودی معاملہ کر سکتے ہیں، لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کو گنجائش نہیں ہے کہ اپنے کسی ہندو بھائی سے سودی معاملہ کرے۔

۴۶) سودی کاروبار کرنے والے شخص سے کوئی مکان کرایہ پر لینا اور اس میں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس مالکِ مکان کی سودخوری کا اس کرایہ کے مکان پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

۴۷) جس مکان کی تعمیر حرام مال سے ہوئی ہو اس کو خریدنا جائز نہیں ہے۔

۴۸) بینک ملازم اگر آپ سے کرایہ کا مکان لینا چاہے تو اس کو کرایہ پر مکان دینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ گناہ سے نفرت ہے گنہگار سے نہیں، نیز وہ بینک

ملازم اس مکان میں تو کوئی حرام کام نہیں کر رہا ہے۔

۴۹) بینک کے لئے سافٹ وئیر (Software) بنانے کی گنجائش (بقول حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم) ہونی چاہئے؛ کیوں کہ اس میں لاکرز اور کرنٹ اکاؤنٹ کے حسابات بھی موجود ہوتے ہیں۔

۵۰) ATM مشین لگانے کے لئے کمرہ کرایہ پر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مصارف سود

۵۱) بینک سے ملنے والے سود کو نہ خود استعمال کر سکتے ہیں، نہ اس کو سمندر میں بہا کر آگ میں جلا کر ضائع کر سکتے ہیں، اور نہ اس کو بینک میں چھوڑا جائے؛ بلکہ اس کو نکال کر بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے۔

۵۲) بینک کے سود کو غیر شرعی سرکاری ٹیکس (جس کی منفعت اس کو حاصل نہ ہوتی ہو، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ) میں لگایا جا سکتا ہے، یہ رائے دار العلوم دیو بند، مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفتی عبد الرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم کی ہے۔

۵۳) بینک کے سود کو رفاہِ عام میں لگایا جا سکتا ہے، کیوں کہ یہ رقم واجب التملیک نہیں ہے؛ بلکہ واجب التصدق ہے، یہ رائے مفتی عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ صاحب، مفتی تقی عثمانی صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اکابر کی ہے۔

۵۴) جو چیز اپنے ذمہ لازم ہے، اس پر سے اپنے ذمہ کو ختم کرنے کے لئے سود کی رقم کو استعمال کرنا درست نہیں ہے، مثلاً مزدوروں، نوکروں کی تنخواہوں میں، گاڑی، گھر، نل، بجلی وغیرہ کے ٹیکس میں، مقدمہ کو فیصل کرانے یا وکیل کی محنتانہ وغیرہ میں یہ رقم استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

۵۵) مال کے اندر عینیت ہوتی ہے؛ لہٰذا بینک میں حاصل شدہ سودی رقم جو کھاتے میں موجود ہے، اس کو باقی رکھنے دیا جائے اور اس کی جگہ دوسرے روپئے اپنے

پاس سے خرچ کر دینا اور یہ نیت کرنا کہ میرے حساب میں سود کے نام سے جو رقم شامل ہے وہ دے رہا ہوں، تو اس نیت کے ساتھ فقط اتنا عمل کافی نہ ہوگا؛ بلکہ وہی مال بینک سے نکال کر صدقہ کرنا لازم ہوگا، یہ قول مفتی نظام الدین صاحب اعظمی علیہ الرحمۃ کا ہے، لیکن اکثر علماء کے نزدیک عین مالِ حرام صدقہ کرنا واجب نہیں ملکیت سے اتنا مال صدقہ کرنا کافی ہے۔

۵۶) بینک کے سود کو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کرنا چاہئے، اگر ثواب کی نیت کرے گا تو (چوں کہ وہ رقم اصلاً اس کی نہیں ہے) خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے خادع گنہگار بلکہ حرام چیز سے ثواب کی نیت کرنے سے کفر کے قریب ہو جائے گا۔

۵۷) بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کا چوں کہ وہ مالک نہیں ہوتا؛ بلکہ اصل مالک کی طرف سے نائب یا وکیل ہوتا ہے؛ لہٰذا اصلاً اپنے اصول وفروع اور عزیز واقارب کو دینا جائز تو ہوگا؛ مگر احتیاط اسی میں ہے کہ اپنے اصول وفروع کو نہ دیں ورنہ سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

۵۸) سودی رقم غیر مسلم فقراء، یتیم، بیمار یا غریب طالب علم کو دینا جائز ہے۔

۵۹) سادات کو سودی رقم دینا مناسب اور بہتر تو نہ ہوگا؛ البتہ مجبوری کی صورت میں زکوٰۃ کی طرح یہ سودی رقم بھی دینا جائز ہوگا۔

۶۰) شادی کے تحفہ میں یا مطلق ہدیہ میں سودی رقم دینا جائز نہ ہوگا۔

۶۱) سودی قرض بدرجۂ مجبوری سرکاری بینک سے لے لیا ہو اور دوسرے اکاؤنٹ میں سرکاری بینک سے حاصل شدہ سود موجود ہو تو اس طرح تصفیہ کر سکتے ہیں کہ ایک اکاؤنٹ سے لے کر دوسرے میں دے دیں، بشرطیکہ لیا ہوا سود دیئے ہوئے سود سے زائد نہ ہو برابر ہو جائے، جمہور کی یہی رائے ہے؛ البتہ مفتی حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی دامت برکاتہم اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

۶۲) سودی رقم پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی پیشگی نیت سے اس کو صدقہ کر دیا جائے تو کافی

نہ ہوگا، قبضہ میں آنے کے بعد صدقہ واجب ہوتا ہے؛ لہٰذا دوبارہ صدقہ کرنا ہوگا۔

۶۳) رشوت میں سودی رقم دینا جائز نہیں ہوگا۔

۶۴) بینک کی طرف سے عائد ہونے والے ظالمانہ اور جبراً جرمانے کی ادائیگی میں سودی رقم دینا جائز ہوگا۔

مال حرام کی پاکی کے طریقے

۶۵) اگر مال حرام کا مالک معلوم ہو اور اس تک یا اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثین تک وہ مال لوٹانا ممکن ہو تو لوٹانا واجب ہوگا، (یہ اس وقت ہے جب کہ مالک سے جبراً رضامندی کے بغیر لیا گیا ہو جیسے چوری غصب وغیرہ)

۶۶) اگر مالِ حرام کا مالک متعین نہ ہو یا اس مال حرام کو ایک بڑی جماعت سے لیا گیا ہو، اور ان تک وہ مال پہنچانا ممکن نہ ہو تو وہ مال بیت المال میں رکھا دیا جائے، اگر بیت المال نہ ہو (جیسے ملک ہندوستان میں) تو مسلمانوں کے مصالح پر صرف کیے جائیں گے۔

۶۷) اگر مال حرام بطور اجرت یا حرام کمائی سے حاصل ہوا ہو مثلاً زنا، نوحہ، کہانت، جوے بازی وغیرہ سے حاصل ہو تو وہ رقم مالک کو واپس نہ کیا جائے؛ بلکہ بیت المال میں جمع کر دیا جائے یا رفاہ عام میں خرچ کر دیا جائے۔ مال حرام توبہ کے بعد بھی حرام ہی رہتا ہے، جب تک کہ اس کو مالک تک یا فقراء تک نہ پہنچایا جائے۔

۶۸) زکوۃ حلال مال کی نکالی جاتی ہے، اور حرام مال سارا کا سارا واجب التصدق ہوتا ہے؛ لہٰذا مال حرام میں زکوۃ نہیں۔

۶۹) مال مخلوط بالحرام میں جتنا حلال ہے، اس پر زکوۃ ہے اور جتنا حرام ہے وہ مکمل واجب التصدق ہے، لیکن اگر دونوں مالوں میں امتیاز باقی نہ رہتا ہو کہ کتنا حلال ہے؟ تب ایسی صورت میں اگر حرام مال کے حقدار اس کو بری کر دیں یا اس کے حقدار معلوم نہ ہوں تو زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

منافع سود

۷۰) جو مال مالک کی اجازت کے بغیر لیا گیا ہو اس میں سرمایہ کاری کے ذریعہ سے منافع بھی حاصل ہو چکے ہوں، اب یہ شخص اصل مالک کو وہ مال واپس لوٹانا چاہتا ہے تو اصل مالک کے ساتھ اس کے منافع بھی واپس کرے گا، کیوں کہ منافع اصل کے تابع ہوتے ہیں، یہی جمہور کا مذہب ہے اور یہی احوط ہے؛ البتہ اس میں امام مالک علیہ الرحمہ، شافعی علیہ الرحمہ اور ابو یوسف علیہ الرحمہ کا اختلاف ہے۔

۷۱) اگر مالک معلوم نہ ہوں تو اصل مال کے ساتھ منافع بھی صدقہ کر دیا جائے، الغرض سود کے جو احکام ہیں، وہی سودی منافع کے احکام ہیں۔

۷۲) سود کے پیسوں سے تیار کردہ نل کے پانی کا استعمال کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ جس شئ میں خبث ہو اس کا استعمال حرام ہے نہ کہ اس سے مس کی ہوئی چیز۔

۷۳) کسی عورت کا شوہر زبردستی اس کو گھر کے اخراجات کے لئے سود کی رقم دے جب کہ عورت کا اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہو تو اس کا وبال شوہر کی گردن پر ہوگا؛ البتہ عورت کی ذمہ داری ہے کہ اس رقم سے انکار کر کے خود محنت کر کے حلال رقم سے کھائے۔

۷۴) جس کی آمدنی حرام ہو اس سے اپنا سامان فروخت کرنا جائز ہے، جب تک کہ یہ یقین نہ ہو جائے کہ جو قیمت وہ دے رہا ہے وہ حرام کی ہے۔

۷۵) سود خور کے ورثہ کے لئے سود کا مال حلال نہ ہوگا، مالک معلوم ہو تو معاف کرایا جائے یا واپس کیا جائے، ورنہ صدقہ کر دیا جائے۔

سودی قرض اور احکام

۷۶) اضطراری اور مجبوری کی کیفیت میں حرام چیز حلال ہو جاتی ہے، جب کہ وہ اضطراری کیفیت کسی ماہر عالم دین یا کسی تجربہ کار مفتی کے سامنے رکھی جائے، پھر وہ ماہر مفتی اس کو شرعی، حقیقی عذر مان کر ضرورت کے بقدر اجازت دیں تو

ضرورت کے بقدر سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی ؛ ورنہ بعضے دفعہ بھولا بھالا انسان اپنی خواہشات کو یا رسمی تقریبات وغیرہ کو بھی ضرورت کا نام دے کر سودی قرض لے لیتا ہے یہ شرعاً جائز نہیں ہے۔

۷۷) جس ضرورت اور مجبوری میں پیشاب، شراب پینا اور سور کا گوشت یا پاخانہ کھانا جائز ہوگا اور جتنی مقدار کھانا جائز ہوگا، اتنی ہی مقدار میں سود کا کھانا کھلانا جائز ہوگا۔

۷۸) بدرجۂ مجبوری سودی قرض لے کر بنائی گئی عمارت مکان دوکان حرام نہ ہوں گے، سود دینا حرام ہوگا ؛ لیکن سودی قرض سے بنائی جائیداد حرام نہ ہوگی۔

۷۹) کاروبار میں شرکت کرنے والا ایک شخص اگر سودی رقم کے ذریعہ شرکت کرنا چاہتا ہے تو اس کی اس رقم سے گریز کرنا چاہئے۔

۸۰) جدید تعلیم کی تحصیل فرض کفایہ ہے، اور سود کے لین دین سے بچنا فرض عین ہے ؛ لہٰذا فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ کی اجازت نہ ہوگی، البتہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم تعلیمی قرضوں کی اس وقت اجازت دیتے ہیں، جب کہ (۱) طالب علم نے اس اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنی لیاقت ثابت کر دی ہو (۲) اس کے پاس اموال منقولہ اور اموال غیر منقولہ کی شکل میں اتنا مال نہ ہو (۳) اس کو کسی ادارہ یا فرد سے غیر سودی قرض فراہم نہ ہو پائے، فقہ اکیڈمی انڈیا نے کسی معتبر مفتی کے سامنے اپنے حالات رکھ کر اس سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

۸۱) اگر کوئی شخص ایسا بے گھر ہو کر اسے سر چھپانے کی جگہ بھی میسر نہ ہو اور کوئی ایسا فرد یا جماعت بھی نہ ہو، جو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اسے قرض حسنہ دے، تو اس شخص کے لئے اپنے مکان کی ضرورت یعنی ایسا مکان جو خود انسان اور اس کی بیوی بچوں کو موسمی تکلیفوں سے بچا سکے، بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہوگی ورنہ نہیں۔

۸۲) ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں، جن پر سرکار کی طرف سے چھوٹ Subsidy دی جاتی ہے، اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی اضافی رقم چھوٹ Subsidy کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو تو یہ اضافہ رقم شرعاً سود نہیں۔

۸۳) ادھار پر بیچنے کی وجہ سے کوئی چیز مثلاً گاڑی کی اصل قیمت میں زیادتی کرنا بھی جائز ہے، یہ سود کے حکم میں نہیں ہوگی، لیکن اس میں یہ ضروری ہے کہ ایک ہی مجلس میں یہ فیصلہ کرلیں کہ خریدار نقد لے گا یا ادھار قسطوں پر؛ تاکہ اسی حساب سے قیمت مقرر کی جائے۔

اور اگر یہ شرط لگائی جائے کہ وقت متعین پر قسط نہ ادا کرنے کی صورت میں مزید اضافہ کیا جائے گا یا وصول کردہ رقم سوخت ہو جائے گی، یا خریدی ہوئی چیز بھی ضبط کرلی جائے گی تو اب یہ معاملہ سود اور جوے کا ہو جائے گا۔

ملازمت کے احکام

۸۴) بینک کی صورت حال یہ ہے کہ اس کا مجموعی مال کئی چیزوں سے مرکب ہوتا ہے (۱) اصل سرمایہ (۲) ڈپازیٹرز کے پیسے (۳) سود اور حرام کاموں کی آمدنی (۴) جائز خدمات کی آمدنی اس سارے مجموعے میں صرف نمبر ۳؍ حرام ہے، باقی کو حرام نہیں کہا جاسکتا اور چوں کہ ہر بینک میں نمبر: ۱؍ اور نمبر: ۲؍ کی اکثریت ہوتی ہے، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ حرام غالب ہے؛ لہٰذا بینک میں ایسے کام کی ملازمت کرنا جو جائز ہو جائز ہے، اس کی ہر ملازمت ناجائز نہیں ہے۔

۸۵) بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ، لاکرز اور کلرک وغیرہ کی ملازمت جائز ہے۔

۸۶) سیونگ، فکسڈ ڈپازٹ، انشورنس وغیرہ کی ملازمت ناجائز ہے۔

۸۷) عرب ممالک میں بھی اگر سودی حساب کتاب ہو تو اس کی ملازمت بھی ناجائز ہے۔

۸۸) بینک کے اسلامی کاؤنٹر میں ملازمت کرنا جائز ہے۔

۸۹) مسلم فنڈ کی ملازمت جائز ہے، جب کہ اس میں سودی حساب وکتاب نہ ہوتے ہوں۔

۹۰) ناجائز ملازمت کی تنخواہ بھی ناجائز ہی ہوتی ہے، یہی جمہور کا مذہب ہے؛ البتہ مفتی شبیر صاحب مرادآبادی، مفتی سلمان صاحب مرادآبادی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ فعل ناجائز ہے؛ لیکن تنخواہ تو محنت اور عمل کی ہے؛ لہٰذا اس کی تنخواہ جائز اور حلال ہوگی۔

۹۱) بینک کے زیور پر رکھنے کی اجرت بقول حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی ناجائز ہے۔

انشورنس اور اس کے متعلقات

۹۲) انشورنس کی ساری قسمیں (سود، اور جوا ہونے کی وجہ سے) حرام ہیں، سوائے گروپ انشورنس اور تعاونی انشورنس کے؛ کیوں کہ اس کے اندر سود اور جوا نہیں ہوتا ہے۔

۹۳) ہندوستان جیسے ممالک میں منصوبہ بند فرقہ پرستوں اور آئے دن فسادات کے وجود میں آتے رہنے کی بنا پر فقہ اکیڈمی انڈیا نے مجبوراً جان ومال کا انشورنس کرانے کی اجازت دی ہے، اسی شرط کے ساتھ جو رقم زائد ملے گی وہ رقم بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردیا جائے۔

۹۴) ہندوستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر ضرورت وحاجت کا درجہ مان کر مجبوراً املاک کے انشورنس کی گنجائش دینے والے مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، مفتی نظام الدین صاحب، مفتی کفایت اللہ صاحب، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء، فقہ اکیڈمی انڈیا، وغیرہ ہیں: البتہ مفتی شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم نے اس قول کی مضبوطی کے ساتھ تردید کرتے ہوئے ایسے ماحول کو ضرورت کا معیار قرار نہ دے کر املاک کے بیمہ کو ناجائز کہا ہے۔

۹۵) میڈیکل انشورنس بھی مختلف قسم کے ناجائز امور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز

ہے؛ البتہ اگر کسی ملک وعلاقہ میں قانونی مجبوری کے تحت میڈیکل انشورنس لازمی ہوتو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن جمع کردہ رقم سے زائد جو علاج میں خرچ ہو صاحب استطاعت کے لئے اس کے بقدر بلانیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

۹۶) محکمہ ڈاک وغیرہ میں جو سندی کاغذات اور رجسٹری رقم وغیرہ کا بیمہ کرایا جاتا ہے، وہ شرعاً جائز اور مباح ہے۔

۹۷) جو شخص انشورنس پالیسی شروع کر چکا ہوتو وہ توبہ اور استغفار کرتے ہوئے باقی قسطیں ادا کریں اور جو زائد رقم حصول ہو اس کو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردے۔

۹۸) گاڑی موٹر وغیرہ کا انشورنس کرانا اگر قانوناً لازم ہو (مثلاً تھرڈ پارٹی انشورنس) تو مجبوراً اس کے کرانے کی گنجائش ہوگی۔

۹۹) سودی زائد رقم نہ لیتے ہوئے بھی انشورنس میں حصہ لینا جائز نہ ہوگا۔

۱۰۰) اگر انشورنس کرانے سے واقعۃً ظالمانہ وجابرانہ ٹیکس سے بچا جا سکتا ہے تو انشورنس کرانا جائز ہوگا، اور زائد رقم کو صدقہ کرنا ہوگا۔

۱۰۱) انشورنس میں ملنے والی زائد رقم سے ظالمانہ ٹیکس کو ادا کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۲) حادثوں میں ہلاک ہونے والوں کے ورثاء یا اس میں زخم خوردہ لوگوں کو انشورنس کمپنی کی طرف سے جو رقم ملتی ہے، (انشورنس کمپنی کو عاقلہ کا قائم مقام مان کر) اس رقم کے لینے کی شرعاً گنجائش ہوگی۔

۱۰۳) انشورنس کی رقم مالک کی وفات کے بعد وراثت کا درجہ رکھتی ہے، جب کہ اس نے انشورنس کے لئے کسی کو نامزد نہ کیا ہو، اگر کسی شخص کو نامزد کیا ہے تو وصیت کا درجہ رکھتی ہے۔

۱۰۴) انشورنس کمپنی کا ایجنٹ بننا بھی ناجائز ہے۔

۱۰۵) حج کمیٹی جو حجاج کرام کا بیمہ کراتی ہے اگر وہ قانوناً یا جبراً ہے تو اس کی گنجائش ہوگی اور اگر یہ اختیاری ہے تو ناجائز ہوگا۔

۱۰۶) بڑی کمپنیاں اپنے ملازمین کا خود سے انشورنس کرادیتی ہے اور کچھ رقم کاٹ کر ایک بارگی اس کو واپس کرتی ہے تو اس رقم کا استعمال کرنا جائز ہوگا، اگر یہ اختیاری ہے تو ناجائز ہوگا

رہن کی مروجہ شکلیں

۱۰۷) قرض دے کر رہن میں کوئی چیز لینا جائز ہے، جب کہ اس رہن میں رکھی چیز (گھر، گاڑی، زیور وغیرہ) سے استعمال کر کے فائدہ نہ اٹھایا جائے ورنہ یہ بھی سود ہو جائے گا۔

۱۰۸) قرض دے کر گھر رہن میں لیا جائے پھر اس کا برائے نام کرایہ ادا کیا جائے تو یہ نفع حاصل کرنے کا حیلہ ہے اور یہ ناجائز ہے۔

۱۰۹) مرتہن (قرض دے کر رہن لینے والا شخص) نہ اجازت کے ساتھ (رہن میں رکھی چیز سے) فائدہ اٹھا سکتا ہے اور نہ اجازت کے بغیر۔

۱۱۰) رہن رکھاتے وقت یہ لکھا لیا جائے کہ قت پر قرض کی ادائیگی نہ ہونے پر شئی مرہون کو بیچ کر اپنا قرض وصول کیا جائے گا، پھر وہ وقت پر ادائیگی نہ کرے تب اس کو بیچنے کی گنجائش ہوگی۔

جائز و ناجائز اسکیمیں

۱۱۱) جبری طور پر ملازمین کا جو پراویڈنٹ فنڈ کاٹا جاتا ہے اور ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد ان پر سود کے نام سے جو رقم دی جاتی ہے وہ شرعاً سود نہیں ہے، اس کا لینا جائز ہے؛ البتہ جو رقم پراویڈنٹ فند کی اپنے اختیار سے کاٹی جائے اس پر جو رقم اضافہ کے ساتھ دی جاتی ہے، وہ سود ہے اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

۱۱۲) پراویڈنٹ فنڈ جب تک اس پر قبضہ نہ ہو جائے اس کی زکوۃ واجب نہ ہوگی، جب یہ رقم حاصل ہو جائے اور بقدر نصاب ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کی زکوۃ ادا کرنا ہوگا۔

۱۱۳) پنشن کی رقم معاوضہ کا ایک حصہ ہے اور ایک لحاظ سے عطیہ تبرع اور احسان ہے جوا اور قمار نہیں ہے؛ لہٰذا اس کو لینا اور اس کو فروخت کرنا سب جائز ہے۔

۱۱۴) جی پی فنڈ جو گورنمنٹ ریٹائرڈ ہونے والے ملازمین کو دیتی ہے، یہ تنخواہ کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس کا لینا جائز ہے، البتہ اگر یہ رقم اپنی چاہت سے کسی سودی یا انشورنس کمپنی کے حوالہ کردی جائے پھر اضافی رقم کے ساتھ واپس آئے تو اضافی رقم کا استعمال جائز نہ ہوگا، واجب التصدق ہوگا۔

۱۱۵) شیئر کمپنی میں بے شمار خطرات ہونے کے باعث علماء نے چند شرائط کے ساتھ اس کی گنجائش دی ہے: (۱) کمپنی کسی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو (۲) کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک نقد رقم کی شکل میں نہ ہوں؛ بلکہ اس کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے بھی ہوں (۳) حرام کاروبار کرنے والی کمپنیوں یا سودی بینکوں کے شیئرز کی خریداری سے اس کا تعلق نہ ہو (۴) نفع کا جتنا حصہ سودی کاروبار سے حاصل ہو اس کو بلا نیت ثواب فقراء پر صرف کردیا جائے (۵) شیئرز کی خرید و فروخت سے مقصود حصہ داری حاصل کرنا ہو نفع نقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود نہ ہو۔

۱۱۶) جتنا شیئرز ہوگا اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔

۱۱۷) میچول فند کا اپنا ذاتی سرمایہ کاری کا طریقہ اسلام کے طریقۂ تجارت سے مغائر نہ ہو تو اس میں بھی حصہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، (کسی ماہر عالم دین یا تجربہ کار مفتی سے پوچھ کر قدم اٹھائے)

۱۱۸) ڈرابینک (Drawbank) یہ حکومت کی طرف سے ایک انعام ہے، اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

۱۱۹) کمیشن اور ہراج کی چِٹھی حرام ہے، جس میں کسی مجبور کی مجبوری، کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی کچھ رقم کو آپس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے، یہ صریح سود اور ناجائز ہے، ہاں اگر یہ فاسد نیتیں اور شرطیں نہ ہوں محض پس اندوزی کی نیت

سے ماہانہ کچھ رقم چند افراد مل کر جمع کریں پھر قرعہ اندازی سے وہ مکمل رقم ایک شخص لے لے، تو یہ صورت جائز ہوگی۔

۱۲۰) حکومت نے لڑکی کی پیدائش کے متعلق ایک اسکیم بنائی ہے، جس کے تحت بچی کی پیدائش پر متعلقہ محکمہ سے فارم کی خانہ پری کے بعد حکومت خود اس لڑکی کے نام پر بینک میں دس ہزار روپئے جمع کرتی ہے، اور پندرہ سال پورے ہونے پر لڑکی کے کھاتے میں حکومت کی طرف سے ایک لاکھ روپئے جمع کر دیئے جاتے ہیں، درمیان میں لڑکی یا اس کے والدین کی طرف سے کچھ جمع کرنا نہیں پڑتا، تو اس طرح کے اسکیم میں سود کا کوئی شائبہ نہیں ہے، یہ محض ایک انعام ہے جو حکومت کی طرف سے ہے، لہٰذا یہ جائز ہے۔

۱۲۱) چینل مارکیٹنگ غرر، بیع مع الشرط بعض مرتبہ سود کے علاوہ بھی بے شمار خرابیاں ہونے کے باعث ناجائز اور حرام ہے۔

۱۲۲) جیونا کمپنی والی اسکیم بھی جوا اور سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔

۱۲۳) ایزی پیسہ ایپ کے اندر شرطِ فاسد کے ساتھ نفع اٹھانے کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں، یہ بھی شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

۱۲۴) زیسٹ منی کے ذریعہ سے قسطوں پر ادائیگی والی بیع بھی ناجائز ہے؛ کیوں کہ بغیر سود کے قسطوں میں ادائیگی کی رخصت محدود مدت (۳/۶/۱۲ رمہینے) کے لئے ہے، اس سے بڑھ جانے پر سود کا اضافہ شروع ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے یہ بھی صلب عقد کے اندر ہی شرط فاسد اور سود کی ادائیگی پر رضامندی ہونے کی بنا پر ناجائز ہوگا۔

۱۲۵) ورچول کرنسی اور بٹ کوئین سے متعلق علماء کی مختلف آراء ہیں، پاکستان کے حضرت مولانا محمد احمد افغان صاحب مفتی ارشاد صاحب مفتی محمد حسین صاحب کی رائے جواز کی ہے؛ البتہ مفتی محمود اشرف صاحب نے بٹ کوئین پر مال کی

تعریف صادق آنے سے انکار کر دیا، حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے جواب دینے سے توقف کیا ہے؛ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے احتیاط برتا جائے۔

۱۲۶) بانڈ وڈبینچر بھی ناجائز ہے۔

۱۲۷) فارن ایکسچینج یہ سرٹیفکٹ حکومت کے ذمہ دین کا وثیقہ ہے، اب خود حکومت مدت مخصوصہ کے بعد اس ۱۰۰؍روپئے کے وثیقہ کو ۱۱۰؍روپیہ میں خرید لیا ہے تو گویا وہ دین پر دس فیصد زیادتی ادا کر رہی ہے جو شرعاً سود ہے ناجائز اور حرام ہے۔

۱۲۸) انعامی بانڈ خریدنا ناجائز ہے، سود اور جوا کا مجموعہ ہے حرام در حرام ہے، یہی مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ، مولانا یوسف صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ دارالعلوم کراچی وغیرہ کا فتویٰ ہے۔

۱۲۹) ریٹائیرمنٹ پالیسی بھی سودی معاملہ ہے، اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

۱۳۰) نیشنل بینک سیونگ بھی سودی معاملہ ہے، اس سے بھی اجتناب لازم ہے۔

۱۳۱) لڑکیوں کی پیدائش پر ایکسس بینک کی طرف سے جاری کردہ اسکیم بھی سود پر مشتمل ہونے کی بناء پر حرام ہے۔

۱۳۲) بینکنگ کریڈٹ بھی کریڈٹ کارڈ کی طرح پیشگی سودی معاملہ ہے، ناجائز حرام ہے۔

۱۳۳) مکان دوکان یا کسی چیز پر بیعانہ (Advanced) لے کر اس کو ضبط کر لینا، واپس نہ کرنا بھی حرام اور ناجائز ہے۔

❁❁❁❁❁❁

فہرست مراجع

قرآن وتفسیر قرآن

١ القرآن الكريم
٢ أحكام القرآن:أبو بكر جصاص،شيخ الهند بک ڈپو/ دار الكتب العلميه
٣ الجامع لأحكام القرآن = تفسير القرطبي:أبو عبد الله محمد بن أحمد بن أبي بكر بن فرح الأنصاري الخزرجي شمس الدين القرطبي، دار الكتب العلميه-بيروت
۴ تفسير القرآن العظيم (المعروف بتفسير ابن كثير): أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي؛ دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة: الثانية، ۱۴۲۰ھ-۱۹۹۹م
۵ جامع البيان في تأويل القرآن: محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي، أبو جعفر الطبري؛ مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ۱۴۲۰ھ-۲۰۰۰م
٦ مفاتيح الغيب = التفسير الكبير:أبو عبد الله محمد بن عمر بن الحسن بن الحسين التيمي الرازي الملقب بفخر الدين الرازي خطيب الري؛ دار إحياء التراث العربي-بيروت

۷ روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني: شهاب الدين محمود بن عبدالله الحسيني الألوسي، زكريا بكڈپو

۸ مکمل بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانوی؛مکتبۃ الحق ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئی

۹ معارف القرآن: مفتی محمد شفیع، اشرفی بکڈپو

۱۰ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی سے متعلق کچھ اہم مباحث: مولانا برہان الدین سنبھلی، ایفا پبلی کشنز، نئی دہلی

۱۱ لغات القآن: مولانا عبدالرشید نعمانی،

کتب حدیث اور شروحات حدیث

۱۲ صحيح البخاري: محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخاري الجعفي؛ دار ابن كثير-بيروت

۱۳ صحيح مسلم: مسلم بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري؛ دار ابن كثير، بيروت

۱۴ سنن أبي داود: أبو داود سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي السِّجِسْتاني؛ دار الفكر بيروت

۱۵ سنن الترمذي: محمد بن عيسى بن سَوْرة بن موسى بن الضحاك، الترمذي، أبو عيسى؛ دار احياء التراث العربى

۱۶ السنن النسائي: أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني، النسائي؛ مكتبه المطبوعات الإسلامية

۱۷ سنن ابن ماجه: ابن ماجة أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، وماجة اسم أبيه يزيد؛ دار الفكر بيروت

۱۸ مسند الإمام أحمد بن حنبل: أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن

هلال بن أسد الشيباني؛ مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، ۱۴۲۱ھ -۲۰۰۱م

۱۹ سنن الدار قطنى: أبو الحسن علي بن عمر بن أحمد بن مهدي بن مسعود بن النعمان بن دينار البغدادي الدار قطني؛ دار المعرفة بيروت

۲۰ المستدرك على الصحيحين: أبو عبد الله الحاكم محمد بن عبد الله بن محمد بن حمدويه بن نُعيم بن الحكم الضبي الطهماني النيسابوري المعروف بابن البيع، دار الكتب العلمية - بيروت، الطبعة الأولى، ۱۴۱۱ھ-۱۹۹۰م

۲۱ المعجم الكبير: سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني؛ مكتبة ابن تيمية - القاهرة

۲۲ إعلاء السنن: علامه ظفر احمد عثمانی تهانوی؛ المكتبة الأشرفي - ديوبند

۲۳ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: أبو الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان الهيثمي؛ مكتبة القدسي، القاهرة، ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۴م

۲۴ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال: علاء الدين علي بن حسام الدين ابن قاضي خان القادري الشاذلي الهندي البرهانفوري ثم المدني فالمكي الشهير بالمتقي الهندي، مؤسسة الرسالة، الطبعة: الطبعة الخامسة، ۱۴۰۲ھ-۱۹۸۱م

۲۵ مشكاة المصابيح: محمد بن عبد الله الخطيب العمري، أبو عبد الله، ولي الدين، التبريزي؛ المكتب الإسلامي - بيروت، الطبعة: الثالثة، ۱۹۸۵م

۲٦ عمدة القاري شرح صحيح البخاري: أبو محمد محمود بن أحمد

بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى بدر الدين العينى؛ دار الحديث القاهرة

۲۷ فيض الباري:؛دار الكتب العلمية،بيروت

۲۸ شرح النووي على مسلم:أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي

۲۹ تكملة فتح الملهم شرح صحيح مسلم:مفتى محمد تقى عثمانى؛ مكتبه اشرفيه، ديوبند-الهند

۳۰ عون المعبود شرح سنن أبي داود: محمد أشرف بن أمير بن علي بن حيدر، أبو عبد الرحمن، شرف الحق، الصديقي، العظيم آبادي؛ دار الكتب العلمية-بيروت، الطبعة: الثانية، 1415هـ

۳۱ بذل المجهود:

۳۲ العرف الشذي:

۳۳ مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح:علي بن (سلطان) محمد، أبو الحسن نور الدين الملا الهروي القاري، اشرفيه بكڈپو

۳۴ سبل السلام: محمد بن إسماعيل بن صلاح بن محمد الحسني، الكحلاني ثم الصنعاني، أبو إبراهيم، عز الدين، المعروف كأسلافه بالأمير؛ دار الحديث

۳۵ معارف الحديث:دار الاشاعت كراچى

۳۶ انعام البارى:مفتى تقى عثمانى،(دروسِ بخارى شريف)مكتبه الحراء كراچى پاكستان

۳۷ تحفة الالمعى:مفتى سعيد احمد صاحب پالنپورى،مكتبه حجاز ديوبند

۳۸ مظاہر حق جدید:؛ دارالاشاعت اردو بازار، کراچی پاکستان

کتب فقہ، اصول فقہ اور فتاوی

۳۹ صحیح وضعیف الجامع الصغیر وزیادته: عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين السيوطي؛

۴۰ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع: علاء الدين، أبو بكر بن مسعود بن أحمد الكاساني الحنفي؛ زکریا بک ڈپو/دار الکتب العلميه -بیروت

۴۱ الجوهرة النيرة: أبو بكر بن علي بن محمد الحدادي العبادي الزَّبِيدِيّ اليمني الحنفين، المطبعة الخيرية، الطبعة: الأولى، ۱۳۲۲ھ

۴۲ الهداية في شرح بداية المبتدي: علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين؛ اشرفی بک ڈپو

۴۳ العناية شرح الهداية: محمد بن محمد بن محمود، أكمل الدين أبو عبد الله ابن الشيخ شمس الدين ابن الشيخ جمال الدين الرومي البابرتي؛ دار الفكر

۴۴ البناية شرح الهداية: أبو محمد محمود بن أحمد بن موسى بن أحمد بن حسين الغيتابى الحنفى بدر الدين العينى؛ دار الكتب العلمية -بيروت، لبنان، الطبعة: الأولى، ۱۴۲۰ھ-۲۰۰۰ء

۴۵ البحر الرائق شرح كنز الدقائق: زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري؛ دار الكتاب الإسلامي،

۴۶ رد المحتار على الدر المختار: ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي ؛ دار الفكر-بيروت؛ االطبعة: الثانية، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲م

۴۷ الدر المختار شرح تنوير الأبصار للتمرتاشي: علاء الدين الحصفكي؛ دار الفكر-بيروت؛ الطبعة: الثانية، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲م

۴۸ حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح شرح نور الإيضاح: أحمد بن محمد بن إسماعيل الطحطاوي الحنفي؛ دار الكتب العلمية بيروت-لبنان، الطبعة: الطبعة الأولى ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷م

۴۹ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر: عبد الرحمن بن محمد بن سليمان المدعو بشيخي زاده, يعرف بداماد أفندي؛ دار إحياء التراث العربي

۵۰ المجموع شرح المهذب : أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف النووي، دار الفكر

۵۱ كتاب الأموال:أبو القاسم بن سلام؛،دار الكتاب العلميه بيروت

۵۲ الفتاوى الهندية: لجنة علماء برئاسة نظام الدين البلخي؛ اتحاد بک ڈپو، دیوبند-الهند

۵۳ الفتاوى الخانية (قاضی خان) :؛على هامش الفتاوى الهندية

۵۴ الفتاوى التاتار خانية: شيخ فريد الدين المعروف بابن ملقن؛ زكريا بک ڈپو، ديوبند-الهند

۵۵ الذخيرة:أبو العباس شهاب الدين أحمد بن إدريس بن عبد الرحمن المالكي الشهير بالقرافي؛ دار الغرب الإسلامي- بيروت، الطبعة: الأولى، ۱۹۹۴م

۵۶ فتاوى معاصرة: يوسف القرضاوي،

۵۷ مجموعة فتاوى ابن تيمية:

۵۸ فتاوی بینات:
۵۹ الترغيب والترهيب:إسماعيل بن محمد بن الفضل بن علي القرشي الطليحي التيمي الأصبهاني، أبو القاسم، الملقب بقوام السنة؛دار الحديث القاهرة
۶۰ الأشباه و النظائر :زين الدين بن إبراهيم بن محمد، المعروف بابن نجيم المصري؛مكتبه فقيه الامت
۶۱ حاشية الحموي على الأشباه:الحموي
۶۲ رسم المفتى:ابن عابدين، محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقي الحنفي؛
۶۳ الفقه الإسلامي وأدلته:
۶۴ آپ کے مسائل اوران کا حل : مولانا یوسف صاحب لدھیانوی ؛نعیمیہ بکڈ پو، دیو بند
۶۵ احسن الفتاوی: مفتی رشید احمد صاحب؛ ایچ ایم سعید کمپنی
۶۶ احکام مالِ حرام: مفتی ابوبکر جابری قاسمی، مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی صاحبان زیر تصنیف غیر مطبوعہ
۶۷ احکام المال: محمد زید مظاہر ندوی، ادارہ افادات اشرفیہ باندہ یوپی
۶۸ اسلام اور جدید معاشی مسائل : مفتی تقی عثمانی صاحب
۶۹ اسلام اور جدید اقتصادی مسائل: شعبۂ نشر و اشاعت دار العلوم حیدر آباد ۲۰۰۹
۷۰ اسلامی قانونِ خرید وفروخت: مفتی فرید احمد بن رشید کاوی، جامعہ علوم القرآن جمبوسر
۷۱ اسلامی نظام اقتصادیات ومالیات : سید الیاس پاشاہ صاحب
۷۲ امداد المفتیین مکمل: مفتی شفیع صاحب زکریا بکڈ پو دیوبند

۷۳ امداد الاحکام:

۷۴ امداد الفتاوی: مولانا اشرف علی تھانویؒ،

۷۵ انشورنس پالیسی اور اسلام: مفتی شعیب اللہ خان صاحب

۷۶ اہم مسائل جن میں ابتلاء عام ہے: مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا

۷۷ ایضاح النوادر: مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی، فرید بکڈ پونئی دہلی اپریل ۲۰۰۴ء

۷۸ سود پر تاریخی فیصلہ: مفتی تقی عثمانی صاحب

۷۹ بینک کا سود حلال ہے: الہلال ایجوکیشنل؛

۸۰ بینک انشورنس اور سرکاری تقاضے مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی

۸۱ تکافل کی شرعی حیثیت: ڈاکٹر مولانا عصمت اللہ صاحب، ادارۃ المعارف کراچی پاکستان

۸۲ جدید فقہی مسائل: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، کتب خانہ نعیمیہ

۸۳ جدید مالیاتی ادارے فقہ اسلامی کی روشنی میں: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۸۴ جدید معاشی نظام میں اسلامی قانونِ اجارہ: ڈاکٹر مولانا محمد زبیر اشرف عثمانی صاحب

۸۵ جواہر الفقہ: مفتی محمد شفیع صاحب، مکتبہ دار العلوم کراچی طبع جدید ۲۰۱۰ء

۸۶ چند اہم عصری مسائل: مکتبہ دار العلوم دیوبند

۸۷ حرام کاروبار کے لیے املاک کا اجارہ: مفتی شعیب اللہ خان صاحب

۸۸ حرمتِ ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام: ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب

۸۹ حسن العزیز:

۹۰ سود: سید ابوالاعلیٰ مودودی؛

۹۱ سود، رشوت، جوا قرض کے شرعی احکام: مکتبہ زکریا کراچی بنوری ٹاؤن

۹۲ الربا (سود): مفتی عبید اللہ اسعدی صاحب

۹۳ رسالہ بیمۂ زندگی:

۹۴ شریعت کے دائرے میں انشورنس کی صورت: ایفا پبلیکشنز نئی دہلی ۲۰۱۳

۹۵ صفائی معاملات:

۹۶ عزیز الفتاوی:

۹۷ فتاویٰ بینات: مکتبہ بینات

۹۸ فتاویٰ حقانیہ: جامعہ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۹۹ فتاویٰ رحیمیہ: مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری، مکتبۃ الاحسان دیوبند

۱۰۰ فتاویٰ رشیدیہ: مولانا رشید احمد سہارنپوری،

۱۰۱ فتاویٰ عثمانی: زکریا بکڈپو

۱۰۲ فتاویٰ قاسمیہ: مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی؛ زکریا بک ڈپو

۱۰۳ فتاویٰ قاضی: قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، ایفا پبلیکشنز نئی دہلی

۱۰۴ فتاویٰ محمودیہ: مولانا محمود حسن، اشرفی بکڈپو

۱۰۵ فتاویٰ دار العلوم: مفتی عزیز الرحمن صاحب؛ مکتبہ دار العلوم

۱۰۶ فتاویٰ دار العلوم زکریا: دار الافتاء دار العلوم زکریا، زمزم پبلیشرز، کراچی، پاکستان

۱۰۷ فقہی مقالات: مفتی تقی عثمانی صاحب، زمزم بکڈپو دیوبند

۱۰۸ فقہی، فکری واصلاحی مقالات ومضامین: مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، اشاعت العلوم اکل کوا

۱۰۹ کتاب الفتاویٰ: مولانا خالد سیف الہ رحمانی، مرتب: مفتی محمد عبد اللہ سلیمان مظاہری۔ مکتبہ نعیمیہ، دیوبند

۱۱۰ کتاب النوازل: مفتی سلمان منصور پوری صاحب؛ فرید بکڈپو

۱۱۱ کریڈٹ کارڈ کا تعارف اور فقہی جائزہ: مفتی ابوالخیر عارف محمود صاحب، جامعیہ فاروقیہ
۱۱۲ کفایت المفتی: مفتی کفایت اللہ دہلوی؛
۱۱۳ محاضرات معیشت وتجارت: ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب
۱۱۴ محقق ومدلل جدید مسائل: مفتی محمد جعفر صاحب ملی رحمانی، جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا
۱۱۵ محمود الفتاویٰ: مفتی احمد خانپوری صاحب
۱۱۶ منتخب نظام الفتاویٰ: مفتی نظام الدین اعظمیؒ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا
۱۱۷ نظام الفتاوی: مفتی نظام الدین اعظمیؒ،
۱۱۸ نفائس الفقہ: کتب خانہ فیصل
۱۱۹ نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ۲۰۱۴ء

متفرق کتب

۱۲۰ زاد المعاد في هدي خير العباد: محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية؛ مؤسسة الرسالة، بيروت - مكتبة المنار الإسلامية، الكويت، الطبعة: السابعة والعشرون، ۱۴۱۵ھ - ۱۹۹۴م
۱۲۱ إحياء علوم الدين: أبو حامد محمد بن محمد الغزالي الطوسي؛ دار المعرفة - بيروت
۱۲۲ موقف الشريعة من المصلف المعاصرة
۱۲۳ التمهيد: ابن عبد البر،
۱۲۴ مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين: محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين ابن قيم الجوزية، دار

الکتاب العربي - بیروت، الطبعة: الثالثة، ۱۴۱۶ھ - ۱۹۹۶م
۱۲۵ فتوح مصر والمغرب: ابن عبدالرحمن عبدالله،
۱۲۶ البداية والنهاية: أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي؛ دار إحياء التراث العربي، الطبعة الأولى ۱۴۰۸ھ- ۱۹۸۸م
۱۲۷ المعيار المعرب: بيروت
۱۲۸ شرح المجلة: سليم رستم باز
۱۲۹ شرح المجلة: خالد الأتاسي
۱۳۰ مجلہ فقہ اسلامی، سیمینار نمبر: ۳
۱۳۱ مروجہ سودی معاملات نقل وعقل کی روشنی میں: مفتی جنید احمد قاسمی، ادارہ علم وحکمت- بہار
۱۳۲ سہ ماہی مجلہ بحث ونظر حیدرآباد، شمارہ نمبر: ۱۱۵- ۱۱۴ (۱۵- ۱۴) جنوری- جون ۲۰۱۹ء
۱۳۳ پرائز بانڈ کی شرعی حیثیت: مفتی سمیع اللہ کراچی، مکتبہ عمر فاروق کراچی
۱۳۴ مسلمان کناڈا کے بعض مسائل- شریعت اسلامی کی روشنی میں: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۱۳۵ شیئر بازار تعارف اور مواقع: عرفان شاہد، مرکزی اسلامی پبلیشرز دہلی
۱۳۶ ورجوئل کرنسیوں کی شرعی حیثیت: محمد اویس پراچہ، رفیق دارالافتاء، جامعۃ الرشید کراچی
۱۳۷ بٹ کوئن تعارف، آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا

❀❀❀❀❀❀❀